جہدِ مسلسل

علی گڑھ سے علیگڑھ تک

جولائی ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر عابد اللہ الانصاری غازی (علیگ)

جہد مسلسل

علی گڑھ سے علیگڑھ تک

ڈاکٹر عابداللہ غازی

اقرأ انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن۔شکاگو

نام کتاب جہدِ مسلسل (علیگڑھ سے علیگڑھ تک)

مصنف ڈاکٹر عابداللہ غازی

سال اشاعت ۲۰۱۷ء

قیمت Rs.400/-

یہ کتاب یہاں دستیاب ہے:

مکتبہ ملت۔ دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (سہارنپور) یوپی 01336-225268 .

کتبخانہ عبدالسلام قاسمی بھنڈی بازار۔ 9322603836

فردوس کتاب گھر، بھنڈی بازار، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۳ فون 09892184258

ہندوستان پیپر ایمپوریم۔ ۱۲۷ر مچھلی کمان حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲ فون: 09246543507

دکن ٹریڈرس۔ 23-2-378 مغل پورہ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲ فون۔ 09948869464

رائل بک سینٹر۔ چار مینار مسجد اسٹریٹ، نزد چاندنی چوک، شیواجی نگر، بنگلور۔ ۵۶۰۰۵۱ (کرناٹک) فون:
09740195515

قاسمی کتب خانہ، ۶ رلکی پلازہ بیسمنٹ، بارا سندرامن روڈ، تلک نگر، بنگلور، فون: 09880660768

مکتبہ الغزالی، مدینہ چوک، گاؤکدل، سری نگر (جموں وکشمیر)

انگلینڈ میں:

Al-Farooq International Ltd.: 68 Ashfordby
Street,LECESTER-LE5 3QG (UK)Tel:116-2537640

امریکہ میں: Tel: 773.2742665

Iqra Book Center, 2751, W. Devon, Chicago, Illinois-60659

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن، ممبئی۔ فون 022-2440494، 09594466466

طباعت: پرنٹس کنگ، نئی دہلی

فہرست

انتساب

میں ان مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی مقدس یادوں کو اپنے جد امجد

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹویؒ

اول ناظم دینیات :ایم او اے کالج کے نام معنون کرتا ہوں

جن کو کالج میں آ کر شعبہ دینیات قائم کرنے کی دعوت دینے کی وجہ کو سرسیدؒ نے ان الفاظ میں فرمایا:
مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار صاحب کے نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے،
داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے .اوران بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی۔اوران بزرگوں
کی صحبت فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین
اور بہ لحاظ محبت اسلام انجام دیں۔اور اسی خیال سے ان کا مدرسے میں تشریف لانا اور یہاں رہنا
باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں

امتنان وتشکر

علیگڑھ سے علیگڑھ میری علیگڑھ کی سوانح کی تحریک اور تکمیل میں جن دو علیگیرین دوستوں کا
کا نام ہے ان میں ایک میرے ہمعصر مسعود حیدر ہیں اور دوسرے میرے جونیر شہیر خان ہین۔
یہ دونوں خفیہ طور پر علیگرھ المنائی میگزین کے روح رواں ھیں اند گذشتہ دہائی میں میرا ناطقہ نند
کر کے مجھ سے یہ قلا درداشتہ یادداشتیں لکھوالیں اُاب اگر آپ کو تعریف کرنی ہو تو ان کی
استقامت کی داد دیجئے اور تنقید کرنی ہو تو انھیں سے شکوہ کیجئے۔
میں نے اپنی یادوں کے سہارے سے جو کچھ لکھا وہ میری یادیں اور رائیں ہیں۔میں جو کچھ علیگڑھ
اور ہندوستان کے مسلمانوں کی لئے کرنا چاہتا تھا اس کا عشر عشیر بھی نہ کر سکا
اور جو کچھ ہو گیا اس پر تعجب ھے کہ کیسے ہو گیا۔

عابداللہ غازی

(نمونۂ صنعتِ توشیح)

نتیجۂ فکر: ڈاکٹر الیاس نویدؔ گنوری

ع۔ عاقل عمیق عالم علم و عمل عظیم
ا۔ انوار آسمانِ ادب آزر اور امیں
ب۔ بہتر بفضلِ باری بجا بے بہا بساط
د۔ داعی دراز دست دُر دل نشین ِ دیں
ا۔ اردو ادب اپنے انیس انجم اساس
ل۔ لاریب لحن و لہجہ لباس لساں لحین
ل۔ لائق لئیق لعل لیاقت لحاظ لوح
ہ۔ ہادی و ہمزباں ہیں ہمیں ہمسفر ہمیں
غ۔ غواص غرق غور غزل غیرت غناء
ا۔ اصل و اصول اہل اسالیب اور امیں
ز۔ زائر زحاف زریں زمیں زاہد و زماں
ی۔ یاقوت یاوراں یہی یعنی ید یقیں
عابداللہ عابداللہ عابداللہ عابداللہ عابداللہ عابداللہ
غازی غازی غازی غازی غازی غازی

صنعتِ توشیح

اردو شاعری میں دیگر اہم صنعتوں کے ساتھ صنعت توشیح کا بھی اپنا اہم مقام ہے۔اس میں شاعر مصارح کے حروف اولیں یا قوانی کے حروف اولیں کو جوڑ کر کسی لائق احترام نام کو واضح کرتا ہے۔مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اب تک صنعت توشیح کے ذریعہ کسی مختصر نظم میں کسی بھی نام کو تین بار وضع کیا گیا ہے۔ڈاکٹر الیاس نویدؔ گنوری نے پہلی بار اس صنعت کے ذریعہ ڈاکٹر عابداللہ غازی کا نام چھ بار نکال کر اس صنعت کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ دراصل یہ صنعت توشیح کے نمونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عابداللہ غازی کے کردار کے ان محاسن کی عکاسی بھی کی ہے جو ڈاکٹر الیاس گنوری نے آپ کی شخصیت میں پائیں۔

شعری خراجِ عقیدت
از ڈکٹر معظم علی خان۔علیگڑھ

میرِ سُخن ہیں ماہِ غزل ہیں عابداللہ غازی صاحب

شہرِ ادب کے تاج محل ہیں عابداللہ غازی صاحب

اجلا اجلا چہرہ ان کا حسن پہ جیسے پہرہ ان کا

جھیل میں اک شفّاف کنول ہیں عابداللہ غازی صاحب

مکتب میں اک نثر کی دیوی پلکیں جھپکا کر یوں بولی

میری آنکھوں کا کاجل ہیں عابداللہ غازی صاحب

قوم کی خدمت عادت ان کی غم خواری ہے فطرت ان کی

سرسید کا انمول رتن ہیں عابداللہ غازی صاحب

جاہل کے وہ ہاتھ نہ آئیں، عالم دیکھیں اور للچائیں

علم کا ایسا پختہ پھل ہیں عابداللہ غازی صاحب

جس کے بام و در میں عزت جس کا رنگ و روغن شہرت

ایسا دیدہ زیب محل ہیں عابداللہ غازی صاحب

جگ میں ان کا کام رہے گا، کل بھی ان کا نام رہے گا

آج بھی اپنی جگہ اٹل ہیں عابداللہ غازی صاحب

مجبوراً اس غزل کی کشتی مقطع کے ساحل پر چھوڑی

فکرِ سُخن کے بازوشل ہیں عابداللہ غازی صاحب

بسمہ سبحانہ

پیش لفظ

کوئی سنے نہ سنے انقلاب کی آواز
پکارنے کی حدوں تک تو ہم پکار آئے

(علامہ انور صابریؒ)

میں نے علیگڑھ کی یادداشتیں محترم عظیم الحق جنیدی صاحب کے دولتکدہ کی بیٹھک سے شروع کی ہیں ۔اس بیٹھک میں، میں نے نو اور دس جماعت کے دو سال (1949-51) گزارے جنیدی صاحب کا تعلق پھرایوں کے مولوی خاندان سے تھااور وہ بجنور ہائی اسکول کے پرنسپل تھے ۔اس دور کے بزرگوں کی ، خاص طور پر جن کا تعلق تعلیم و تعلم سے تھا، یہ عجیب وغریب خصوصیت تھی کہ خاندان کے اور دوستوں کے بچوں کو اپنے گھروں میں بلوغ سے پہلے اور بیٹھکوں میں بلوغ کے بعد تعلیمی مقاصد کے لئے جگہ دے دیتے تھے۔ میری خوش قسمتی میری بے گھری تھی ۔خوبیٔ قسمت سے ہم کو ہائی اسکول پہنچنے تک ایک درجن سے زیادہ گھر ، مدارس اور بزرگوں سے اکتسابِ علم وعمل حاصل کرنے کی سعادت حاصل رہی۔

مقامات کے لحاظ سے میرے تعلیمی اور تربیتی سفر میں، علیگڑھ پہونچنے سے پہلے، انبہٹہ پیرزادگان، گنگوہ شریف، جامعہ ملیہ، تعلیمی مرکز قرول باغ دہلی، کابل، جلال آباد، دارالعلوم دیو بند، خاندان قاسمی و مدنی، دہرہ دون، گڑھی پختہ زیر تربیت مولانا شفیق احمد، فقیر والی (ضلع بہاول نگر) ، جامعہ عباسیہ بہاولپور، اور تربیت کدہ مولانا اسرار احمد و مولانا فاروق احمد صاحب ، مدرسہ علوم شرعیہ پٹیالہ، یتیم خانہ بجنور، مدینہ منزل بجنور اور اس کا آخری پڑاؤ جنیدی صاحب کی بیٹھک تھا۔

تعلیم و تربیت کے تو مراحل علیگڑھ سے پہلے اور اس کے بعد بھی بہت سے تھے لیکن علیگڑھ میرے تعلیمی سفر کا وہ پڑاؤ تھا جس سے میں آج تک فکری، ذہنی اور روحانی طور سے وابستہ

ہوں ۔ یہاں سر سید کی دانشگاہ میں مجھے درحقیقت فکری علمی اورروحانی گھر میسر آیا۔ اساتذہ کی شفقت، دوستوں کی بےلوث رفاقت، رقیبوں کی دلچسپ رقابت، عمل کی سرگرمی، ارادوں کی پختگی، فکر کی صلابت، عزائم کی شجاعت اور عشق کی معصوم جرأت میسر آئی۔ علیگڑھ کے تجربوں اور بعد میں اس کی یادوں نے مجھ دورِ خزاں کے پروردہ کو سدابہار بنادیا۔

یہاں میں نے یونین کے اسٹیج پر سیکنڈ ائر میں (1952-53) قدم رکھا اور تھرڈ ایر (۱۹۵۴) میں کم وبیش ہر اردو ڈبیٹ کے فرسٹ پرائزوں پر قابض ہوکر سیفی برہان الدین گولڈ میڈل کا مستحق بنا اور سیکریٹری منتخب ہوا (1954-55)، صدارت کا الیکشن 1955 میں مبشر محمد خان سے لڑا اور ناکام رہا۔ پھر (1959) میں بلا مقابلہ صدر منتخب ہوا اور پورے ہندوستان کی یونیورسیٹیوں کی تنظیم کونسل آف یونیورسیٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا کا بانی اور پہلا صدر بمنتخب ہوا (1959) اور آزاد ہندوستان کی عظیم قیادت پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، راجندر پرشاد جی، سی ڈی دیشمکھ، ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی توجہ اور شفقتوں کا مرکز بن گیا۔ ذاکر صاحب اور پنڈت نہرو کی نوازش سے ہندوستان کا نوجوان سفیر بن کر نئے سرخ چین جاکر سرسبز ہندوستان کے نوجوانوں کی نمائندگی (۱۹۵۵) کی۔ سیاست کے سارے دروازے مجھ پر وا تھے لیکن میں نے اپنے بزرگ مولانا مملوک علی، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا عبداللہ انصاری، سرسید احمد خان اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی راستے کو اپنایا۔ دنیا بہت سے روپ بدل بدل کر مجھے بہکانے اور پھسلانے آئی لیکن میں نے اسے مقاصد کی راہ میں دخل اندازی کی اجازت نہ دی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کام میں، عالمی طور پر درجنوں اسلامی تعلیمی اداروں کے قیام کرنے میں ہم دونوں یعنی ڈاکٹر تسنیمہ غازی اور میں آج تک اسی طرح مشغول ہیں جیسے آغاز کار میں تھے۔ اسلامی تعلیم کو جدید اسلوب پر پیش کرنے کا کام اس قدر وسیع نکلا کہ:

عمرم تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

علیگڑھ کے رنگ کی ترنگ نے ہمیں اس جرأت سے نوازا کہ ہر محفل میں اس کا رنگ ہم نے بکھیر دیا۔ جامعہ ملیہ اور دلی کالج کی خدمت میسر آئی۔ اسٹینفورڈ یونیورسٹی، پرنسٹن یونیورسیٹی اور میک گل یونیورسٹی کنیڈا سے خود دعوتیں ملنے لگیں۔ لیکن ہمارا قرعہ لندن اسکول آف اکنامکس کے نام نکلا (1963)۔ وہاں سے ہمیں ہارڈورڈ نے (1967) نے اپنی تعلیمی گرفت میں لے لیا۔ لندن، امریکہ، مشرق وسطی کے عظیم تعلیمی اداروں سے وابستگی رہی ہے۔ میں نے خود ڈاکٹر عبدلوحید فخری تسنیمہ غازی اور احباب کی اعانت سے شکاگو میں اقرأ انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی (1983) شکاگو میں بنیاد ڈالی جو اب ایک عالمی ادارہ بن گیا ہے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمان کی خدمت میرا بچپن سے نصب العین تھا لیکن دو مجبوریوں نے مجھے اس فرض سے جسمانی طور پر محروم کر دیا۔ ہمارے جو بزرگ آئے انھوں نے، خاص طور پر والد صاحب نے، امریکہ کے حالات کے پیش نظر ہمیں ہدایت کی کہ ہم ہارورڈ کے تعلیمی تجربوں کی بنیاد پر کچھ عرصہ یہاں ٹھیر کر کوئی اسلامی تعلیمی پرگرام مرتب کر دیں۔ دوسرے ہماری بیگم کی خواہش تھی کہ وہ اپنے خانداں کو، اس مواقع کی سرزمین میں لاکر بسا دیں۔ یہ دونوں کام بدرجہ اتم ہو گئے لیکن وہ وقت نکل گیا کہ میں خود ہندوستان میں رہ کر کچھ فکری یا عملی مقاصد کیلئے کام کر سکتا۔ اس محرومی کا مجھ کو بہت احساس ہے۔

یوں تو امریکہ میں رہتے ہوے ہندستان کی بہبود کی تنظیموں میں عملی شرکت رہی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کا بھی کچھ حق ادا کرتا رہا لیکن علیگڑھ اور ہندوستان میری فکری محور کے مرکز میں ہمیشہ موجود رہا۔ علیگڑھ میں ۱۹۹۸ء میں اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز اور ادارہ تہذیب جدید کی بنیاد ڈالی، بمبئی میں اقرأ انٹرنیشنل کی برانچ اقرأ ایجوکیشن فاؤنڈیشن ۱۹۹۹ میں قائم کی جو الحمدللہ بہت قابل قدر خدمات عزیزم سلمان غازی اور عظمی ناہید انجام دے رہے ہیں۔ اپنے وطن انبہٹہ پیرزادگان میں ڈاکٹر شاہد صابری کی قیادت میں مدرسہ محمودیہ، ہائی اسکول، انٹر کالج، کالج آف ایجوکیشن قائم کرنے میں معاونت کی اور ابا جان کے نام پر غازی ایجوکیشنل

ٹرسٹ کی بنیاد رکھی ۔ بنگلور کی شہرۂ آفاق ادارہ امپیلسس کے ساتھ اسلامی تعلیم کو ٹکنالوجی کی مدد سے آفاقی بنانے کا پروگرام بنایا اور اقرأ کے مکمل تعلیمی نظام کو انٹرنیٹ کی زینت بنا دیا(دیکھئے eiqra.org:)۔حیدرآباد کے سن سیٹ سٹی میں تعلیمی ٹکنالوجی کے فروغ کے لئے دفتر قائم کیا، جو دیرپا ثابت نہ رہ سکا۔سنگاپور کے مجلس علماء کے مدارس کے لئے انگریزی زبان میں ایک سو اسی کتابوں پر مشتمل معہد مدرسہ کا مکمل پروگرام علماء ہند کی مدد سے مرحوم اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے ذریعہ تصنیف کروایا جو اب سنگاپور میں رائج ہے۔اب بہت سے علیگڑھ کے خواب خیال بن گئے ہیں،کیا کیجئے ؟: اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ہندوستان میں کچھ اہم کام ابھی باقی ہیں اور امید ہے کہ وہ پائدار ثابت ہوں گے اور اسلامی تعلیمی مستقبل کے لئے نشان راہ بنیں گے۔شکوہ غیروں کا نہیں اپنوں کا ہے جو اپنے ذاتی چھوٹے سے چھوٹے مفاد کی خاطر بڑی سے بڑی متاع کو سربازار فروخت کر دیتے ہیں۔دیوبند اور علیگڑھ کے اکابر کے جس ورثہ کو ہم امریکہ میں اور گلوبل ولیج میں بغیر دشواری کے قائم کر سکے اسے علیگڑھ کی علمی فضا نہ راس آسکی۔ ع:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہم نے الحمد للہ ! ددھیالی دیوبند کے علماء کی علمی میراث کو ننھیالی صوفیائے کرام کی روحانی میراث سے اور ان دونوں میراثوں کو سرسید کی جدید فکر سے ہم آہنگ کرانے کی کوشش میں عمر عزیز گزار دی اور جو باقی ہے وہ عالمی طور پر بین المذاہب ہم آہنگی کو پیدا کرنے کی کوشش میں اور اسلام کے پیغام کو دور جدید کے تقاضوں کی روشنی کو سمجھنے اور سمجھانے میں گزر جائیگی۔ علیگڑھ کی افسوسناک ناکامیابیوں کے باوجود جو کچھ ہو سکا اس سے ہندوستان ، پاکستان ، امریکا مشرق وسطی اور عالمی طور پر کچھ تحریک وتحرک پیدا ہوا ہے جو انشاءاللہ دیرپا ثابت ہوگا۔

کب پورے ہوئے عابد جو کام تھے کرنے کے
کچھ کر بھی دیا صاحب کچھ رہ بھی گیا صاحب

میں کیا میری اوقات کیا؟ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ میری خاندان کی معتبر دینی فضا میں نشو ونما ہوئی اور علیگڑھ نے فکر ونظر کے نیم وادرواز وں کو علم وفن کی تازہ ہواؤں سے تروتازہ کردیا۔علیگڑھ نے تسنیمہ کی رفاقت کا جوتحفہ عطا کیا تھا اس کی معنویت پر ہارورڈ نے آٹھ چاند لگا دیے اور وہ اس علمی سفر کی رفیق اور رہنما بن گئیں۔وماتوفیقی الا باللہ

علیگڑھ نے ان تازہ ہواؤں کے دریچوں کو کھول دیا تھا جس پر ہمارے بزرگوں نے احتیاط کے پردے ڈال رکھے تھے ان ہواؤں کے جھونکوں نے دلی،لندن،ہارڈورڈ اور اقرأ کے قیام کے دوران ایسے وا کیا کہ ہم پورے عالم میں اقرأ کے پیغام کو لیکر آج تک گشت کر رہے ہیں۔ بہت کچھ ہوگیا،بہت کچھ باقی ہے۔۔علیگڑھ کی عطا کردہ انتھک لگن،عمر کے عطا کردہ ضعف کے باوجود آج بھی خضر راہ ہے۔

گزر گئی ہے جوانی یہ غم نہیں ہے میاں
ہمارا ولولہ ءشوق کم نہیں ہے میاں
جہاد زیست دمادم قلندری غازی
کہا یہ کس نے کی اب دم میں دم نہیں ہے میاں

☆

یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کی یہ خبر ملی کہ عزیزم طارق منصور میاں وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ یہ بہت بڑی خوش خبری ہے۔وہ علیگڑھ تحریک کے وارثوں میں ہیں۔ان کے والد ہمارے محترم استاد تھے اور رشید الظفر مرحوم بہت عزیز دوست اور لندن کے رفیق۔

رشید الظفر کی تحریک پر،سعد محمود ہاشمی،ڈاکٹر منصور (لکھنوی)،یوسف حمید اور تسلیمہ غازی کے ساتھ گھنٹوں گفتگو کرکے ہندستان میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے کیے لئے لندن میں بہت سے پلان بنائے تھے جو آج بھی تشنہ ہیں۔ہمیں امید ہے کہ منصور میاں ان خوابوں سے خوب واقف ہونگے۔ ہماری دعائیں اور مشورے ان کے ساتھ رہیں گے۔ان کو مبارکباد اس

مصرعہ کے ساتھ دیتا ہوں؛

اے گل بتو خور سندم تو بوئے کسے داری

میری علیگڑھ کی یہ یادیں سرسید کی دوسو سالہ تقریبات کے موقع پر ایک حقیر ہدیہ ہیں

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد　　کچھ مجھ کو نہیں تیری محبت کے سوا یاد

(جگر مرادآبادی)

عابداللہ الانصاری غازی

شکاگو،۴ر جون ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدینہ منزل سے جنیدی صاحب کے گھر
(۱۹۴۹ء)

خدا خدا کر کے وہ دن آ گیا جسے سلسلہ امتحانات کہتے ہیں۔۷۰۶۶۰ رول نمبر ملا۔ ہم جماعت کے ساتھیوں نے با جماعت گورنمنٹ اسکول کا رخ کیا کہ اپنی اپنی سیٹ کا تعین کر لیں تا کہ صبح صبح جب امتحان کے لیے پہنچیں تو وقت ضائع نہ ہو۔ جوں جوں قدم اسکول کی طرف اٹھ رہے تھے پانچ سال پہلے کی یاد آ رہی تھی جب میں مدرسہ سے نکل چکا تھا اور اسکول سسٹم میں داخل نہیں ہوا تھا۔ میں زبیر حسن (ماموں) اور شمیم اختر (بھائی) اہل مدینہ منزل کے ساتھ اسی طرح ان کی ہائی اسکول کی سیٹوں کی دریافت کے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت میں مدرسہ تعلیم کی برتری پر یقین کامل رکھتا تھا اور اسکولوں کو مغربی استعمار کا آلۂ کار پھر بھی اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی جب میں زبیر ماموں اور شمیم بھائی کو ترقی کی اس منزل پر پاتا تھا جو میرے سرحدِ ادراک سے بھی دور تھی۔ شمیم بھائی کی ہائی اسکول کی کامیابی میں مجھے یوں بھی دلچسپی تھی کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ امتحان کے بعد اپنا فونٹین پین مجھے عطا کر دیں گے۔ یہ بات انہوں نے یاد بھی رکھی تھی اور میں نے بھی ان کے قلم کو اپنے ہائی اسکول تک حفاظت سے رکھا تھا۔ میں اسی قلم سے اپنا امتحان لکھنے جا رہا تھا۔ آج میرے قدم جس منزل کی طرف اٹھ رہے ہیں وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

میں اسکول سے ہنسی خوشی لوٹ کر بیٹھک میں واپس آیا تو دل چاہا ابا جان میرے پاس موجود ہوتے تو وہ کس قدر خوش ہوتے اور میری والدہ حیات ہوتیں تو وہ کس قدر مسرور ہوتیں۔ میں زندگی کے اس خلا میں اتر گیا جو ماں کی عدم موجودگی اولاد کو دے جاتی

ہے۔اُس وقت میں اٹھا اور اسی محلے میں مولوی مشیت اللہ کی گلی میں اُس گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا جس میں ایک ڈیڑھ سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ رہا تھا۔مجھے اُس وقت یہ بھی یاد آیا میری ننھی منی سی بہن عابدہ بیگم اسی گھر میں بعمر ایک سال فوت ہوکر اسی بجنور کی مٹی میں پیوند ہوگئی تھی لیکن مجھے نہ اس کی قبر کا نشان معلوم تھا نہ قبرستان کا پتہ۔اس وقت وہ پرانا گھر اور اس کے ساتھ وابستہ چند یادیں تھیں، والدہ کے جسم کا لمس، ابا جان کے رخسار کے بوسے، ملازم شفیع کی گود، شاعروں ادیبوں کی محفلیں۔ان یادوں نے ماں بن کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور چند آنسو تھے جنہوں نے میرے ساتھ رفاقت ومحبت کا حق ادا کیا۔انسان بھی عجیب ہے وہ اپنی ہر خوشی اور غم میں ان لوگوں کو تلاش کرتا ہے جن سے اُسے محبت ہوتی ہے۔میری اس کامیابی میں شریک ہونے والے یوں تو بہت سے لوگ تھے جو محلہ قاضی سے مدینہ منزل تک پھیلے ہوئے تھے مگر وہ لوگ اس وقت موجود نہ تھے جو اس کامیابی میں میری خوشی کا عنوان بنتے۔میں رات بھر یہ سوچتا رہا پتہ نہیں ابا جان کو یہ خبر ہے کہ نہیں ان کا بیٹا ہائی اسکول کا امتحان دینے جارہا ہے۔بار بار والدہ کی لوری کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

جب تو بی اے پاس کرے گا۔
ایل ایل بی کی آس کرے گا۔
جج بن کر اجلاس کرے گا۔

سو جا میرے پیارے سو جا۔سو جا راج دلارے سو جا۔

میں زبانِ حال سے والدہ سے کہہ رہا تھا۔"آپ کے عابن نے آج آپ کی دعاؤں اور خواہشات کی تکمیل کی طرف بہت بھرپور قدم اٹھایا ہے۔آیئے اور اس ڈگمگاتے قدم کو سہارا دیجیے۔"

ہائی اسکول کا امتحان اس وقت میرے لیے معراج مومن سے کم نہ تھا۔والدہ کی

آواز دل کی دھڑکنوں سے ٹکرا کر کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور اس تنہائی کے اندھیارے میں امید کی شمع لے کر مستقبل کی رہنمائی کر رہی تھی اور پھر میری زبان پر یہ جاری ہو گیا۔

پیاری امی!

تم سے چھوٹے ایک زمانہ بیت گیا ہے

صورت بھی کچھ یاد نہیں ہے

نقش بھی سب مدھم مدھم ہیں

پھر بھی تمہاری یادوں سے ہے

امیدوں کی شمع فروزاں

میری شامِ ہجر درخشاں

یہ پوری نظم بھی اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئی۔ اِسے میں نے بچپن کی مایوسیوں میں آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا تھا لیکن وقت کی دھوپ نے اب وہ روشنائی بھی خشک کر دی اور وہ اردو لکھنے والا قلم بھی مجھ سے چھین لیا جو میرے خاندان کا عظیم ورثہ تھا۔

ہائی اسکول کا امتحان زندگی کا سخت ترین اور طویل ترین امتحان تھا۔ شروع ہو کر ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا اس طوالت میں بھی لطافت کے پہلو تھے۔ پرچوں کے درمیان کا وقفہ ہی دراصل ہماری کامیابی کا ضامن بن گیا۔ پھر دوستوں کی بروقت مدد تھی جو ہمیشہ میری زندگی کا سرمایہ رہی ہے۔

میں (مئی ۵۱ء) موسم گرما کی تعطیلات میں سلطان پور میں خالو ریاض الدین (دسٹرکٹ پلاننگ آفیسر) کے گھر پر تھا جب نماز فجر کے بعد لیڈر اخبار کے ذریعہ مجھے رول نمبر ۷۰۶۶۰ درجہ دوم میں پاس ہونے کا مژدہ ملا۔ مجھے اس نتیجہ کا پہلے سے یقین تھا۔ میں کہتا تھا ''فرسٹ کلاس آ نہیں سکتی اور سیکنڈ کلاس جا نہیں سکتی۔'' زندگی کے امتحان بھی اسکول کے امتحان کی طرح ہوتے ہیں جس میں ہر ایک طالب علم جانتا ہے اس نے کیسی

تیاری کی ہے اور کیسا نتیجہ نکلے گا۔ یہ بات الگ ہے ہم اپنی ہٹ دھرمی سے اپنی ناکامیوں کے الزام کے لیے احباب، اجداد، اقرباء، شومی قسمت اور فلک کج رفتار کو تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی زندگی کے امتحانات کے نتیجے کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتے ہیں وہ اپنی ناکامیابیوں کے تجزیہ سے کامیابی کے راستے تلاش کرتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کو مستقبل کی مزید بہتری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مگر ہمارا قومی مزاج تو مرثیہ کا ہے جو غزل کو بھی آہوں سے نوازتا ہے اور اشکوں کا تحفہ دیتا ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جن تک علامہ اقبال کا یہ پیغام پہنچا ہے؟

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

سلطان پور سے علی گڑھ

ہائی اسکول امتحان کا نتیجہ:

سلطان پور میں خالو ریاض الدین نے مجھے فجر کی نماز کے وقت اخبار لیڈر لا کر دیا جس میں ہائی اسکول کا نتیجہ شائع ہوتا ہے۔لیڈر اخبار کی لیڈری بس یک روزہ ہوتی ہے اور اس دن وہ ہر اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے بک جاتا ہے۔اس کے حصول کے لیے نوجوانوں کو سردھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے،اور وہ مجنوں وار صحراءِ علم کے ریگستان میں اس لیلیٰ علم کے خبرنامہ کو حاصل کرنے کے لیے بے خطر کودتے ہیں۔خالو جان ضلع کے پلاننگ آفیسر تھے، میرے لیے یہ کام خالو جان کے ملازم نے اسٹیشن ماسٹر کی مدد سے باسانی کر دیا تھا۔میں نے لرزتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ فرسٹ کلاس کے صفحات سے گزر کر سیدھے سیکنڈ کلاس پاس کے صفحہ پر نظر ڈالی اور وہاں خفی حرفوں میں ۶۶۰۷ لکھا تھا جو میری نظر پڑتے ہی جلی ہو کر کائنات میں پھیل گیا۔

میں دوڑ کر خالو جان اور بہنوں کو لپٹ گیا۔اس دن تمام روز ایک بے خودی و سرشاری کی کیفیت رہی۔دوپہر میں قیلولہ کے لئے لیٹا تو کئی بار چارپائی سمیت فضا میں لہرانے لگا، چند سال پہلے تک جس کامیابی کا تصور بھی نہ کیا تھا وہ میرے قدموں میں تھی اور جن امکانات کی خواہش بھی محال تھی وہ اب تمنا کا دوسرا قدم بن گئے تھے۔دل بے اختیار چاہتا تھا کہ ابا جان میرے پاس ہوں یا میں ان کے پاس ہوں۔میں ایسی خوشیوں پر والدین تو کیا خاندانوں کو جشن برپا کرتے دیکھا تھا۔یہ سوچ کر اپنی تنہائی کا احساس اور گہرا ہو گیا۔

چند دن سلطان پور میں قیام کر کے میں سلیم میاں کو لے کر واپس امیٹھہ پہنچا۔میں نے ابا جان کو خط لکھ کر اس خبر کی اطلاع دی اور مستقبل کے لیے مشورہ مانگا۔دل میں دبی دبی امنگ علی گڑھ کی جاگی۔علی گڑھ جانے کا امکان تو پیدا ہو گیا تھا لیکن وسائل کا مسئلہ اہم تھا۔ ابا جی ،نانی جان، خالو جان اور اعزاء کو کامیابی کی خبر ملی۔ہر طرف سے مبارک باد وصول

ہوئی۔ پورے قصبہ میں یہ خبر پھیل گئی۔ ہمارے خاندان میں انگریزی پڑھا لکھا اول تو تھا ہی شاذ شاذ، اور جو تھا وہ بھی پاکستان چلا گیا تھا۔ جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان میں سے اکثر کہیں جانے کے لائق تھے نہ کسی کام کے قابل۔ اس لیے پورے خاندان میں دور دور تک میں تنہا تھا جس نے اس سال یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ مستقبل کے لیے اکثر لوگوں کا مشورہ تھا کہ پاکستان چلے جائیں یا نوکری کریں۔ سب سے خوش آئندہ بات یہ محسوس ہوتی تھی کہ گھروں میں اشارتاً یا شرارتاً شادی بیاہ کی بات چلنے لگی۔ لڑکیوں کی نشاندہی ہونے لگی۔ بعض لڑکیاں جو بچپن سے بے تکلفی سے ملتی تھیں ان میں سے کچھ نے پردہ کرلیا کچھ نے شرمانا شروع کردیا۔ سب سے زیادہ خوشی کا اظہار ہماری بستی کے معروف قصائی المعروف بہ گھوڑا نے کیا۔ ''میاں صدقے جاؤں بس اتنی پڑھائی بہت ہے اللہ میاں تمہیں قانون گو لگوادے۔ تم پنڈت نہرو سے کہہ کر ہماری دکان دلی میں کھلوا دینا۔''

ابا جی (نانے ابا) البتہ خاموش تھے۔ ایک دن مجھے بٹھا کر سمجھایا۔ ''بیٹا یہ انگریزی تعلیم دماغ کا فتور اور دل کا زہر ہے۔ تم دارالعلوم جاؤ اور اپنی دینی تعلیم اپنے بھائی جان اور ابا جان کی طرح مکمل کرو۔ دیوبند ہمارا دینی اور تاریخی ورثہ ہے۔''

انھیں اس وقت میرے ذہن کی پرواز کا اندازہ نہ تھا۔ میں اپنے بزرگوں کے راستے سے بہت دور نکل گیا تھا۔ چند سال قبل میں انگریزی تعلیم پانے والوں سے دینی تعلیم کے حق میں مناظرہ کرتا پھرتا تھا۔ کالر والی قمیصوں کے کالر کٹوا کر انہیں مشرف بہ کرتہ کرتا تھا۔ انگریزی بال منڈوا کر سر گھٹواتا تھا مگر اب میرا کاروانِ فکر نئے راستے پر رواں دواں تھا۔

خوشی کے اظہار کے ساتھ ابا جان کا مبارک باد کا خط آیا۔ آئندہ کے لیے انھوں نے فیض عام کالج میرٹھ کا انتخاب کیا۔ وہاں ان کے نائب مدیر چشتی صاحب کا گھر تھا۔ جہاں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ایسی مثبت خبر میں بھی سخت تامل تھا۔ میں اب تک مختلف گھروں میں رہ کر تھک چکا تھا دل اب آزادی کا طلبگار تھا۔

علی گڑھ پہلا قدم:

میں نے ہمت کر کے ابا جان سے علی گڑھ جانے کی اجازت طلب کی اوران کے جواب کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ابا جان کو خط لکھنے کے بعد ڈاکخانہ جا کر اس کے جواب کا معمول اسی دن سے بن گیا تھا جس دن خط میل کیا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ جواب میں کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔ لیکن اس معاملہ کا تعلق عالم اسباب سے نہ تھا کیفیات سے تھا۔ یوں ابا جان سے خط وکتابت میں باقاعدگی نہ تھی۔ ان کا تعلق جس پیشہ سے تھا اس میں دن بھر لکھنے کے بعد قلم اور انگلیوں میں اتنی جان نہیں رہتی کہ کسی کو جواب لکھ سکے۔ ان کے خط کم لکھنے کی شکایت ہمیں ہمیشہ رہی کیونکہ ان سے یہی قلمی رشتہ ہماری زندگی کی مشعل تھا۔ ان کی مجبوری کا عرفان اس وقت ہوا جب ہم نے خود قلمکاری کو پیشہ بنایا۔ دراصل باپ خود بننے کے بعد والدین کی عظمت اور مجبوریوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں نے علی گڑھ نامہ دفتر کے پتے پر بھیجا تھا کہ وہاں اس کا ملنا یقینی تھا۔ اور خلاف توقع اس کا جواب ایک ہفتہ میں وصول ہوگیا۔ میں نے ایک دن ڈاکخانہ کے دروازے سے ابا جان کا لفافہ دیکھا اور ڈاکیہ سے عالم بے قراری میں اسے مانگا۔ ڈاکیہ کو تعجب ہورہا تھا کہ کسی کو ہندوستان سے آنے والے خط کا اس طرح اشتیاق کیوں ہورہا تھا۔ انھوں نے کہا ''ارے کیا تیری سادی (شادی) کا خط ہے۔'' اس وقت مجھے یا انھیں یہ وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ یہ خط شادی (بمعنی خوشی) کا پیغام تھا اور شادی بمعنی (عروسی) کا تیرہ سال قبل پیش خیمہ تھا۔ میں نے وہ خط کھول کر سب دوستوں کے مجمع میں پڑھا جس میں یہ مژدہ کچھ اس انداز سے تھا۔

''تمہاری علی گڑھ جانے کی خواہش علی گڑھ سے ہمارے اس علمی اور خاندانی تعلق کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش ہے جو ہمارے دادا مولانا عبداللہ انصاریؒ نے سرسید تحریک اور علی گڑھ سے قائم کیا تھا اور محترم چچا احمد میاں مدرس اول شعبۂ دینیات، پھوپا

رشید احمد پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی اور عزیز گرامی محامد اللہ انصاری کے ذریعہ وہ قائم رہا۔علی گڑھ میں اب بھی میری (چچازاد) بہن محمودہ خاتون اور ان کے شوہر شاہ فاروق احمد صابری مقیم ہیں۔وہ تمہارے رہنما ہوں گے۔دادے ابا کے متعدد شاگرد وہاں موجود ہیں۔پروفیسر حبیب صاحب (شعبۂ تاریخ) نے دادا ابا سے تعلیم پائی ہے اور اباجی مولانا منصورؒ سے کابل میں ۱۹۳۶ء میں ملاقات کی ہے ان سے رہنمائی حاصل کرنا۔ہمارے دوست مولانا عبدالشاہد خان شیروانی مدیر جمہور تمہارے مربی ہوں گے ان کے پاس تمہارے اخراجات بھیج رہا ہوں۔وہ تمہارے سرپرست و معاون رہیں گے۔تمہارا علی گڑھ جانا میرے اور اباجی کے مقاصد کی تکمیل کا حصہ ہے۔اللہ تعالیٰ کو جن سے کام لینا ہوتا ہے وہ امتحانات سے گزر کر پارس بنتے ہیں تم سے قدرت کو جو عظیم خدمات لینی ہیں علی گڑھ مشیت کے اس پلان کا حصہ ہے۔میرے حالات کچھ بھی ہوں میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا۔

پھر یہ اہم نصیحت تھی جو میری زندگی کا نصب العین زندگی بھر رہا۔'' خاندانی اختلافات اور خرافات کو نظر انداز کر کے علمی فتوحات اور امکانات پر توجہ دو جو کام کرو اس میں کمال پیدا کرو۔ اصل کمال فن ہے سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں محض تصدیق نامے ہیں۔ان کا حاصل کرنا مقصد نہیں حصول مقصد کا ذریعہ ہیں۔''

اپنی یادداشت کے مندرج یہ مضمون نہ اباجان کی تحریر کی طرح شگفتہ ہے نہ اس میں ان کی رجائیت کا مکمل پیغام ہے پھر بھی انھوں نے جو پیغام دیا تھا وہ کاغذ سے ذہن پر منتقل ہو کر حال کی روشنی اور مستقبل کا مقصد بن گیا تھا اور اب بھی ہے۔جون اور ۱۹۵۱ء سے اکتوبر ۹۲ء تک وہ اس پیغام کی تجدید اپنی تحریر اور گفتگو سے کرتے رہے اور آج ان کی رخصت کے بارہ سال بعد بھی ان کی یہ آواز کانوں میں سلسلۃ الجرس کی طرح گونجتی رہتی ہے۔اور فکر و عمل کے اس راستے کو گوناگوں مشکلات کے باوجود سہل بنا رہی ہے۔

میں نے یہ خط دوستوں کے مجمع میں پڑھا تو سب نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ ان تمام نوجوانوں کے مقاصد زندگی میں افسوس ہے تعلیم کا حصول نہ تھا۔ ہمارے معاشرے میں اُس دور میں کیا، اِس دور میں بھی رہنمائی کا ایسا پروگرام نہیں جو بچوں اور نوجوانوں کے مستقبل کی نشاندہی کر سکے۔ اور ان کو تعلیمی مستقبل کے لیے تیار کر سکے۔ میرا معاملہ بھی اپنے ان عزیزوں اور دوستوں سے الگ نہ تھا لیکن ایک غیر محسوس طاقت تھی جس نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور مجھ سے تعلیم کے حق میں فیصلے کرائے۔

میں جب محلّہ خانقاہ میں شاہ مقصود احمد صاحب کے آستانہ سے گزرا تو انھوں نے اخاہ! ماشاء اللہ!! سے استقبال کیا آگے بڑھا تو پیر جی بھورے نے مبارکباد دی اور بڑھا تو (ماموں) بخشی شریف نے خوشی کا اظہار کیا۔ میاں اکبر انصاری نے ڈاکخانہ سے گھر کی طرف دوڑ لگادی تھی اور راستے بھر ہماری کامیابی کا اعلان کرتے چلے گئے تھے۔ غرض ہم جس طرف بھی گئے تہنیت اور مبارک باد کی صداؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ اپنے محلے میں خالہ امت الرحمٰن: خالہ منان، ممانی سبحان، دادی حبیبہ، دادی بھو چچی بہو، ہر ایک نے بجا طور پر اس کامیابی کو اپنی دعاؤں کا انعام سمجھا۔

اس زمانے میں ''کھلونا'' دہلی میں ایک کہانی چنومیاں کی آرہی تھی انھوں نے کوئی دوا استعمال کرلی تھی جس کے اثر سے ان کا قد بڑھنا شروع ہوگیا تھا، میرا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ اس وقت میرا قد تو بمشکل پانچ فٹ تھا اور میں کتابیں پڑھ پڑھ کر مختلف ایکسر سائز کرتا تھا کہ اس میں چند انچ اور اضافہ ہوجائے۔ لیکن علی گڑھ جانے کی خوشخبری نے چنو میاں کی دوا کا اثر کیا اور قد نے بڑھنا شروع کردیا۔ مجھے ہر لمحہ لگتا تھا میں بڑھ رہا ہوں۔ پھر آئینہ دیکھتا مگر اس دور میں قد آدم آئینہ کہاں تھے۔ گھر میں ایک آئینہ تھا جس کا چوتھائی حصہ غائب تھا اور نصف چوتھائی کو زمانہ کی نظر کھا گئی تھی۔ اس میں چہرہ بھی قسطوں میں دیکھنا پڑتا تھا۔ لیکن میں اس دن اس میں اپنا قد وقامت ہی نہیں دیکھا اپنا آنے والا دور بھی دیکھ رہا تھا۔

نانا جان کا تاثر پورے قصبہ سے الگ تھا۔ان کا مجھے دارالعلوم بھیجنے کا پلان درہم برہم ہوگیا تھا۔انھیں بھی میرے مستقبل کی فکر تھی لیکن اس مستقبل کی تھی جو اس عارضی مستقبل کے بعد کا تھا۔شام میں وہ میرے ساتھ بیٹھے اور اپنے تاثر کا اظہار کیا۔دارالعلوم میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کے لئے آخری نصیحت کی۔

سرسید کے عقائد پر تنقید کے بعد انھوں نے آخری بار کوشش کی کہ میں اپنا ارداہ بدل دوں اور دارالعلوم کے لیے فیصلہ کرلوں۔لیکن میں نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کی کہ یہ ابا جان کا فیصلہ ہے اور میرا اس میں دخل نہیں۔ابا جی خاموش ہو گئے۔البتہ نانی جان اور آپا حمیدہ خاموش نہ ہوئیں اگر چہ میں ان کی گفتگو سے یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ میرے علی گڑھ جانے کے حق میں ہیں یا خلاف۔ایک ہی زبان میں وہ کالج کی تعلیم کی تعریف بھی کرتیں اور تنقید بھی۔

علی گڑھ تیاری اور نانی جان:

مجھے چند دن چنو میاں سنڈروم (Syndrom) سے نکل کر نارمل ہونے میں لگے۔اور علی گڑھ جانے کی تیاریوں کی فکر ہوئی۔علی گڑھ جانے والوں کا میرے سامنے خاندان میں کوئی نمونہ نہ تھا البتہ مدینہ منزل کے تینوں شہزادوں تو حید حسن، سعید اختر اور جمیل اختر کی آمدورفت کی کچھ یادیں تھیں لیکن میں کسی بھی منزل کا کوئی شہزادہ نہ تھا۔

میرے سامنے تو بھائی عطن کا نمونہ تھا وہ کس طرح دارالعلوم جاتے گھر میں کئی دن ان کے لیے ناشتے تیار ہوتے۔اگر چہ ان کا سفر دو تین گھنٹے کا تھا لیکن ان کا زادراہ حاجیوں کے قافلے والوں کا سا تیار ہوتا تھا۔اس سلسلہ میں یہ بھی سننے میں آیا کہ علم دین پڑھنے میں کس قدر دماغ خرچ ہوتا ہے۔ہم نے تو بعض گھروں میں قرآنی مکتب جانے والے بچوں تک کے سر میں بالائی کی مالش ہوتے دیکھی تھی اور ان کے کھانوں میں کثرت سے اصلی گھی کا استعمال ہوتا تھا۔حالانکہ قرآنی مکتب کے طالب علم کو دماغ اتنا استعمال نہیں کرنا پڑتا جس قدر استاد ازرہِ شفقت اس کے ہاتھ پاؤں کا استحصال کرتا ہے۔مسلمانوں میں

یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی، اور اسے درجہ تو اتر حاصل تھا، کہ جہاں استاد کی چھڑی پڑ جاتی ہے وہ جسم کا حصہ جنت میں جاتا ہے۔ ہمارے قرآنی مکتب کے اساتذہ طلباء سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ وہ انھیں پورا کا پورا جنت میں بھیجنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اوران کے درجات بلند کرنے کے لیے انھیں مرغا تک بنایا جاتا ہے۔

ع یہ رتبہٗ بلند ملا جس کو مل گیا۔

ہمارے یہاں یہ لاڈ پیار زچہ کا (اگر اس نے اولاد نرینہ میں اضافہ کیا ہو) داماد (خاص طور پر اگر وہ نکھٹو ہو) اور مدرسہ کے طالب علم کا (اگر اس کا تعلیم میں دل نہ لگتا ہو) ہوتا تھا اور ہم تینوں میں سے ایک بھی نہ تھے۔

کالج کے طالب علموں کا نقشہ جو ہماری نانی جان کھینچتی تھیں اس میں تو فصلِ گل میں بادِ بہاری کے جھونکے تھے۔ دوستوں کی محفل میں مہوشوں کے ہجوم تھے۔ فواروں کی پھلجھڑیوں میں نو بہار ناز کے رقص تھے۔ یہ جنت کے ان حصوں میں سے تھا جہاں داخل ہوتے ہی طالب علم کو ہر چیز اس کی عین خواہش کے مطابق دستیاب ہو جاتی تھی۔ ہم ان تفصیلات پر خوش ضرور ہوتے لیکن یہ نہ سمجھ سکے کہ نانی جان کو یہ معلومات کہاں سے دستیاب ہوئیں؟ اور ان کے بیان کا کیا مقصد ہے؟

سامان کی فراہمی اور میرا لوٹا:

میں نے اس عرصے میں توحید ماموں کو بجنور ہدایات حاصل کرنے کے لئے خط لکھ دیا تھا۔ توحید ماموں نے خط کا فوری جواب دیا، بے حد خوشی کا ظہار تھا اور علی گڑھ میں اپنا میکڈ انلڈ کا پتہ لکھا تھا جہاں میں ان کے ساتھ ٹھہر سکتا تھا۔ علی گڑھ کی ضرورت کی فہرست طویل تھی جس میں چارپائی میز کرسی سے لے کر کپڑے اور سوئی دھاگے سب شامل تھے اکثر طلباء ضروریات کا جملہ سامان اپنے ساتھ لاتے تھے۔ علی گڑھ جا کر معلوم ہوا کہ بہاری طلباء تو اپنے ساتھ کنستروں میں ابلے انڈے گھی اور حلوے پورے سال کے حساب سے لاتے تھے۔

اور احباب کی مدد سے گھنٹوں میں ختم کرتے۔ ان بہاریوں کا دل بھی ان کے کنستروں اور سامان کی طرح وسیع تھا۔ مجھے ابھی تک علی گڑھ کا تجربہ نہ تھا۔ میں نے اپنی فہرست ابا جی کو پیش کر دی۔ انھوں نے سامان کی نشاندہی شروع کر دی جو میں لے جا سکتا تھا میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر انھوں نے نانی جان سے مشورہ کیا تو نانی جان نے کالج کے ہونہار طلباء کی ضروریات سے کماحقہٗ واقفیت کی بنیاد پر اس فہرست کو مختصر کرنا شروع کر دیا۔

''گھر میں ایک بھی پلنگ اس قابل نہیں کہ علی گڑھ جائے۔ یہ موئے تو برآمدے سے صحن تک آنے کے بھی قابل نہیں۔'' کرسی میز کا سوال ہی کیا گھر میں تھیں ہی کتنی؟ لوٹا بھی بدرو تانبہ کا تھا اگر چہ وہ خود میرا تھا۔ خطرہ تھا طلباء اس لوٹے کو دیکھ کر ہنس دیں گے۔ دلائی اور لحاف میں کڑوے تیل کی بو بسی تھی۔ نانے ابا نے اپنی نئی شال کی پیشکش کی تو وہ قصائیوں والے گہرے نیلے رنگ کی نکلی جو کالج کے لڑکوں کے لیے مناسب نہ تھی۔ شیروانی کا کپڑا بڈھوں والا بھورے رنگ کا تھا۔ معلوم ہوا کالج کے لڑکے درزیوں سے کپڑے سلواتے ہیں وہ سوئی دھاگے کے چکر میں نہیں پڑتے۔ غرض گھر کے شیشے سے سوئی تک کچھ نہ بچا تھا جو اس کالج کے شہزادے کے شایان شان ہوتا۔

روانگی سے چند دن قبل ابا جی نے نانی جان کو یاد دہانی کرائی کہ زادِ سفر ضرور تیار کروا دیں تو انھوں نے فرمایا۔ ''اوئی، تم بھی کس زمانے کی بات کرتے ہو، وہ مدرسہ مولوی بننے جا رہا ہے کہ کالج جنٹلمین۔ کالج کے لڑکے پسند نہیں کرتے مولویوں کی طرح کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لے کر پھریں۔ یہ لوگ ہوٹل میں ماشاءاللہ سے کھانا کھاتے ہیں جہاں بیرے ان کی خدمت کرتے ہیں۔''

میں گھر سے کچھ سامان تو نہ لے سکا لیکن نانی جان سے کالج کی زندگی کے آداب کا واضح نقشہ ضرور ہاتھ آ گیا۔ چلتے چلتے میں نے آنکھ بچا کر اور کمال چابکدستی سے اپنا تانبہ کا لوٹا اٹھا لیا جس میں نانی جان کے اس گھر میں آنے کے بعد بھی میرا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔

رخصت کے صدمے یا روانگی کی خوشی یا تاثر میں یہ غیر متنازعہ اثاثہ میرا رفیق سفر بھی رہا اور علی گڑھ کے آٹھ سال کے قیام میں اپنے ننھیالی گھر سے میرے نازک رشتے کی یادگار بھی۔

انبہٹہ کو خدا حافظ:

آپا حمیدہ جن سے خانہ جنگی تعطیلات کا مشغلہ تھا لپٹ گئیں کہنے سننے کی معافی مانگی اور اپنے موٹے موٹے آنسوؤں سے مجھے خدا حافظ کہا اور جاتے جاتے نصیحت بھی کر دی: ''وہیں کوئی لڑکی پسند کر کے شادی نہ کر بیٹھنا۔'' میری خالہ امت لمنان، خالہ امت الرحمٰن اور دیگر خواتین نے مجھے چشم نم سے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا: ''آج مونا کی روح کس قدر خوش ہوگی۔ اللہ نے اس کے بیٹے کو یہ دن دکھایا۔'' اس وقت دل ے نکلنے والی کتنی دعائیں میرا زادِ سفر تھیں اور ہمیشہ رہیں۔

موٹر کے اڈے پر ایک ہجوم مجھے رخصت کرنے آیا۔ ان میں بھائی عطن بھی تھے وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا: ''تمہارے ساتھ جو معاملہ ہوا مجھے اس کا صدمہ ہے۔ جب تک والدہ حیات ہیں اس گھر کی شکستہ اینٹ کی بھی قدر و قیمت ہے۔ ان کے بعد اس گھر میں جو کچھ ہے اس میں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو وہ تمہارا ہے۔'' افسوس جس اثاثہ کی نانی جان کی زندگی میں اس قدر اہمیت تھی وہ ان کے انتقال کے بعد اس سرعت سے خاندان کے مختلف افراد میں منتقل ہوا کہ نہ تو میرے کچھ ہاتھ لگا نہ شاید بھائی عطن کے ورثے میں کچھ آیا اور درحقیقت ہمیں اس کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ پھر بھائی عطن نے میری جیب میں خاموشی سے دو روپیہ رکھ دیئے جو انھوں نے چھٹیوں کے دو ماہ میں ایک ایک پیسہ کر کے میرے لیے جمع کئے تھے۔ اس دور کے ان دو روپیوں میں غیر معمولی برکت تھی۔ ایک مولوی طالب علم کا عطیہ تھا جس کے پاس خود ماں (نانی جان) کی دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اور جس نے اپنی بے سروسامانی میں دوسروں کے سروسامان کی فکر رکھی اور جب قدرت نے اسے مولویت کے باوجود نوازا تو اس نے والدین اور اعزاء کی محبتوں

کے حقوق پورے پورے ادا کیئے۔

بس میں جا کر بیٹھا تو حاجی رشید صاحب (سابق صدر انبہٹہ مسلم لیگ) شریک سفر تھے۔انھوں نے پوچھا"کیا علی گڑھ کا سفر ہے؟"جی ہاں! آپ کی دعاء سے"انھوں نے اپنی خوشی کا اظہار میری تعریف اور علی گڑھ کی تاریخ سے اس طرح کیا گویا وہ ۴۶ء کے مسلم لیگ جلسہ کو خطاب کر رہے ہیں۔میں اس ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں سہارنپور تک قومی ہیرو کے درجہ پر فائز ہو گیا تھا اور علی گڑھ تک پھر سے چنو میاں سنڈ روم میں مبتلا رہا۔

درحقیقت وہ بزرگوں کی نسل عجیب تھی جو چھوٹوں کی چھوٹی سی ترقی کو بڑھا دیتی تھی اور ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتی تھی۔حاجی صاحب کی مسلم لیگ سے میں بچہ وار کانگریس کی طرف سے مقابلہ کرتا رہا تھا اور وہ مردانہ وار مجھ سے شفقت فرماتے رہے تھے۔انھوں نے مجھے مسلم لیگ میں آنے کی دعوت نہ دی لیکن مخالفت کی حدود اور تنقید کا سلیقہ سکھایا اور مسلم لیگ کے ہر اجتماع میں توقیر سے صف اول میں بٹھایا۔اب ان کی اولاد ان کے جذبۂ خیر کی امین ہے اور قصبہ کی سطح پر بلا تفریق مذہب وملت تعلیم اور سماجی خدمت میں پیش پیش ہے۔ انسان اپنا بہترین ورثہ اپنی اولاد کو اخلاص عمل کی شکل میں پیش کرتا ہے۔حاجی صاحب نے جو کام کیا اخلاص سے کیا۔وہ قوم کو پاکستان کا اور اولاد کو اخلاص کا اور شاہنامۂ اسلام جلد ششم کا تحفہ دے کر ہندوستانی شہری رہ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انّا للہ و انّا الیہِ راجعون۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہلا سال (۵۲-۱۹۵۱)

چاند تارے بھی زیرِ قدم آ گئے

یہ کہاں تیری چاہت میں ہم آ گئے

جنت کادروازہ:

علی گڑھ کا اسٹیشن میرے لیے جنت کے دروازے سے کم نہ تھا۔ پہلی بار میں نے زندگی کا وہ سانس لیا جسے آزادی کہتے ہیں۔ پہلی بار اِکّہ سے واسطہ پڑا۔ مغربی یوپی میں تانگہ کی سواری عام تھی۔ لیکن اِکّہ نہ تھا جس میں تانگہ کی طرح سیٹیں نہیں ہوتیں۔ سامان اِکّہ میں رکھ کر اس طرح اس پر چڑھ بیٹھا جیسے دولھا گھوڑے پر سوار ہو۔ اسے شمشاد بلڈنگ میں محمود ریسٹورنٹ کا پتہ بتایا جس سے وہ واقف تھا۔ شمشاد بلڈنگ پر جو چہل پہل تھی وہ انبہٹہ، دیوبند، بجنور میں نہ دیکھی تھی۔ ہر طرف سیاہ شیروانی میں ملبوس نوجوان طالب علم ٹہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اکادکا نقاب پوش لڑکیاں بھی خرید وفروخت میں آزادانہ مصروف تھیں۔ یہ منظر جنت کے تصور سے کم نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ حور وغلمان کو فرشتوں نے نیا نورانی لباس عطا کر دیا ہے۔

سیّد فاروق حسین صابری: صوفی تاجر اور ناصح:

محمود ریسٹورنٹ کے مالک شاہ سید فاروق حسین صابری صاحب میرے پھوپا تھے۔ وہ انبہٹہ کے پیرزادگان وسجادگان وصوفیاء کرام کے خاندان سے تھے۔ ان کی بیگم محمودہ خاتون (ابا جان کی فرسٹ کزن، مولانا احمد میاں انصاری کی صاحبزادی اور مولانا عبداللہ انصاری) اول ناظم دینیات کی پوتی علی گڑھ کی مشہور مڈوائف تھیں جنھوں نے طبیہ کالج دہلی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ صابری صاحب نے ریسٹوریںٹ کا نام محمود اپنی بیگم کے نام پر رکھا تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے اپنی صابری نسبت کی وجہ سے ریسٹوریںٹ کا نام لنگر خانہ صابری رکھ دیا تھا۔ وہاں علی گڑھ کے منچلے پہنچ گئے اور خوب چھک کر کھانا کھا کر یہ کہہ کر چل دیئے کہ ’’لاحول ولاقوۃ! صابری کے لنگر کا بل دو؟ یہ اولیاء اللہ کے طریقہ کے خلاف ہے۔‘‘ یہ سن کر

صابری صاحب نے ''یا صابر کلیری'' کا نعرہ لگایا اور سجدۂ شکر میں چلے گئے وہاں سے اٹھے تو جذب کے عالم میں کہہ گئے یہ سب کچھ (مڈوائف بیوی کی مالی معاونت کو فراموش کر کے) صابر کی دین ہے شوق سے کھاؤ۔ان کا نعرۂ مستانہ یونیورسٹی میں گونج گیا اور دو دن ان کا لنگر جاری رہا تیسرے دن صبح ناشتے کے لیے جب قوم پہنچی تو وہاں محمود ریسٹورنٹ کا بورڈ تھا۔

صابری صاحب کے بارے میں اطہر پرویز نے 'علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں جو کچھ لکھ دیا اس پر اضافہ مشکل ہے۔ میں نے بھی صابری صاحب کو ۵ سال دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہ یقیناً شمشاد بلڈنگ کے دولھا تھے۔دن میں پانچ دفعہ لباس بدلتے اس سے زیادہ ٹوپیاں اور اس سے زیادہ جوتے۔اگر پھوپی محمودہ کے پاس دو تین سادہ جوڑے تھے تو صابری صاحب کے پاس پورا جہیز تھا۔ایک کمرہ میں ان کے صرف جوتے سجے ہوئے تھے۔

ایک زمانے میں انھوں نے جوتوں کی تجارت کی تھی تو بتقاضاءِ دور اندیشی زیادہ جوتے اپنے اور بیگم کے ناپ کے لے آئے تھے کہ اگر دوکان نہ چلی تو گھر میں چل جائیں گے۔ان کی احتیاط ان کی زندگی بھر جوتوں کی شکل میں کام آتی رہی۔ پھوپی جان کے جوتوں کا پتہ نہیں کیا بنا، ہوسکتا ہے ان کا ناپ اور صابری صاحب کی محبوبہ (جو بعد میں مسز خیری بنیں) کا ناپ ایک رہا ہو اور گھر اور سامان کے ساتھ جوتے بھی وہاں پہنچ گئے ہوں۔اس جوتہ نوازی پر پھوپی محمودہ کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔ یوں بھی وہ قدیم ہندوستانی مسلمان متوسط طبقہ کی اقدار کی محافظ تھیں۔محبوبہ کو اپنے ہاتھ سے اس کا پسندیدہ کھانا بنا کر حسب فرمائش بھیجتیں۔ پھوپا جان کے کہنے پر انھوں نے اس نئے متوقعہ جوڑے کے لیے دعا تک کردی مگر دعا کو اثر کے ساتھ دشمنی نکلی اور حکیم خیری کی حکمت عملی نے دوست کی محبوبہ کو خیر سے ان کی منکوحہ بنادیا۔

صابری صاحب کو ہر چیز کا شوق تھا اور پھوپی جان اس گھر کی واحد معاشی کفیل تھیں۔ وہ مقبول اور معتبر مڈوائف تھیں اور شیروانی نوابوں کے ہاں شادی کے وقت سے

نیک ہو جاتیں۔ صابری صاحب نے مختلف تجارتیں کیں اور بقول ان کے انھیں ہر تجارت سے فائدہ ہوا لیکن پھوپی جان پر کام کی ذمہ داری اور قرض کا بوجھ بڑھتا رہا۔ دراصل صابری صاحب کو جو مالی نقصان ہر تجارت میں ہوتا تھا وہ اس رقم کو، اپنی تفریح کی قیمت کا بھاؤ بڑھا کر منافع بنا دیتے تھے۔ پھوپی جان بھی قانع تھیں۔ شوہر کی دوکانداری زھرہ جان کی ناز برداری سے نسبتاً سستی تھی۔

میں نے صابری صاحب کو دیکھا بھی تھا اور ان کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ وہ اِکّہ سے ہی نظر آ گئے۔ ہوٹل کے داخلہ کے دروازے پر ایک اونچا چبوترہ تھا جہاں سے وہ حساب کتاب، بظاہر دیکھتے تھے لیکن درحقیقت دوست نوازی کرتے۔ میں نے اِکّے سے اتر کر حاضری دی، سلام عرض کیا تو فرمایا ''آپ کی تعریف؟''

''عابداللہ غازی ابن حامدالانصاری غازی''

سراپا حیرت واستعجاب میں غرق ہو کر اُبھرے پھر فرمایا ''تمھارا مولوی خاندان دیوبند کی زکوٰۃ کی روٹیوں پر تعلیم پاتا ہے۔ تمھیں تباہ کرنے کے لیے دیوبند کچھ کم نہ تھا کہ آپ یہاں تشریف لے آئے؟ دیوبند میں آدمی مفت تباہ ہوتا ہے، علی گڑھ میں پیسہ خرچ کر کے؟''

میں نے مؤدبانہ عرض کیا ''میں نے دیوبند کے فارغین کو تباہ ہوتے دیکھا نہ علیگڑھ کے۔ میں والد صاحب کے حکم پر حاضر ہوا ہوں اور ان کے حکم پر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔''

''بہت خوب! اگر آپ میری خدمت میں رہیں گے تو آپ کو تجارت اور طریقت دونوں سے واقفیت ہو جائے گی۔ لیکن یونیورسٹی کا رخ مت کرنا۔ اس ذاکر حسین نے تو یونیورسٹی کا رہا سہا وقار بھی غارت کر دیا۔''

میں ان کی اِس شگفتہ بیانی سے چکرا گیا اور ڈرا کہ کہیں یہ مجھے اپنے گھر مستقل مہمان نہ رکھ لیں اور میرے آزادی کے سارے خواب ادھورے رہ جائیں۔ ان سے اس قسم

کی طنزیہ گفتگو کے سلسلہ کا یہ آغاز تھا جو میری ان سے آخری ملاقات جون ۵۶ء تک جاری رہا۔آہستہ آہستہ ہم بھی ان سے بے تکلف ہو گئے۔ہم اپنے موقف کا دفاع بھی کرتے اور ان کے موقف پر سخت تنقید بھی۔ہماری گستاخیوں کا وہ برانہیں مانتے تھے بلکہ وہ ان کے سمند ناز کے لیے تازیانہ ہوتیں اور وہ ان بالوں سے کھالیں نکالتے۔ہم انھیں مواد فراہم کرتے رہتے۔

خیر اس وقت مجھے پھوپی جان (محمودہ خاتون) سے ملاقات کی جلدی تھی پھر میکڈانلڈ تلاش کر کے توحید ماموں (توحید حسن ابن مولوی مجید حسن) سے ملاقات کرنی تھی۔میری فرمائش پر انھوں نے اوپر کی منزل تک میری رہنمائی کی جہاں پھوپی جان پلنگ پر دراز پنکھے کی مدد سے مچھروں سے جنگ کر رہی تھیں۔مجھے سامان سمیت دیکھ کر ان کی رگِ امومیت پھڑکی اور وہ اس طرح بستر سے اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ میرے استقبال کے لیے آگے بڑھیں جیسے انھیں اپنی دونوں مرحوم بیٹیوں کا نعم البدل مل گیا ہو۔انھوں نے نہ صرف میرے لیے کمرے کے مستقل قیام کے لیے نشاندہی کر دی بلکہ اُن لڑکیوں کا ذکر بھی شروع کر دیا جن کے ساتھ میرا مقدر کھل سکتا تھا۔میری آمد سے ان کی زندگی کو بہت سے نئے عنوانات مل گئے۔

توحید ماموں سے ملاقات اور سرسید کی کرامت:

کچھ دیر گھر میں ٹھہر کر میں میکڈانلڈ کی تلاش میں نکلا جو شمشاد بلڈنگ سے متصل ہی تھا۔وہاں توحید ماموں کا سراغ لگ گیا۔انھیں پا کر میری تکان دور ہو گئی اور مجھے دیکھ کر ان کو اخلاق اور شفقت کے مظاہرہ کا موقع مل گیا۔اخلاق کے لیے انھیں کوشش کی ضرورت نہ تھی وہ اس کے عادی تھے اور میرے معاملہ میں فیاض بھی تھے۔میں ان کے ساتھ سعید ماموں (سعید اختر) اور جمیل بھائی (جمیل اختر) کے پاس آفتاب ہوسٹل میں ان کے کمرے میں پہنچا۔رات میں بھی یونیورسٹی کی عظیم الشان عمارتیں انگریزی، اسلامی اور ہندوستانی

طرز تعمیر کا نمونہ دل و دماغ پر اثرات مرتب کر رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا:

''سید احمد عجیب شخص تھا جو کچھ سوچا قوم کے لیے سوچا، جو کچھ کیا قوم کے لیے کیا، جو کچھ مانگا قوم کے لیے مانگا۔ اس کی سوچ، اس کا عمل، اس کی مانگ بھی کتنی عظیم الشان تھی۔ جیسا وہ قوم کو بنانا چاہتا تھا ویسا ہی علی گڑھ میں عملی نمونہ پیش کر گیا۔ اس نے تعمیر کی ہر اینٹ میں اپنے دل کا حصہ رکھ دیا اور اس کی بنیادوں میں اپنا پسینہ، اپنے آنسو اور اپنا خون ڈال دیا، پھر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں شجرۂ طیبہ کی طرح نمودار ہوا۔ گویا: **اصلها ثابتاً و فرعهافی السماء** (اس کی جڑیں مضبوطی سے گڑی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں)

پھر نہ قوم کو سرسید جیسا محب قوم دوراندیش و دانشور ملا نہ مسلم یونیورسٹی جیسا ادارہ بن سکا۔ ان کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے صرف سیاست کو سوچا۔ متحد کرنے کے بجائے تقسیم کی، باتیں کیں، ملانے کے بجائے جدا کیا، مرض کے علاج کے بجائے بے یقینی کی وبا پھیلا دی۔ اتحاد کے بجائے انتشار کے نقیب بن گئے اور اس درسگاہ کو جس نے انھیں زندہ رہنے کے مواقع دیے بوڑھی ماں کی طرح غیروں کے نرغے میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔''

دراصل انگریز نے جاتے جاتے ہمارے بھیک کے پٹارے میں جو ڈال دیا ہم درحقیقت اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ پھر بھی وہ اس قدر تھا کہ اس کا صحیح استعمال اگر ہوتا تو درجنوں علی گڑھ قائم ہو جاتے۔ لیکن انھوں نے مستقبل کا محل تعمیر کرنے کے بجائے ماضی کی بوسیدہ کرسیوں کی تمنا کی اور اس کے گرد کوڑا اجمال شاہی کا کھیل کھیلتے چلے آ رہے ہیں۔

اے علی گڑھ تیرے فرزندوں میں کیا آج کوئی نہیں جو سرسید کے خواب کی تعبیر کر سکے۔

سید احمد نے کس احساس درد کے ساتھ کہا تھا:

"میں اپنی قوم کو آسمان کے مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کی جو نیلا نیلا سیاہ روڈراؤنا دکھائی دیتا ہے، کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں، جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو۔"

علی گڑھ کی چند ساعتوں نے میرے فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ میرا جسم لرزہ براندام تھا اور ذہن ہچکولے کھا رہا تھا!

توحید ماموں نے میری تواضع علی گڑھ کی روایت کے مطابق چائے، نمک پارے اور برفی سے کیفے ڈی پھونس میں کی اور چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ داخلے کے مراحل سمجھاتے رہے۔ اس زمانے میں تو داخلہ ہر ایرے غیرے کو مل جاتا تھا ہم تو پھر بھی ٹھہرے نتھو خیرے۔ ہمارا چار نسلوں کا علی گڑھ سے تعلق، پھوپی محمودہ کی موجودگی، توحید ماموں اور سعید ماموں کی رہنمائی، عبدالشاہد خاں شیروانی (ایڈیٹر جمہور اور لائبریرین) کی سرپرستی ہر چیز ہمارے حق میں تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسکول میں جس طالب علم

کے لیے جیومیٹری بکس کے لیے ابا جان کے لیے ایک روپیہ مہیا کرنا مشکل تھا اس کے لیے انھوں نے ڈھائی سو روپیہ کا منی آرڈر جیسے تیسے ایڈوانس عبدالشاہد خاں شیروانی کے نام بھیج دیا تھا اور چار سو تنخواہ سے ڈھائی سو داخلہ کے لیے مہیا کر دینا ان کی فارغ البالی کی علامت نہ تھا شفقت کا مظہر تھا۔

احمد سعید انڈرا سے پہلی ملاقات:

چائے سے فارغ ہو کر توحید ماموں میکڈانلڈ سے گزرتے ہوئے واپس شمشاد بلڈنگ صابری صاحب کے گھر پہنچانے آئے۔راستے میں بشیر صاحب، حبیب صاحب اور فوق کریمی صاحب کی دو کانوں کے سامنے مجمع لگا تھا ہم سمجھے کوئی مداری تماشہ دکھا رہا ہے۔ذرا قریب آئے تو دیکھا ایک گول مٹول سرخ وسفید چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور موٹے موٹے چشمے والا نوجوان شیروانی پہنے، گلے تک بٹن لگائے، جناح کیپ سے آراستہ رطب اللسان ہے۔اس کا انداز گلفشانی گفتار کیا تھا نثری نظم تھی۔وہ ہنسا بھی رہا تھا اور جوش بھی دلا رہا تھا۔مضمون گفتگو ہماری سمجھ سے باہر تھا لیکن یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ طلبا کی کچھ شکایات یونیورسٹی کے انتظامیہ سے تھیں جسے اردو ادب اور اسلام کا جامہ پہنا کر یہ نوجوان حاضرین کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

یہ کوئی سیاسی جلسہ یا مظاہرہ نہ تھا سرِ راہے گفتگو تھی جس میں اس نوجوان کی گفتگو نے جلسہ کا سماں پیدا کر دیا تھا۔آخیر میں چلتے چلتے مزاقاً اس نوجوان نے کہا۔'' اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو پھر ہم اسلام کو خطرہ میں ڈال دیں گے اور جناح کیپ ہاتھ میں لے کر بولا اس ٹوپی کی سیاست چلیں گے۔'' اس جملے پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور جلسہ تالیوں کی گونج پر ختم ہوا۔اس محفل کے اختتام پر اس نوجوان نے سب حاضرین سے ہاتھ ملایا اور پرانے ساتھیوں کو نئے تعلیمی سال پر خوش آمدید کہا۔نئے طالب علموں کا تعارف حاصل کیا اور پھر لپک کر توحید ماموں سے بغل گیر ہو کر کہا: '' مجھے اب آپ کی ضرورت ہوگی، اس

کمیونسٹ فتنہ کی سرکوبی ضروری ہے۔'' توحید ماموں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا'' یہ ہیں عابداللہ غازی! ایک دن آپ کے قائم مقام ہوں گے۔'' اس پر یہ نوجوان اور زیادہ خوش ہوا اور مجھے دعوت دی کہ آنے والے ستمبر کے یونین کے الیکشن میں ان کا ساتھ دوں اور براہ راست سیاسی تجربہ حاصل کروں۔

وہاں سے رخصت ہوئے تو توحید ماموں نے فرمایا'' یہ احمد سعید انڈا تھے۔ یونین کے مقبول آنریری سکریٹری ہیں اور صدر یونین کا الیکشن لڑ رہے ہیں۔ دراصل ان کو ہرانے والا کوئی کنڈیڈیٹ نہیں۔ مگر کمیونسٹ ان کے مقابلے کے لیے کوئی امیدوار تلاش کر رہے ہیں۔ میں اُس وقت تک کسی کمیونسٹ سے واقف نہ تھا البتہ اپنے خاندانی پس منظر میں اور کمیونسٹوں کے خلاف چند سطحی رسائل پڑھ کر میں ان سے ذہنی طور پر بہت دور تھا۔ احمد سعید صاحب کی الفاظ شماری یا بمباری اور پرتپاک دعوت کے باوجود مجھے خود اُن سے قرب نہیں پیدا ہوا۔ ان کے آخری جملے (جناح کیپ اور اسلام کا استعمال) نے مجھے اُن سے ذہنی طور پر دور کر دیا جو بعد میں ہم دونوں کے اختلاف نظر کی فکری بنیاد بن گیا اور اس نے ہمیں دو مختلف کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ احمد سعید کیمپ میں تو اُس وقت یونیورسٹی کے طلبا کی اکثریت تھی۔ میں اپنے کیمپ میں تنہا تھا اور شاید اب تک تنہا ہوں۔

میں بچپن سے گہری مذہبی فکر رکھتا ہوں اور راسخ العقیدہ مسلمان ہوں مگر میری تفہیم اسلامی عام امت کے مزاج سے مختلف رہی ہے۔ دراصل مجھ پر والد صاحب، علماء دیوبند اور مشائخ چشتیہ، صابریہ نے مجموعی اثرات ڈالے ہیں اور میں نے کبھی اپنی ذات، سیاسی مقاصد یا ملی مفادات کے حصول کے لیے ذاتی مقاصد کے لیے مذہب کو بیچ میں لانا جائز نہیں سمجھا۔ ہمارے زندگی کے مسائل ہوں یا اجتماعی کوائف، ہم ہر بات کو اسلام پر ختم کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ آگے آگے رہے ہیں جو عقیدتاً، تہذیباً، لساناً اسلام سے دور تھے۔ ہم نے بچپن میں نعرہ سنا تھا'' پاکستان کا مطلب کیا ہے''؟ '' لا الہ الا اللہ۔'' لیکن

ان نعرہ بازوں کو ''لا الہٰ الا اللہ'' کے لفظی معنی سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ نہ ان کو نہ نعرہ لگوانے والے قائدین کو۔

جس مملکت کے قیام کے لیے یہ نعرہ زور شور سے لگا۔ اس مملکت کے ارباب فکر نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ لا الہٰ الا اللہ کے مفہوم کو اس ریاست میں کیا عملی شکل دیں گے۔ اور یہ مسئلہ آج تک معرضِ التوا میں ہے۔ نعرے لگانا، جلوس نکالنا ہمارا قومی مزاج رہا ہے ان ترکیبوں سے مسائل سلجھتے نہیں الجھتے ہیں۔ سنجیدہ فکر، پلاننگ، عملی اقدام کی ہمارے ہاں کمی ہی نہیں فقدان رہا ہے اور یہ فقدان پورے عالم اسلام کا ورثہ ہے اور خصوصیت سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا خاص حصہ ہے۔ جنوبی ایشیا کے ہندوؤں کے مقابلے میں ہزار سالہ دور حکومت کے باوجود بھی مسلمان کی پسماندگی مسلمان کے اسی جذباتی مزاج کا نتیجہ ہے۔ ہندو جنوبی ایشیا کی اکثریت ہیں جن کے پاس علم دولت اور قوت عمل موجود ہے۔ جنوبی ایشیا کی دوسری اقلیتیں سکھ، جین، پارسی، عیسائی کی ترقی بھی ان کی قوت فکر اور استمرارِ عمل کا نتیجہ ہے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمان کا سب سے بڑا مسئلہ خود اسلام کی تفہیم بن گیا ہے بقول اقبال:

مشرق میں علوم دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

اور یہ بات کہنے سے اب تک فرق یہ پڑا ہے کہ اب علوم دین نہیں غلوءِ دین بن رہے ہیں اور مغرب میں ایک کے تین نہیں، تین تین لاکھ بن رہے ہیں اور ہمارا ایک بھی اب ہمارے پلّے میں نہیں رہا۔

علی گڑھ میں مستقبل میں میری کوشش اسی نئی فکر کو پیدا کرنے کی تھی جو مسلمان کو اپنے دین کی آفاقیت کی تفہیم دے اور ہندوستانیت کا مفہوم سمجھائے مسلمان تعلیم، اقتصادی

ترقی اور اخلاص کی بنیاد پر سماج میں اپنا مقام اپنی قوتِ عمل سے پیدا کریں۔ میں آٹھ سال کے بعد جب مئی ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ سے رخصت ہوا تو یہ فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ علی گڑھ میں رہ کر ایسی قیادت کا پیدا کرنا ممکن نہیں اس لیے میں نے دہلی کو اپنا عملی مرکز بنایا تھا۔ لیکن قسمت نے میرے لیے دوسرا کام مقدر کیا تھا۔ جو دینی تعلیم کا کام میں نے عمر بھر کیا ہے وہ میرے اصل پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ اب جو کام اب تک ادھورا رہا وہ تو شاید ادھورا ہی رہے گا البتہ جو شروع کیا ہے وہ شاید کسی نتیجہ پر پہنچ جائے۔ اس لیے گذشتہ کم و بیش تیس سال سے یکسوئی سے اس کام کو کر رہا ہوں۔

عمرم تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہمچناں دراول وصفِ تو ماندہ ایم

میری تمام عمر گذر گئی اور عمر آخری مرحلے پر پہونچ گئی مگر ہم ابھی تک وصف کی ابتداء تک پہونچے ہیں۔

احمد سعید صاحب سے میری رفاقت اور رقابت کے تقریباً سات سال رہے۔ میری کہانی میں ان کی کہانی بھی شامل رہے گی۔

فرسٹ ایر میں داخلہ:

اگلے چند دن ایڈمیشن کے مراحل کے تھے۔ اسٹریچی ہال میں ایڈمیشن کا دربار سجا تھا۔ بالکل حج کا سماں تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور شام تک کچھ نہ ملتا تھا۔

اگر چہ علی گڑھ کا داخلہ مسلمان کے لیے اس وقت دعوتِ عام تھا یوں جو قابل طلبا تھے انھیں اپنی اپنی علاقہ کی یونیورسٹیوں میں داخلہ مل جاتا تھا وہ علی گڑھ کیوں آتے؟ علی گڑھ کی عملی زندگی کی مرکزیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ پھر بھی بیچارہ ٹھکرایا ہوا تھرڈ ڈویژن، سیکنڈ ڈویژن مسلمان کہاں جائے؟ اور چلا بھی جائے اور بالفرض اُسے داخلہ بھی مل جائے تو وہاں کی تعلیم کا بار وہ کیسے تحمل کرے گا؟ زندگی کا وہ آسان راستہ جس میں زیادہ

مشقت کے بغیر کامیابی حاصل ہو جائے ابھی تک علی گڑھ میں حاصل ہو سکتا تھا۔آئندہ یہاں بھی مسدود ہونے والا تھا۔ یہ خصوصی رعایت کی بات حکومت ہند تک تسلیم کرتی تھی اس نے علی گڑھ میں مسلمانوں کو غیر معمولی داخلے کی مراعات دی تھیں اور مسلمان اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا اور پھر اکثر پاکستان کی راہ لیتا۔ سرسید کے تعلیمی مشن نے جنوبی ایشیا میں جو تعلیمی روشنی پھیلائی تھی وہ ہندوستان میں غروب ہو کر پاکستان سے طلوع ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کا مسلمان اس روشنی کی امید میں اپنے گھر کے جلتے دیے بجھا کر نئی روشنی کی طلب میں دیوانہ وار پاکستان کی طرف دوڑ رہا تھا۔

ہمیں بچپن سے دادے ابّا کی وصیت کے مطابق ابا جان نے سائنس داں بننے کا سبق پڑھایا تھا۔ہم نے اسکول کے تقریری مقابلوں میں سائنس کے حق میں تقریریں کر کے انعامات جیتے تھے۔ ہر چند کہ ہمارا مزاج عاشقانہ، مزاق شاعرانہ اور عمل آزادانہ تھا ہم نے سائنس پر احسان کرنے کی ٹھانی اور پری انجینئرنگ ڈی ٹو (D2) میں ہمارا داخلہ ہو گیا، مگر کافی پاپڑ بیل کر ہوا۔ اس میں توحید ماموں کی رہنمائی اور سعید صاحب (جگت ماموں) ڈپٹی رجسٹرار کی ذرہ نوازی کا بڑا دخل تھا۔ یہ معاملہ اصولاً مشکل نہیں تھا۔ اگر علی گڑھ میں ہم مغرب کی تقلید میں لائن بنانا سیکھ لیتے تو گریبان چاک نہ ہوتے لیکن مسلمان کے لیے ایسے مواقع ع 'لہو گرم رکھنے کا ہیں اک بہانہ' تھے۔

میکڈانلڈ ہوسٹل اور کامریڈ اشتیاق محمد خان:

ہوسٹل کے لیے توحید ماموں نے ہمارے حق میں نہ صرف میکڈانلڈ ہوسٹل کا فیصلہ کر دیا بلکہ اپنے جونیر پارٹنر کامریڈ اشتیاق محمد خاں کو ہمارا سینیر پارٹنر بنا کر ۴۶ میکڈانلڈ میں ممکنہ سامان سمیت پہنچا دیا۔ پھوپی جان کا مشفقانہ اصرار، پھوپا جان کے صوفیانہ اذکار کو توحید ماموں کی علیگیرین تکرار نے وقتی طور پر دبا دیا۔ انھوں نے ہماری خواہش کو ابا جان کا حکم بنا دیا اور ہمیں اُس تربیت گاہ سے نکال لائے جہاں ہمارا مستقبل پھوپا جان کی خانقاہ میں بننے والا تھا۔ ہم

رخصت ہوئے تو پھوپا جان نے توحید ماموں کو واپس بلایا پھر فرمایا: ''میں ان صاحبزادے کی تین نسلوں کو تباہ ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ مولانا عبداللہ انصاری، مولانا منصور انصاری، مولانا حامد الانصاری غازی، اب چوتھی نسل بھی اسی راستے پر جارہی ہے۔ افسوس مجھے اب یہ تباہی بھی دیکھنی پڑے گی۔ یہ سب خرابی دیوبند کے مطبخ کے زکوٰۃ کی روٹیوں کا اثر ہے جو سات نسلوں تک چلے گا۔'' ہم پھوپا جان کے ان دعائیہ کلمات کے بعد رخصت ہو گئے۔

توحید ماموں میکڈانلڈ میں چار سال گزار چکے تھے اس لیے وہ ڈبل روم کے بجائے سنگل روم کے مستحق تھے۔ انھوں نے خود ۴۵ نمبر کمرہ لے کر ہماری سرپرستی قبول کر لی۔ اشتیاق محمد خان اور اس عاصی کے لئے کمرہ نمبر ۴۶ میں انتظام کرا دیا، سعید اختر ماموں (مدینہ والے) اور جمیل اختر آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے جو پڑوس میں تھا۔ شمشاد بلڈنگ متصل تھی جہاں روزانہ پھوپی جان کے پاس چکر لگا آتا تھا۔ محمود ریسٹورنٹ کا کھانا پھوپی جان کا ہاتھ لگنے سے اور ذائقہ دار ہو جاتا اور پھوپا جان کی مشفقانہ نصیحت اسے دوآتشہ کر دیتی اور اب ان کے خوف نے شوق کی جگہ لے لی تھی۔

ابھی پڑھائی جاری ہونے میں کافی وقت تھا۔ کتابیں مہنگی تھیں۔ حاجی احسان صاحب لیکچرار فزکس نے بہت سی پرانی کتابیں جمع کر رکھی تھیں جو وہ طلبا کو عاریتاً دیتے تھے ہم بھی اس خیرات سے مستفید ہو گئے۔ یوں تو اپنی شخصیت سے وہ سراپا تھیولوجی لگتے تھے لیکن فزکس بھی ایسے ہی مزے لے لے کر پڑھاتے تھے جیسے تلاوت کر رہے ہوں۔ علی گڑھ میں ان کی طرح کے بہت سے نمونے تھے جنھیں علی گڑھ قرون اولیٰ کے میوزیم سے علی گڑھ لے کر آیا تھا۔ یہ لوگ کلاس میں استاد مکرم تھے اور کلاس سے باہر والدینِ محترم۔

میکڈانلڈ میں ہم نے پھوپی جان کے گھر سے منتقلی بہت تیزی سے کی تھی۔ پھوپی جان کی ذات میں اس ماں کی محبت تھی جسے میں عمر بھر تلاش کرتا رہا تھا لیکن پھوپا جان کی پیرزادگی، تصوف و تجارت سے میں خائف تھا اور دل میں پوری زندگی دوسروں کے گھروں

پر گزارنے کے بعد آزادی کا جذبہ بے اختیار دل مچل رہا تھا۔پھر مالی طور پر ابا جان نے اخراجات کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

میکڈانلڈ اور اطراف:

میکڈانلڈ شمشاد بلڈنگ سے متصل تھا اس کے سامنے وہ وسیع وعریض میدان تھا جو ریگستان تھا اور ذاکر صاحب اس میں لان اور پھول لگوا کر اسے گلزار کرنا چاہ رہے تھے، اور وہ یہ کام کر گئے۔ اس لان پر مشہور کرکٹ پویلین اور اس کے متصل اولڈ بوائز لاج تھی۔میکڈانلڈ سے مسجد کے عقبی حصے کا نظارہ اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔سنا تھا کہ کرکٹ کے میدان سے مولانا شوکت علی نے گیند پر ایسا اٹھا مارا جو گنبد کے کلس سے ٹکرا گیا۔ ہمارے دور میں شوکت علی ہوتے تو کرکٹ کھیل کر خلافت تحریک چلا سکتے تھے۔یہ بات ان کے ڈیل ڈول سے بعید نہیں تھی لیکن ہم نے انھیں کے ڈیل ڈول کے ان کے صاحبزادے مولانا زاہد شوکت علی مدیر، مالک پروپرائٹر روزنامہ خلافت اور مالک متولی مجاور خلافت ہاؤس بمبئی کو قریب سے اور بہت بار دیکھا۔وہ جب ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو کوشش کر کے یا احباب کی معاونت سے دوسری کروٹ بیٹھ جاتے تھے۔البتہ ان کی گفتگو کے چوکے، چھکے ،اور اٹھے محفل میں ہر سمت چلتے رہتے تھے اور ان کی محفل سے کوئی آزردہ دل بھی بغیر مسکرائے نہیں اٹھتا تھا۔

میکڈانلڈ ہوسٹل کی تاریخ کا ہمیں علم نہیں لیکن سرسید نے انگریزوں سے جس قدر فائدہ مقاصد کے لیے اٹھایا اتنا ہی انھیں یاد رکھا۔ یوں انھوں نے اسٹریچی ہال اور مختلف بورڈنگوں میں تمام معاونین کے نام کندہ کروا دیئے تھے۔اس عمل سے دوسروں کو ترغیب بھی ہوتی ہے اور معاون کی ہمت افزائی بھی۔میکڈانلڈ میں تین رویہ ۴۸ کمرے تھے۔کمرہ نمبر ۱ وارڈن کا تھا۔اس دور میں نائب وارڈن اشفاق صاحب کے نائب مائے ڈین حمید (شاید ماہ دین نام رہا ہوگا) ملیشیا کے رہنے والے مجرد آدمی تھے کمرہ میں خالی بوتلیں اور خالی ڈبے

جمع تھے۔ یونیورسٹی کی ہمدردی میں طلبا پر کڑی نگرانی رکھتے تھے اس لیے طلبا ان کے پریشان کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔طلبا نے ایک بار موسم گرما میں ایک گدھے پر ان کا نام پکی سیاہ روشنائی سے لکھ کر شمشاد بلڈنگ میں چھوڑ دیا۔اس کے بعد ان کو خبر کی کہ آپ کا کوئی ہم نام شمشاد بلڈنگ میں ٹہل رہا ہے۔وہاں مشتاقانہ پہنچے تو گدھے سے ملاقات ہوئی۔اس دور میں کرشن چندر کی ''ایک گدھے کی سرگذشت'' کی کہانی بیسویں صدی میں چل رہی تھی مگر وہ علی گڑھ کی کہانی کہانی نہیں تھی اصل واقعہ تھا۔گویا بع کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے۔مائے ڈین ماتحت بھنگیوں کی مدد سے گدھا ہنکا کر یونیورسٹی ٹیوب ویل پر لے گئے اور اسے لکس ٹائلٹ اور لائف بوئے سوپ سے غسل دے کر قسمت کے لکھے کو مٹا تو نہ سکے اسے دوسرا رنگ دے دیا کہ گدھے اور مائے ڈین کا فرق کچھ واضح ہو گیا۔

میکڈانلڈ کے دروازے کے سامنے لان عبور کرنے کے بعد ہوسٹل کی مسجد تھی جس میں ایک باقاعدہ امام اور ایک مؤذن یونیورسٹی کی طرف سے معقول مشاہرہ پر متعین تھے۔نماز میں دو چار ہی طالب علم شریک ہوتے۔اُس وقت تک جماعت تبلیغ نے علی گڑھ پر توجہ نہیں کی تھی۔ابھی اس توجہ کو ابھی کچھ سال باقی تھے۔امام صاحب کے ذمہ نماز پڑھانے کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہ تھی۔کوئی تعلیمی پروگرام،تفسیر قرآن،درس حدیث وعظ نصیحت قسم کا کوئی اور پروگرام نہ تھا جس سے طلباء کو فائدہ پہنچتا۔اس فن سے نہ مولانا واقف تھے نہ یونیورسٹی کے تعلیمی شعور کا یہ حصہ تھا۔سرسید نے آکسفورڈ کیمبرج سے استفادہ کر کے علی گڑھ کے بورڈنگ ہاؤسوں کو مسجد تو عطا کر دی اس میں وہ چرچ کی روح نہ ڈال سکے جس نے عیسائیت کو عالمی تحریک بنا دیا ہے۔لیکن وہ عیسائی مبلغین اور پادریوں کا جذبۂ خدمت وایثار ہمارے دورکعت کے اماموں کو نہ دے سکے۔

دراصل ہمارے مدارس اسلامیہ میں بھی تعلیم کے ساتھ خدمت کا کوئی تربیتی پروگرام شامل نہیں۔مغرب کی دینی درسگاہیں پادریوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی عملی تربیت کا باقاعدہ پروگرام نصاب میں رکھتی ہیں اور انھیں فیلڈ میں بھیج کر سینیر پادریوں اور سوشل ورکرس

کے زیر نگرانی خدمت خلق کی ٹریننگ دیتی ہیں۔ ہمارے علماء کی تربیت تقریر کی حد تک ہے تعمیر کا اس میں حصہ نہیں اس میں دوسروں کے لیے ترھیب ہے اپنے لیے ترغیب نہیں۔ مدارس اسلامیہ ہوں یا انگریزی اسکول یا مسلم یونیورسٹی کہیں بھی نہ خدمت خلق کی تربیت ہے نہ اس کی ترغیب۔ مغربی دنیا کے ہرادارے میں عملی تجربات اور سلیقۂ خدمت کا اہتمام ہے۔

میکڈانلڈ کے ہر کمرے میں دو طالب علم رہتے تھے۔ البتہ چار سال کے سینیر کو تنہا کمرہ ملتا تھا۔ توحید ماموں سنگل کمرے نمبر ۴۵ میں تھے اور ہم اشتیاق محمد خاں کے ساتھ نمبر ۴۶ میں تھے۔ یوں کھانا پینا رہنا سہنا ہم تینوں کا ساتھ تھا۔ ہر کمرہ میں غسل خانہ تھا گرم پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سردیوں میں نلکے سے برف کے ٹکڑے ٹپکتے تھے جو ہمالیہ کے گلیشیر سے براہ راست نلکے میں پہنچتے تھے۔ اکثر طلباء سردیوں میں کم از کم جمعہ کے جمعہ غسل کا اہتمام کرتے تھے اور بعض خطرناک بجلی کے غیر قانونی اوزاروں سے پانی گرم کر لیتے تھے۔ چائے ان خطرناک چولہوں پر بنانے کا عام رواج تھا۔ اشتیاق اور ہم روزانہ نعرہ تکبیر کہہ کر لحاف سے جست لگاتے اور نلکے کے نیچے ہوتے، اشتیاق خاں یہ کام فجر سے پہلے کرتے اور ہم طلوع آفتاب کے بعد اور وہ عادت آج تک قائم ہے اگر چہ اب امریکن زندگی نے وہ ناز برداریاں کی ہیں کہ ہندوستان میں لڑکے کو سسرال میں بھی میسر نہیں ہوتیں۔ یہاں چوبیس گھنٹے پانی بھی میسر ہے اور گرم اور ٹھنڈا پانی بھی حسب ضرورت موجود رہتا ہے۔

اشتیاق محمد خاں راسخ العقیدہ سچے کیمونسٹ تھے۔ وہ کیمونسٹ لٹریچر پڑھ لکھ کر ایمان لائے تھے اس لیے چاہتے تھے کہ ہر طالب علم مارکس پر ایمان لے آئے اور داس کیپٹل Das Capital کا مطالعہ کرے۔ وہ خود جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تربیت گاہ سے آئے تھے جہاں ہائی اسکول تک پانچ وقت کی نماز لازمی تھی اور قرآن کا باقاعدہ درس ہوتا تھا اور دینیات کے لیے مستند استاد تھے۔ جامعہ کے بہت سے طالب علموں کو دیکھا کہ وہ جامعہ سے نکلتے ہی ترقی پسند تحریک کا حصہ بن جاتے تھے۔

کامریڈ اشتیاق محمد خان۔سینئر پارٹنر:

اشتیاق محمد خان بھی علی الصبح غسل کے بعد اپنی سریلی آواز میں چھوٹی قرآنی سورتوں کا ورد کرتے ان کا ورد عبادت کے خانے میں نہیں آتا تھا عادت مانا جاتا تھا۔اس کے بعد وہ کمیونسٹ لٹریچر کا مطالعہ کرتے۔اشتیاق محمد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔وہ پیوپل پبلشنگ ہاؤس People Publishing House سے کمیونسٹ لٹریچر ادھار منگوا کر اسے فروخت کرتے تا کہ جیب خرچ نکلے۔ان کے باقاعدہ خریداروں میں بعض صحیح العقیدہ مسلمان بھی تھے جو محض اس لیے لٹریچر خریدتے تھے کہ اس کے شر سے قوم کو محفوظ رکھیں۔ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ایسے بے دین لٹریچر کو قرض حسنہ پر لیا جائے اور جب خاں صاحب پیسہ مانگنے آئیں تو اسے ہنس کر ٹال دیا جائے۔حساب کتاب رکھنا بھی خاں صاحب کے بس کا نہ تھا وہ قایم گنج کے خاندانی پٹھان تھے۔حساب دوستاں در دل رکھتے اور مقروض رہتے۔ صالح کمیونسٹ کی طرح ان کا عقیدہ تھا کہ انقلاب تبت کے راستے ہندوستان میں داخل ہو رہا ہے اور تحت اللفظ میں کیفی کی نظم یہ پڑھتے:

ہمالیہ پر کھڑا ہے ماؤ
اور ایشیا کو بلا رہا ہے
بلند جودہ کا ہاتھ
فتح وظفر کا رستہ دکھا رہا ہے۔

اس دور میں روس سے کمیونسٹ پروپیگنڈا ٹنوں کے حساب سے آتا تھا اور کوڑیوں کے مول بکتا۔ٹائٹل کچھ بھی ہو موضوع کوئی ہو اس پر تین مشرع اور ایک مچھرہ (مونچھوں والا) چہرہ ان گراس (Engross) ہوتا۔کارل مارکس انجبل لینن شانہ بشانہ سائڈ پوز میں ہوتے اور سب سے اوپر "عالمی مزدوروں کا رہنما" اسٹالین کوٹ اور مونچھوں سمیت ان کی پردہ پوشی کرتا۔کتابوں کا کاغذ اعلیٰ تھا اور جلد ارفع تھی اور اس میں ہندوستانی اخباری کاغذ کی

سوندھی سوندھی خوشبو (جس کے ہم بچپن سے عادی تھے) نہ تھی بلکہ کرم کلے کی سی بو ہوتی۔ ہمارا کتاب خرید کر پڑھنے سے زیادہ اُسے سجانے کو دل چاہتا۔سوویت رسالوں میں بچے، بڑے، بوڑھے صحت مند اور خوبرو نظر آتے۔ ہمارے بچوں کے پچکے گالوں کے برخلاف سوویت بچوں کے گال سرخی سے مالا مال ہوتے اور گولائی لیے ہوئے گبدو گبدو لگتے۔وہاں کے بوڑھے جوان نظر آتے اور جوان لڑکپن کی عمروں میں۔

وہاں ڈائننگ روم کی تصویروں میں میز پر ہر نعمت سجی نظر آتی تھی اور باغات کا ہر پیڑ پھول اور پھل سے لدا پھدا ہوتا۔ یہ سوویت یونین کے ختم ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ان تصویروں میں اُس نظام کی جھلک نہیں تھی اس کا اشتہار تھا۔ پروپیگنڈے کو کیپٹلسٹ سوسائٹی میں ایڈورٹائزمنٹ کہتے ہیں۔ دونوں نظاموں نے جھوٹ کو بیوپار بنا رکھا تھا۔اصل اور نقل کا فرق ختم ہو گیا۔ افسوس! ہم مسلمان تو اپنے اصلی مال کو بھی دوسروں کو بیچ نہیں پا رہے۔اور اس کو اپنی کمزوری نہیں سمجھتے دوسروں کی کم نظری اور بدنیتی گردانتے ہیں۔

اشتیاق محمد خاں یوں تو کنگال تھے لیکن خوش اوقات آدمی تھے۔توحید ماموں کا اور میرا خرچ باقاعدگی سے آتا تھا جس میں نہ صرف ان کا ضروری خرچ چل جاتا بلکہ ان کے سارے کامریڈوں کی دن میں دو دفعہ چائے پانی بھی ہو جاتا۔اشتیاق محمد خاں کو موسیقی کا شوق تھا۔غزلوں کی وہ دھنیں خود بناتے پھر بینجو پر ان کو بجاتے۔فیض، سردار، کیفی، حسرت، مجیب الرحمان، مجاز غرض پورے کمیونسٹ کیڈر کو انھوں نے غزلا دیا تھا۔کامریڈ لوگ جمع ہو کر ان سے غزل کی فرمائش کرتے اور میری جونیرٹی سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے میزبانی کے فرائض ادا کراتے۔ میں بے لوث چائے سازی کی خدمت انجام دیتا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس خدمت میں نہ نفع دنیا ہے نہ نفع آخرت۔ان محفلوں میں ہماری خانقاہوں کا رنگ تصوف تھا اور کمیونسٹ انقلابی ترانوں میں قوالی کا آہنگ تھا۔لنگر کے تیار کرنے اور تقسیم کرنے کی خدمت میرے ذمہ تھی۔

توحید ماموں کٹر مسلمان تھے انھیں بھی آواز کا قدرت سے تحفہ ملا تھا وہ بھی اشتیاق کی لے میں لے ملا دیتے۔ وہ مدینہ منزل کے سیاسی کانگریسی ماحول کے برخلاف غیر سیاسی آدمی تھے۔ان کا سیاسی موقف بدلتا رہتا تھا لیکن عام طور پر مدینہ منزل کے کانگریسی موقف کے خلاف رہتا تھا۔ اس ماحول میں پڑھنا لکھنا مشکل تھا، پھر بھی میں کبھی کبھار میز کرسی پر پڑھنے کی غرض سے بیٹھتا تو چاروں طرف سے ہوٹنگ شروع ہو جاتی۔''پائنٹر ٹاپ کرنا ہے کیا؟'' اور ہم منفعل ہو کر اپنی دوکان بڑھا دیتے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ جاتے ، ہمارا تعلیمی ذوق ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی تہذیب کا مضر اثر ہے۔

کامریڈس اور فیلو ٹریولرس:

میکڈانلڈ میں شارق اور ماجد دو کامریڈ شخصیات تھیں۔تمام کمیونسٹ اساتذہ مثلاً ڈاکٹر نورالحسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، سلامت اللہ خاں، مونس رضا وغیرہ تو اس معیار پر رہتے تھے جس پر وہ دنیا کے مزدوروں کو لانا چاہتے تھے یعنی کوٹھی، کار اور مغرب کا اعلیٰ معیار۔ شارق اور ماجد نادانی میں مزدوروں کے معیار پر خود کو رکھنا چاہتے تھے۔اس لیے انھوں نے چار پائیاں کمرے سے نکال کر بھس پھیلا دیا تھا اور سیاسی مباحث کا وہ اکثر بذریعہ کشتی اس بھوسے کے میدان میں اس طرح فیصلہ کرتے کہ ایک دوسرے کا بھوسہ نکل جائے۔

اشتیاق محمد خاں کے قریبی کامریڈوں میں بھائی خاں (اقتدار عالم خاں) ہر طرح ممتاز تھے۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کمیونسٹوں میں سب سے زیادہ صاحب تقویٰ ہیں۔انھوں نے طے کیا تھا کہ ''دروغ برگردن سوء ظن''، کہ انقلاب آنے تک وہ نہ دانت مانجھیں گے، نہ بالوں میں کنگھا کریں گے نہ کپڑوں پر استری کرائیں گے نہ مسکرائیں گے نہ تیوری سے بل ہٹائیں گے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ وہ شادی بھی انقلاب کی دیوی سے کریں گے جس میں وہ سارے اوصاف ہوں گے جو ان میں تھے اور اس میں قوت شامہ کا فقدان ہو۔ بھائی خان کارل مارکس کے داس کیپٹل پر اس طرح اعتقاد رکھتے تھے

جیسے مسلمان قرآن پر۔

میکڈ لنلڈ میں عام لوگ تو بس عام لوگ تھے یعنی مسلمانوں کے آسودہ گھرانوں سے آئے تھے۔اکثر تعلیم پا کر پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے۔باقی لوگوں کو ہندوستان میں قسمت آزمائی کرنی تھی۔جماعت تبلیغ ابھی دور تھی البتہ جماعت اسلامی کے کچھ اثرات تھے۔میکڈ لنلڈ میں ارشاد صاحب (مولانا اقبال سہیل کے بھانجے) تھے خاموش مزاج سنجیدہ، فکرِ عقبیٰ اور اسلامی ریاست قائم کے تصور میں غرق۔وہ جماعت اسلامی کے ممبر نہ تھے رفقاء میں تھے۔ہم دونوں مسجد میں آتے جاتے تھے۔اکثر ملت کے درد کا رونا روتے۔ان کے ہاں ہنسی کا دفتر نہ تھا اور میں اپنی خوش طبعی کو اُن پر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک بار انھوں نے دعوت دی کہ حلقہ اسلامی کی شمشاد بلڈنگ میں میٹنگ ہے۔مجھے اپنی رہنمائی میں وہاں لے گئے۔مسجد کے احاطے میں فوٹو اسٹوڈیو کے زیر سایہ (جس پر جلی حروف میں لکھا تھا ''فوٹو بھی اچھی یادگار ہے'') ارشاد صاحب سے بھی سنجیدہ چھوٹی چھوٹی داڑھیوں اور لمبی شیروانیوں والے کچھ احباب جمع تھے۔اِن سب کے پیر مغاں سید انور علی صاحب تھے جو بلند قامت تھے اور قائدانہ شخصیت رکھتے تھے۔انھوں نے حالات کا جائزہ لیا۔سیکولرزم اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے خطرات پر روشنی ڈالی، اقامت دین کی اہمیت واضح کی پھر جلسہ ختم ہو گیا۔نہ ناشتہ نہ کھانا نہ دعا نہ درود۔نہ ہنسنے بولنے کی گنجائش نہ کسی عملی پلان کا نقشہ، نہ سیاسی تدبر نہ اجتماعی پلان نہ تعلیمی نقشہ، نہ عددی طاقت جس سے تحریکیں بنتی ہیں اور آگے چلتی ہیں۔ان اسلامی تحریکی جلسوں میں بھی اکثر شرکت کی، ادب اسلامی کی محفلوں میں غزلیں اور افسانے پڑھے لیکن تحرک نہ پیدا ہوا۔ان کی فکر کا اس وقت کے حالات سے تعلق نہ تھا اور وہ جس مستقبل کا نقشہ بنا رہے تھے وہ سہانا سہی لیکن مبہم خواب لگتا تھا۔

ایک تقریب میں کسی رفیق نے نظام باطل کا مطلب سمجھا کر ثابت کیا تھا کہ ہندوستانی نظام باطل ہے اور مسلمان کو اس کے کسی شعبے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے۔یہی

بات دراصل دائیں بازو کا ہندو بھی چاہتا تھا اور اس وقت طاقت میں آ کر عملاً کر رہا ہے۔ اس جماعت کے مختصر سے گروپ میں بھی دو تین سال بعد جان پڑنے والی تھی جب رامپور سے جماعتِ اسلامی کی ثانوی درسگاہ کے طلبا (نجات اللہ صدیقی، عبدالحق انصاری، عرفان احمد خان، اشتیاق احمد) دینی تعلیمی نصاب کو ختم کر کے واپس آئے۔ یہ لوگ فکری انقلاب تو نہیں لائے لیکن اسلامی فکر کی کچھ لہریں ضرور بیدار کیں جو ان لوگوں کے سعودی عربیہ اور امریکہ، آسٹریلیا جانے کے بعد بحرِ عرب کے ڈالر کی موجوں میں ڈوب گئیں۔ بیرون ہند میں رہ کر انھوں نے دنیا کے حسنات جمع کر کے انھیں آخرت کے لیے امریکہ برطانیہ کے بینکوں میں جمع کرا دیا۔

علی گڑھ کا بنیادی ذہن:

یونیورسٹی کے مسلم طلباء کی اکثریت ابھی تک مسلم لیگی ذہن کی تھی اور پاکستان جانے کے لیے تیار رہتی تھی۔ ان کی اس بے یقینی میں ہندوستان کے حالات اور سیاست کا بھی حصہ تھا۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں پر معاش کے دروازے بند ہو رہے تھے تو پاکستان میں ابھی پوری طرح کھلے تھے۔ وہاں ملازمت کے لیے اہلیت، ڈگری، ڈویژن کی اس وقت شرط نہ تھی، علی گڑھ کی ہر ڈگری مقبول تھی۔ وہاں جا کر:

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے؟

اور ہندوستان میں رہ کر:

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے؟

پاکستان جا کر جو شخص آتا تھا اس کے چہرے پر رونق، کپڑوں میں نفاست، گفتگو میں تیقن، بات میں جتنگڑ اتنا واضح ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان کے ہر بے روزگار مسلمان کے لیے دعوتِ ہجرت بن جاتا۔ اگر علی گڑھ نے پاکستان کو بنایا تھا تو پاکستان علی گیرینس کو بنا رہا تھا اور علی گیرینس پاکستان کو تعمیر کر رہے تھے۔ لڑکے تو لڑکے علی گیرین لڑکی کو بھی پاکستان

میں قابل شوہر اور اعلیٰ ملازمت مل جاتی تھی۔

اسٹوڈنٹس یونین کے الیکشن میں یہی مسلم لیگی ذہن کا گروپ سب سے اہم تھا۔ لیکن اس کی کوئی تنظیم اور نام نہ تھا اور عرف عام میں اینٹی کمیونسٹ کہلاتا تھا۔ جماعت کے چند لوگ اس گروپ کی قیادت کی کوشش کرتے تو اپنے اصولوں سے ہٹ جاتے اور اصولوں پر جمتے تو اس گروپ سے کٹ جاتے۔ الیکشن میں اسلام، پاکستان اور اردو کے نام کا استعمال عام تھا اور اکثر اس طرح لیا جاتا جس سے یونیورسٹی اور ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا۔ جو کنڈیڈیٹ ایسا نہ کرتا اس کا اپنا اسلام خطرہ میں پڑ جاتا اور وہ چاہے نہ چاہے کمیونسٹ کہلانے لگتا۔

علی گڑھ کا سب سے منظم گروپ کمیونسٹوں کا تھا جو طلبا میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن یا ایس ایف (S.F) کے نام سے مشہور تھا۔ اس گروپ کے پاس ۵۰۰-۶۰۰ کا ووٹ بینک تھا لیکن یہ مشرقی یورپ کی کمیونسٹ تحریکوں کی طرح جمہوری، سیکولر اور قومی نام پر متحدہ محاذ بناتی تھیں۔ ایس۔ایف میں خواتین نہ صرف شریک تھیں حسب ضرورت قیادت بھی کرتیں اور اپنے دوپٹے کا کبھی پرچم بناتیں اور کبھی اُسے مردوں کی عقل پر ڈال دیتیں۔ جلسے جلوسوں میں مردوں کے شانوں سے شانہ ملا کر انقلابی انداز سے چلتیں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس طرح نعرے لگاتیں گویا: ع آ گئی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں!

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ تحریک کا متحرک ''داس کیپٹل''، یعنی اصل سرمایہ تھیں۔ ویمن کالج بورڈنگ میں البتہ پابندیاں بہت سخت تھیں۔ نہ خواتین کو باہر جانے کی اجازت تھی اور نہ مردوں کو ان کے شہر نگاراں میں اندر آنے کی صورت تھی۔ مجاز کے دعوے

یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں

شاعرانہ تعلّی ہیں۔ ممتاز آپا، مس روہرا، مس تھامس اور دولتا جمعدار کے ہوتے ہوئے وہاں

پرندے کو پر مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ مریم کی دونوں بیٹیاں اور دراوڑ خاندان کے دولتا نفاذ شریعت کا وہ کام انجام دیتے جو سعودی عرب میں مطوع (مذہبی پولس) اور پاکستان کے علماء انجام نہ دے سکے۔

کمیونسٹ تحریک میں یوں تو اساتذہ اور طلبا میں بہت سے جلیل القدر اور عظیم المرتبت لوگ تھے لیکن سلطان نیازی کی آمد نے ان میں نئی زندگی ڈال دی تھی۔ علی گڑھ کے نیازی برادرس سلطان نیازی، اقبال نیازی اور آفتاب نیازی اور رضا برادرس مونس رضا، معصوم رضا (راہی) مہدی رضا اور احمد رضا کمیونسٹ تحریک کی جان تھے اور دونوں برادریوں میں بڑے بھائی سلطان نیازی اور مونس رضا کا اعتبار اور رتبہ بلند تھا۔ سلطان نیازی مونس رضا کے کلاس فیلو تھے لیکن تعلیم نامکمل چھوڑ کر کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انقلاب اتنی تیزی سے آرہا ہے اس لیے تعلیم میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ کچھ عرصے بعد تعلیم مکمل کر کے علیگڑھ آ گئے تھے۔ یہ عمل بہت نوجوانوں نے کیا خود ہمارے پارٹنر اشتیاق محمد خاں بھی بی۔ اے کے بعد سرخ جھنڈا لے کر دو سال دلی کی سڑکوں پر مارے مارے پھرے بھلا ہوان کے ناگہانی عشق کا انھیں دال روٹی کی فکر ہوئی اور علی گڑھ واپس آ کر بی۔ ایڈ کر کے دو روٹی کمانے کے قابل خود کو بنا سکے۔ اس سے زیادہ کی نہ انھیں طلب تھی نہ خواہش۔ اسی کی خاطر انھیں ایمان بھی لانا پڑا۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے بمبئی میں انچارج رہے۔ خدمت اسلام کی سعادت بھی آخیر عمر میں نصیب ہوئی اور علی گڑھ اور سرسید پر انھوں نے ڈاکومینٹریز بھی بنائیں۔ سلطان نیازی دنیا سے مجرد ہی گئے۔ آخرت میں انھیں ایسی خواتین مل گئی ہوں گی جن کی جوانیاں انقلاب کی آمد کے انتظار اور بڑھاپا اس کی رخصت کے غم میں گزر گیا۔

ہمیں ایک دن دعوت ملی کہ ایس ایف کی طرف سے نئے طلبا کا استقبال ہے اور مونس رضا صاحب اور سلطان نیازی صاحب خطاب کریں گے۔ ہم نے ہر محفل میں ان دونوں کی

تقریر کا شہرہ سنا تھا پھر یوں بھی اتنے دن کا مریڈوں کی خدمت کرتے کرتے ان کے بارے میں مزید جاننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اشتیاق محمد خاں کے سینیر پارٹنر ہونے کے ناطے پائے مفر بھی نہ تھا اس لیے ہم بھی پا بجولاں اس محفل میں پہنچے جو سید محمد ٹونکی کی بیٹھک میں (میریسن کورٹ کے بالمقابل) منعقد ہوئی۔ اس میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ چائے، نمک پارے، برفی سے تواضع ہوئی جو خواتین نے اپنے دست خاص سے پیش کیں، پھر تقاریر ہوئیں۔ ایک خاتون بھی بولیں کسی نے کہا ''چھپا ہیں'' کسی نے کہا ''بیا ہیں'' ہمیں ان کے جوش وجذبہ کی قدر ہوئی کہ الفاظ سے زیادہ ان کے گلے کی رگوں کا تموج آنے والے انقلاب کا اعلان کر رہا تھا۔ مونس رضا صاحب نے بتایا کہ جدلی مادیت کیا ہوتی ہے۔ اُس دور میں ماؤزی تنگ کی فکر کا چرچا بہت تھا اور ماؤ صاحب نے پنگ پانگ کے میچ کو طبقاتی جدوجہد سے تعبیر کیا تھا۔ ہمارے تو ابھی پنگ پانگ تک سمجھ میں نہیں آئی تھی جدلی مادیت کیا آتی۔ سلطان نیازی کی انگریزی تقریر تو پلّے نہ پڑی مگر ہم انھیں سنتے رہے اور کہتے رہے

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

سلطان نیازی کی انگریزی تقریر بے نظیر تھی اور احمد سعید کا اردو خطاب لاجواب تھا۔ ہم نے اپنی زندگی میں ان دونوں علیگیرین حضرات کا یونین کے مباحثوں میں تو کیا زندگی میں جواب نہیں دیکھا۔ خاص طور پر جب یونین میں ان دونوں کا مقابلہ ہوتا تو کفرو اسلام کی جنگ چھڑ جاتی۔ موضوع کچھ ہو مسئلہ کوئی ہو احمد سعید اسلام کو اس طرح خطرہ میں ڈالتے کہ یونین پانی پت کا میدان بن جاتی۔ سلطان نیازی الفاظ کے تانے بانے سے بمشکل خود کو اور اپنی جماعت کو بچا کر نکال لاتے اور آنے والے انقلاب کی بشارت بنا دیتے۔

ایک خاکساری تجربہ اور اسٹوڈنٹس یونین:

فرسٹ ایر کے آغاز میں ایک اور اجتماعی تجربہ ہوا۔ ہمارے کیمسٹری کے استاد شمیم

صاحب نے بہت سے ہونہار نوجوانوں کو جمع کیا اور قوم کی حالت کا واسطہ دے کر سب سے خدمت قومی کا عہد لیا۔ شمیم صاحب بسطةً فِی العِلمِ و الجسم (علم اور جسم دونوں سے چوکس) تھے۔ داڑھی بھی سرسید والی تھی۔ ان کے بارے میں افواہ تھی وہ کبھی خاکسار تحریک سے وابستہ رہے تھے۔ ان کی گفتگو دردمندانہ تھی اور خیالات بھی مثبت تھے۔ ہم ان کے ساتھ بھی چند قدم چلے۔ پھر یکا یک ایک دن معلوم ہوا وہ بھی پاکستان سدھار گئے۔ اِنّاللّٰہِ پڑھی اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ کی کوشش شروع کی۔ اِس طرح کی اِنّاللّٰہِ پڑھنے کے ہم عادی ہو گئے تھے اور ہمارے امریکہ باسی بننے پر بھی سنا ہے صرف اِنّاللّٰہِ نہیں پڑھ گئی پورا یٰسین کا ختم ہوا۔

ستمبر میں یونین کا پہلا جلسہ نئے طلبا کا استقبالیہ ہوا۔ اُس وقت شبیہ الحسن نونہروی نائب صدر تھے۔ احمد سعید سکریٹری اور افتخار زبیری صاحب لائبریرین۔ اس زمانے میں یونین میں طالب علم نائب صدر ہوتا تھا اور وائس چانسلر صدر۔ ذاکر صاحب نے تحریک کی کہ یونین کو پوری داخلی آزادی ملنی چاہیے اس لیے یونین نیا دستور بنا رہی تھی۔ جس میں طالب علم صدر ہوگا اور وائس چانسلر مربی۔ نئے دستور کا ہر طرف چرچا تھا اور وہی اس سال کے کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ اختلافات کا مرکزی موضوع تھا۔ اگر چہ موضوع کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ چہروں اور نعروں سے لوگ مانوس تھے۔

یونین ہال کے جلسوں کا اعلان ایک نوٹس کے ذریعہ ہوتا تھا جو جلسہ سے چند روز قبل شب میں کمروں کے دروازوں کی درازوں سے یونین کے چپراسیوں کی مدد سے ڈلوا دیا جاتا تھا۔ جس دن جلسہ ہوتا اُس دن یونین کی گھنٹی سے اس کا اعلان ہوتا۔ اور طلبا جوق در جوق یونین پہنچتے۔ یونین میں ہر مہینہ دو ایک ڈبیٹ ہوتے تھے۔ ماہانہ ایک ڈبیٹ کا انعامی مقابلہ ہوتا۔ باہر سے آنے والے خصوصی مہمانوں کا استقبال ہوتا اور کسی نہ کسی یونیورسٹی کے یا قومی مسئلہ پر ہنگامی جلسہ ہوتا۔ یونین میں آفس سکریٹری شان حیدر سادات امروہہ میں سے تھے۔ دراصل وہی یونین تھے باقی شکلیں یونین کے افسران کی سرائے فانی میں آنی جانی

تھیں۔انھوں نے ہر کابینہ کے ساتھ خود کو بدلنے کا فن سیکھ لیا تھا وہ درحقیقت ہرنئی کابینہ کے مربی تھے لیکن اپنی پوزیشن کی وجہ سے خورد بنے رہتے تھے۔

عام ڈبیٹس میں بھی ہال بھر جاتا تھا۔انعامی مقابلے میں اٹا کٹ بھرتا اور کسی شخصیت کی آمد یا ہنگامی جلسوں میں اوپر نیچے اور گیلریوں میں کہیں جگہ نہ ہوتی۔یونین میں تقریر کرنا آسان کام نہ تھا۔مخالف تو مخالف وہاں دوست بھی اجنبی بن کے ہوٹنگ کرتے اور اگر کسی مسئلہ پر حق و باطل کا معرکہ ہوتا تو ہوٹنگ کی تیاری کر کے دستے کے دستے تیاری کر کے آتے۔

کمیونسٹوں کی احمد سعید کے خلاف پلاننگ ہمارے کمرے پر ہی اکثر ہوتی اور مختلف ہوٹنگ کے طریقے بحث وتمہید کے بعد طے ہوتے۔یہی حال اینٹی کمیونسٹ فرنٹ کا تھا۔لیکن جب احمد سعید یا سلطان نیازی کی گلفشانی گفتار شروع ہوتی تو پھر وہ بولتے اور قوم سنتی اور سر دھنتی۔احمد سعید اردو کے سحبان تھے ان کے مخالف ''انگریزی انگریزی'' کے نعرے لگاتے اور سلطان نیازی انگریزی کے چرچل تھے۔تقریر شروع کرتے تو ان کے مخالف'' اردو اردو'' کے نعرے لگاتے۔احمد سعید کی انگریزی بھی اچھی تھی اور سلطان نیازی کو اردو پر عبور تھا۔لیکن سلطان نیازی کی انگریزی سے اچھوں اچھوں کا مقابلہ نہیں ہوسکتا تھا۔یہی معاملہ احمد سعید کی اردو کا تھا وہ اپنا جواب خود تھے۔خیر یہاں ذکر نئے طلبا کے استقبالیہ کا تھا۔

ہمارے کمرے کے دالان کی ایس ایف کی میٹنگ میں احمد سعید کو نہ سننے کے بہت سے فیصلے ہوئے اور طے ہوا کہ سب کامریڈ جلسے کے بہت پہلے سے جا کر آگے کی سیٹوں پر قبضہ کر لیں گے۔ہوٹنگ کے طریقے طے ہوئے۔تقریر کو برہم کرنے کے لیے دستوری پوائنٹ آف آرڈر کا ریہرسل ہوا۔میں جونیر کی حیثیت سے چائے بنانے میں لگا تھا اور ایس ایف سے غیر متعلق تھا اس لیے تفصیلات کا مجھے علم نہ تھا لیکن مجھ سے جب ایک کامریڈ حبیب زبیری نے کہا'' کامریڈ شام کے پانچ بجے یہاں سے نکلنا ہے'' تو مجھے

خطرے کی پہلی گھنٹی بجتی دکھائی دی اس لیے میں نے فوراً کہا کہ "میں کامریڈ نہیں ہوں۔" میرے اس جواب سے وہ برہم ہو گئے اور حیرت سے اشتیاق محمد کی طرف دیکھا کہ کیسے شخص کو تم نے پارٹنر بنایا ہے۔ اشتیاق محمد نے ہنس کر کہا "یہ دیوبندی ملاّ ہیں یہ اگر ایس ایف میں شامل ہو گئے تو ہم سب کو نماز پڑھوا دیں گے۔"

میں نے ان کی تائید میں کہا: "اگر ایس ایف والے نماز کے پابند ہو جائیں تو میں اس میں شامل ہو جاؤں گا۔" میرے ان کامریڈ سے اس کے بعد تعلقات کچھ کشیدہ رہے اور وہ اس کے بعد امریکہ آ کر شاد آباد ہیں۔ کمیونزم سے سنا ہے وہ تائب ہو گئے۔ لیکن روایت ہے کہ خدا ان سے خود کو نہیں منوا سکا۔ مگر وہ اسلامی تہذیب اور علیگیرین اخلاق کا مرقع ہیں اور علیگ برادری کے مربی ہیں اور مجھ سے غیر معمولی تعلق رکھتے ہیں۔ میں توحید ماموں کے ساتھ یونین پہنچا تو ہال بھر چکا تھا۔ اگلی سیٹوں پر حق کے پرستاروں نے دوپہر ہی سے قبضہ کر لیا تھا۔ کمیونسٹوں کو پتہ چل گیا مسلمانوں سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ مغربی دنیا کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں ہے!

قوم پرستوں کا حلقہ:

علی گڑھ میں ایک حلقہ قوم پرست مسلمانوں کا تھا لیکن یہ لوگ اپنے ہی خلوت خانہ میں جلوہ افروز رہتے۔ اس گروہ کے پیر مغان سعید اختر (ابن مولوی مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور) تھے اس میں دوسرے شرکاء ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، شفیق انجم، عثمان ادھمی، عبد الغفار اور اظہر عرف استاد چھوارا تھے۔ سعید اختر قوم پرستی سے زیادہ ابوالکلام پرستی میں مبتلا تھے۔ مولانا کا "تذکرہ" اور "غبار خاطر" ہر وقت مطالعہ میں رکھتے۔ مولانا کی مشکل لغات کو مشکل تر کر کے بولنے کی کوشش کرتے اور بعض اوقات بے محل بھی بولتے۔ میز پر آئینہ ہمیشہ زیر نظر رہتا جس میں اپنے چہرے میں مولانا آزاد کا عکس دیکھ دیکھ کر اپنے پر خوش ہوتے۔ گالوں پر مفکرانہ انداز سے ہاتھ رکھ کر سنجیدہ پوز بنا کر اس قدر مولانائیت طاری کرتے کہ

یاسمین سپید کی پیالی دوسرے ہاتھ میں اٹھا کر مدبرانہ انداز سے تذکرہ کی مشکل اور ادق عبارتیں بآواز بلند پڑھنے لگتے۔لیکن ان کا بنیادی مزاج کھلنڈرانہ، پُرمزاح اور ہلڑ بازی کا تھا۔

ریاض الرحمٰن خان شیروانی اپنے دادا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی علمی روایات کے امین تھے جو بقول خود دادا سے پوتے کو منتقل ہوئی تھیں۔ان کے والد عبیدالرحمٰن خاں شیروانی صاحب علم وحلم تھے۔یونیورسٹی کی خدمات بلا معاوضہ نوابانہ شان سے ادا کرتے کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ریاض صاحب اپنے دادا اور والد کے مسلم لیگی رجحانات کے برخلاف قوم پرست تھے اور خود بھی مولانا آزاد سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔حبیب منزل کی شاہی کوٹھی کے ایک کمرے میں ان کا ٹھکانا تھا۔گھر کے نظام الاوقات کے مطابق ان کی چائے اور کھانا جچا تلا آتا۔ہم لوگوں کو کھانے کے اوقات اور گھر کے اصولوں کا احترام تھا اس لیے ہم وہاں وقت سے پہلے پہنچ کر اپنی آمد کی خوشخبری کا اعلان کر دیتے تھے اور ہاتھ دھو کر کھانے میں شریک ہو جاتے۔

لیکن ۵۵ء میں جب ہم نے ذاکر صاحب کے حکم سے سائنس سے آرٹ سائڈ میں تبادلہ کیا تو وہ اسلامک اسٹڈیز میں ہمارے استاد ہو گئے اور ہمارے دوستانہ تعلقات درہم برہم ہو گئے۔مگر ان سے کبھی استاد شاگرد کا رشتہ بھی قایم نہ ہو سکا۔البتہ حطی کی ہسٹری آف عربس کے نوٹ جو وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع کرتے اور گھنٹہ ختم ہونے تک جاری رہتے ہم نے محفوظ رکھے ہیں۔ان کا پورا گھنٹہ انگریزی ڈکٹیشن کا پیریڈ ہو گیا تھا۔اور وقت میں کبھی اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ ان نوٹس کی تشریح کر سکتے۔

شفیق انجم پولیٹیکل سائنس کے طالب علم تھے۔حبیب صاحب کے اپنی ذہانت کی وجہ سے چہیتے تھے اور بہت اچھے رومانوی شاعر تھے اس دور میں ایم۔اے کے درجات میں ،بجز سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے،لڑکیاں چیدہ چیدہ ہی ہوتی تھیں اور ان میں بھی ڈھنگ کی اکا دکا ہوتی تھیں۔طالب علم انھیں سے بے زباں قسم کا عشق کرتے اور ایم اے کے بعد با

حسرت و یاس واپس جا کر اپنے خاندان پر احسان کرتے۔ان قوم پرست نوجوانوں کا مشترکہ عشق جس خاتون سے تھا ان پر شفیق انجم نے کئی نظمیں لکھ ڈالی تھیں۔ پروفیسر حبیب صاحب کی انھیں پوری حمایت حاصل تھی۔ پروفیسر حبیب کے دو بیٹے کمال اور عرفان تھے اور بیٹی کوئی نہ تھی۔وہ ہر سال ایک یا دو لڑکیوں کو بٹیا بنا کر ان کی قسمت کا عادلانہ فیصلہ شعبۂ پولیٹکل سائنس میں ہی کرانا چاہتے تھے۔شفیق انجم میں حبیب صاحب کے داماد بننے کی سب صلاحیتیں تھیں لیکن ان کو ''چودھویں کے چاند'' والا واقعہ پیش آ گیا اور سعید اختر نے عشق مجازی سے بڑھ کر نکاح حقیقی کا ارادہ کر لیا۔شفیق انجم یہ نظم لکھ کر راستہ سے نکل گئے۔

یہ سوچتا ہوں کہ ترک طلب پہ رومانہ
نہ جانے کیا مرے بارے میں سوچتی ہوگی

سعید اختر نے بہت ہاتھ پاؤں مار کر اور وزیروں، امیروں کی سفارش حاصل کر کے بالآخر ۵۴ء یا ۵۵ء میں اس شوخ کو شادی کی راہ بھوپال سے بجنور تک کی ہموار کر لی۔ سعید اختر اور ان کی بیگم اپنی دو یادگاریں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔اب ان کے ساتھیوں میں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔شفیق انجم نے عشق سے بلند ہو کر شہناز ہاشمی سے نکاح کر لیا۔مگر ع تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا، والا معاملہ رہا۔یوں تو وہ دونوں میرے آئیڈیل تھے لیکن ایک دوسرے کے آئیڈیل نہ بن سکے۔

جہاں تک اس گروپ کی آئیڈیولوجی کا تعلق ہے اس کا کوئی اثر یونیورسٹی کی اجتماعی زندگی پر نہیں پڑا۔ اگر چہ اس گروہ کے پاس علم، دولت، اثرات اور ذہانت کے خزانے تھے لیکن کسی کے پاس قائدانہ صلاحیت نہ تھی کہ جس فکر کی اس دور کے علی گڑھ کو ضرورت تھی اسے دوسروں تک پہنچا سکتے اور اس سے کوئی تحریک پیدا کر سکتے۔اس لیے ان کی مجلس فکر ''لپٹن کی جا کو جا عمدہ چورہ چائے'' سے شروع ہو کر ''یاسمین سپید'' کے لطیف گھونٹوں تک محدود رہی۔

قوم پرست تحریک کے سچے، پکے، مختصر، منحنی، مؤثر اور بے ضرر رہنما پروفیسر ہاشم قدوائی صاحب تھے جو سرتاپا کھدر دھاری تھے اور گاندھی جی کا لکھنؤ ایڈیشن کہلاتے تھے۔ ان کے ہراول دستے کے سردار، بھٹاچاریہ تھے جن کی داڑھی جماعت تبلیغ کی اور مونچھیں خاندانِ چھتاری کی یاد دلاتی تھیں۔ وہ تنِ تنہا یوتھ کانگریس تھے۔ ہوسکتا ہے ان کے ساتھ چند اور بھی احباب ہوں۔ بعد میں مظفرنگر کے ظہیر صاحب نے بھی یوتھ کانگریس میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا۔

قدوائی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی سرتاپا کانگریس شخصیت سے ہمیں خاص انس پیدا ہوگیا۔ ایک تو وہ ہمارے اباجان کی طرح کانگریسی تھے دوسرے کھدر پوش تھے اور تیسرے وہ بھی ہماری طرح چند ہڈیوں اور اس سے بھی کم بوٹیوں کا مجموعہ تھے۔ ہم اس معاملہ میں ان کے ہم جنس تھے۔ ہمارا وزن ان دنوں سو پونڈ تھا اور قد ۵ فٹ۔ اس لیے ہم گاندھی جی اور گاندھی نما لوگوں سے یہ سوچ کر متاثر ہوتے تھے کہ انھیں دیکھ کر ہمیں اپنے اچھے مستقبل کے امکانات کچھ روشن نظر آتے۔ ورنہ ہم اس ہیئت کذائی کے ساتھ اپنی شادی تک سے مایوس تھے اور اگر بالفرض شادی ہو جائے تو اولاد کی توقع نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کے ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب (ہمارے طبیب حاذق) اگر اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں ہمارے اوہام کو یقین نہ عطا کرتے تو ہم شاید کنوارے ہی رہ جاتے۔

قدوائی صاحب کو ہم میں بھی یوتھ کانگریس کے مستقبل کے امکانات نظر آئے ہوں گے۔ لیکن یہ بات آگے نہ بڑھی، پھر جیسے جیسے ہمارے ایس ایف کے ساتھ تعلقات بڑھے ویسے ویسے قدوائی صاحب اور ان کی یوتھ کانگریس سے بُعد پیدا ہوتا گیا۔ جب ہم ۵۴ء میں سائنس چھوڑ کر پولیٹیکل سائنس میں آئے تو چار سال تسلسل کے ساتھ ہم قدوائی صاحب کے شاگرد رہے۔ ہماری طرف سے اپنی ساری مایوسیوں کے باوجود وہ ہمیں کتابیں دینے سے بخل نہ کرتے اور امین ہوسٹل ان کے ٹھیے پر پہنچ جاتے تو وہ ہمیں امپورٹنٹ بھی پڑھا

دیتے تھے۔قدوائی صاحب کو کتابوں کے جمع کرنے کا خاندانی شوق تھا اور ہمیں کتابیں مانگ کر پڑھنے کا عارضہ۔ وہ بھی امتحان سے ذرا پہلے۔ ہمارا زیادہ وقت علی گڑھ کی عملی تربیت گاہ میں صرف ہوتا۔علم تو قدوائی صاحب کا خاندانی ورثہ تھا اور جسے وہ ایسے بے دریغ خرچ کرتے جیسے مالِ مفت ہو۔ وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے سگے داماد اور ان کے سگے بھتیجے تھے۔قیمتی کتابوں کی لائبریری رکھتے تھے اور ہم ایسے نااہل طالب علموں کو فراخ دلی سے عطا کر دیتے تھے۔ ہمارا مطالعہ امتحان سے پندرہ دن پہلے شروع ہوتا اور امتحان کے بعد ختم ہو جاتا۔جلدی میں اہم اور ضروری موضوعات کے نوٹس بنانے کا وقت نہ ملتا۔ہم کتاب کو پنسل سے کاپی کی جگہ استعمال کرتے اور جلدی میں کتابیں اسی طرح قدوائی صاحب کو واپس کر دیتے۔ ہمارے ان انکشافات سے آئندہ نسلوں کی رہنمائی اگر ہوئی ہو تو ہو سکتا ہے قدوائی صاحب کے ساتھ ہمارا یہ کار خیر بھی ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے۔

علی گڑھ کے چند ساتھی:

میرے علی گڑھ کے سال اول کے دوستوں میں قابل ذکر سید محمد شفیع، سیّد علی امام، سیّد عبادت حسین، سید خالد اور سید ظفر احمد تھے۔سادات کی یہ فراوانی ہندوستان کا حصہ ہے اور اس میں ہر انقلاب کے بعد اضافہ ہو جاتا ہے۔لیکن ایک ہم ہیں اچھے بھلے صدیوں سے سید چل رہے تھے ہمارے پردادا عبداللہ انصاری (اول ناظم دینیات) نے تحقیق دقیق کر کے ہمیں انصاری بنا دیا۔ ہمارے اکثر خاندان والوں نے یہ قبول نہ کیا اور سید کے سید رہے۔ہم ان کی اولاد میں تھے اتنی بڑی تحقیق کو کیسے رد کرتے، انصاری بن گئے اور کوشش کرتے ہیں کہ انصار کے اخلاقِ حسنہ کا ہم نمونہ بن سکیں۔

سید محمد شفیع اور سید علی امام کا تعلق موضع سانہہ مونگیر (بہار) سے تھا۔ یہ لوگ موریسن کورٹ میں اور بھی بہت سے بہاری طلبا کے ساتھ رہتے تھے۔ان کی کمپنی میں میں تنہا یو پی سے تھا۔اُس دور میں بھی اِس دور کی طرح بہاریوں کو بیوقوف کہا جاتا تھا لیکن مجھے

کبھی کسی بے وقوف بہاری سے واسطہ نہیں پڑا۔ یا یوں کہیے میں خود اتنا بے وقوف ہوں اس لیے ان سے مل کر اپنے میں اور ان میں فرق محسوس نہیں کیا۔ دراصل بہار کے لوگوں کا لب و لہجہ، خلوص، سادگی اور بھولا پن انھیں یوپی کے چاق و چوبند ماحول میں اجنبی بنا دیتا ہے۔ حالانکہ بدھا اور اشوکِ اعظم سے لالو پرشاد اور رابڑی بیگم تک بہار مذہب، سیاست، علوم و آگہی، شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ہمارے درباری ظاہر دار بیگ قسم کے مصاحبین کے مقابلے میں وہاں کے سادہ لوح عوام تک ہشیار ہیں۔

بہاریوں کی ایک بڑی خوبی ان کی فیاضی ہے وہ جب بہار سے آتے تو بزبان فیضؔ:

وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

بہاری خود آتے، ساتھ میں کنستروں، ڈبوں، بکسوں اور صندوقوں میں بھر کر اُبلے انڈے، گھی، حلوے، لڈو اور الّم غلّم ہر چیز لاتے پھر سب سامانوں کے دہانے کھول دیے جاتے اور کھانے والے کھاتے، لے جانے والے لے جاتے۔ اس صورتِ حال میں ہمارے لیے خوبی یہ تھی کہ ہم بے گھر بے در لوگوں کو وہ مال مسالے میسر آ جاتے جس کے ساتھ بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں اور ذائقے کام و دہن میں محفوظ تھے۔ مگر ہماری اصل مشکل ہمارا اپنا معدہ تھی جس میں ایک انڈے، ایک لڈو، ایک بیسنی روٹی کے بعد ہی درد شروع ہو جاتا اور دفع شر کے لیے دوڑنا پڑتا۔ دوستوں کے اصرار پر کہ یہ سعادت کام و دہن صرف زورِ بازو سے ہے اور بہت عارضی ہے اور بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے ہم از سر نو شروع ہو جاتے اور ہضمولہ کی مدد سے مال غنیمت کو ہضم کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ تماشا چند دن میں ختم ہو جاتا لیکن ہم چند ہفتے ڈاکٹر معشوق علی صاحب اور ڈاکٹر نفیس اور ڈاکٹر جلیل کی نوازشوں کا شکار رہتے۔

محمد شفیع سے دوستی کا سبب ہر چند کہ ان کا اخلاص تھا لیکن اس میں ہماری غرض بھی شامل تھی۔ بچپن سے ہم نے فاتحہ خوانی، قوالی، مشاعرے، وعظ، سیاسی ہنگامے اور قال اللہ

اور قال الرسول کے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس کا نام بھی انسان کو گنہگار بنا تا تھا۔فزکس کیمسٹری اور انفرادی مضمون سے تو کوئی واقف نہ تھا لیکن سائنس کے بارے میں ہمارے بعض اکابر کا عمومی خیال تھا کہ یہ انسان کو بے دین بناتی ہے۔لیکن اگر انسان ابتدا میں مبتلا ہو بھی جائے تو پھر سائنس کو انجینیر نگ پر ترجیح تھی اور انجینیر نگ کو ولایت کی تعلیم پر اور ولایت کی تعلیم کو امریکہ جانے پر ہم سے پہلا گناہ کیا سرزد ہوا کہ آخر ہم کیفر کردار کو پہنچ کر امریکہ میں بس گئے۔

ہماری بچپن کی تربیت اور شاعرانہ کیفیت سائنس کو سمجھنے سے انکار کر رہی تھی اور سائنس بھی ایسی جو انجینیر نگ کے لیے تھی اور ولایت کا دروازہ کھول رہی تھی۔کلاس میں ہماری سمجھ میں کم آتا۔موریسن کورٹ میں سید محمد شفیع اور سید علی امام پتہ مار کر سمجھاتے اور ہم وقتی طور پر سمجھ سے کام لے کر امتحان پاس کر لیتے۔اور دل سے وعدہ کرتے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں یہ کسر پوری کرنی ہے۔مگر چھٹیاں آتی رہیں گزرتی رہیں اور ہم طفل مکتب کے طفلِ مکتب ہی رہے۔

لیاقت علی خان کی شہادت اور یونین کی تعزیت:

۱۵راگست لیاقت علی خاں کی شہادت کی خبر ملی۔ وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ان کی فریم کی ہوئی تصویر اسٹوڈنٹس یونین میں آویزاں تھی۔ یوں بھی علی گڑھ میں پاکستان سے ہمدردی رکھنے والا طبقہ اس وقت خاصا موجود تھا۔ بہت سے طلباء نے چھٹی کا سائرن بجانے کا اور یونین میں تعزیتی جلسے کا مطالبہ کر دیا۔علی گڑھ میں روایات تھی کہ شب کو ۸ر بجے سائرن بجتا تھا اور اگر کوئی موت ہو یا خاص واقعہ ہو تو فوراً سائرن بجا کر اس کا اعلان ہو جاتا تھا۔لیکن لیاقت علی خاں کی شہادت سے چند ہفتے قبل یونیورسٹی ایکزیکیٹو نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی موت پر سائرن نہیں بجوایا جائے گا۔اس فیصلہ کے فوراً بعد اتفاق سے لیاقت علی خاں کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ احمد سعید صاحب کی قیادت میں طلباء نے

سائرن بجانے کا پرزور مطالبہ کیا۔ اُدھر یونین کی طرف سے تعزیتی جلسے کا اعلان ہوگیا اوراگلے دن اس سوگ میں علی گڑھ کی سوگواری کی روایت کے مطابق ایک دن کی چھٹی کے مطالبے نے بھی زور پکڑا۔ اس وقت کے سیاسی حالات میں طلباء کا جوش اوراحمد سعید کی قیادت یونیورسٹی کے لئے نئے مسائل پیدا کرسکتی تھی۔ وقت کی نزاکت کے پیش نظر ذاکر صاحب پھونک پھونک کرقدم رکھ رہے تھے۔

شام کو یونین کی گھنٹی تعزیتی میٹنگ کے لئے بجی تو جوق در جوق طلباء یونین کی طرف روانہ ہوگئے۔ اُس روز جونیر ہونے کے سبب ہمیں نہ اُس گھنٹی کی خبر ہوئی اور نہ اس میٹنگ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس معاملے کی کامریڈ پلاننگ بھی ہمارے کمرے پر نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیا کہ پوری یونیورسٹی میں آزردگی اور سراسیمگی کی فضا تھی۔ مسٹر جناح کے بعدلیاقت علی خاں کی شہادت دونوں ملکوں اور مسلمانوں کے لئے سانحہ تھی۔ پورے ماحول میں غیر یقینی کا ماحول تھا۔ لیاقت علی خاں پاکستان کے کچھ بھی ہوں وہ علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند تھے۔

میٹنگ کے بعد جب لوگ لوٹے تو معلوم ہوا کہ وہاں کتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ احمد سعید صاحب نے اپنی تقریر میں سائرن بجانے اور اگلے روز چھٹی کو اسلام، مسلمان ، اردو یونیورسٹی اورعلی گڑھ کی عظیم روایات سے اس طرح ملایا کہ وہاں کسی اور کے لئے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب بمشکل یونیورسٹی کے فیصلہ کی اہمیت اور اُسے بدلنے کے عواقب کو سمجھا سکے۔ لیکن وہاں سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ پھر بھی ذاکر صاحب نے جمہوری اقدار کا حوالہ دے کرفرمایا کہ ہمیں اس مسئلہ پر سب کی بات سن کر جمہوری فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس لئے انھوں نے صاحب صدر شبیہ الحسن نونہروی سے فرمایا اس مسئلہ پر جن لوگوں کواظہار خیال کرنا ہے ان کو دعوتِ اظہار خیال دیں۔ نونہروی صاحب نے اس بات کا اعلان کیا وہاں ہر تقریر سائرن بجانے کی تائید میں تھی۔ اس دن کامریڈوں کو بھی

مخالفت کی جرأت نہ تھی لیکن ایک جیالہ جامعی نوجوان رضی الدین نے ہمت کر کے، یا حماقت کر کے، اپنا دایاں ہاتھ اٹھا دیا اور انھیں نونہروی صاحب نے دعوت دی کہ وہ اظہار خیال فرمائیں۔ وہ تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر آئے لیکن انھوں نے سائرن نہ بجانے کی تائید کی۔ جیسے ہی طلباء کو ان کے خیالات کا علم ہوا ایک ہنگامہ ہو گیا اور اسٹیج پر جو لوگ نزدیک تھے انھوں نے ان پر بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر دھاوا بول دیا اور وہ اسٹیج سے اس عالم میں اترے ع ''سر بدست دگرے دست بدست دگرے'' ذاکر صاحب کی پٹھانیت کو جوش آ گیا اور انھوں نے فرمایا۔ ''اگر اسی طرح آپ جمہوریت کو برتیں گے تو نہ اس ملک میں مسلمانوں کا کوئی مقام ہوگا نہ اُس ملک میں کوئی پوچھے گا جہاں آپ لوگ پہنچیں گے۔ قدرت نے آپ کو جو مواقع دیئے ہیں اگر آپ ان کا جائز استعمال نہیں کریں گے اور اپنے جذبات پر غالب نہ آسکیں گے تو مواقع ضائع ہو جائیں گے اور حالات آپ پر غالب آ جائیں گے۔''

اور پھر انھوں نے صاحب صدر صاحب سے فرمایا'' آپ اعلان کر دیجئے اگر غم منانے کا واحد طریقہ سائرن بجانا ہے تو جائیں اور سائرن بجائیں اور اگر قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کرنا اور مرحوم کی خدمات کو مشعل راہ بنانا ہے تو اس میں وقت لگائیں۔''

طلباء نے صاحب صدر کے اعلان کا انتظار نہ کیا۔ انہوں نے اول الذکر کو آخر الذکر، عاجلہ کو آخرہ پر ترجیح دی۔ اور وہاں سے سرسید ہال پہنچ کر خود ہی سائرن آن کر دیا۔ اس کی آواز رات بھر وقفہ وقفہ سے علی گڑھ کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔ اس کی آواز سے طلباء میں رت جگے کا سامان رہا اور زندہ تو زندہ مثنوای کی خوابیدہ روح کی نیند بھی چونک اٹھی۔ یونین سے جب طلباء لوٹے تو اس دن کے بعد ہفتوں ذکر رہا کہ کس نے کیا رول اس اہم تاریخی فیصلہ میں ادا کیا۔

رضی الدین اور قیصر رشید دو شخص دو ذہن:

رضی الدین صاحب نظیر اکبر آبادی پر شعبۂ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کے گریجویٹ تھے۔ پہلے نیشنلسٹ تھے پھر ترقی کر کے کامریڈ ہو گئے تھے۔

لمبی اور مسلسل گفتگو کے عادی تھے۔تقریر سے زیادہ تحریر میں رواں تھے۔وہ دو جملوں کی بات کو کئی سو صفحات میں لکھ دینے پر قادر تھے اور اپنی اس قدرت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ جامعہ کی قوم پرست چھوٹی سی درسگاہ سے علی گڑھ آئے جو پاکستان بنانے والی قوم کا آخری گڑھ تھا اور ذاکر صاحب کی محبت میں وہ بے خطر جذبات کی آگ میں جذبات میں کود پڑے۔ان کی اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم تھا کہ اتنے زدوکوب کو انھوں نے ہلکی پھلکی تنبیہ سمجھا اور گاندھی جی کی اہنسا کے اس سنچالک نے قوم کو معاف کردیا۔مجھ سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ لوگ ان کی طول بیانی نثر سے گھبراتے تھے میں انکار کی جرأت نہ رکھتا تھا اور ان کے لئے بزِ اخفش کا کام کرتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد وہ ایک دن تشریف لائے۔اُس دن قیصر بھائی (ابن حکیم ننومیاں گنگوہی نبیرہ مولانا رشید احمد گنگوہی) بھی میرے پاس تشریف فرما تھے۔ وہ اس ہنگامے میں رضی الدین صاحب کو ٹھیک سے نہ پہچان سکے تھے۔اب جو موقعہ ملا تو دونوں میں گھمسان کا رن پڑا۔رضی الدین صاحب کا اصرار تھا کہ انھوں نے مدلل تقریر کی اور چند ناسمجھ لوگوں نے دست درازی کی ناکام کوشش کی۔قیصر صاحب طیش میں آگئے:

''آپ کی بات نہ اُس وقت سمجھ میں آئی تھی اور نہ اس وقت آرہی ہے البتہ جسے آپ ناسمجھ لوگوں کی دست درازی سمجھ رہے ہیں اس میں سوچ سمجھ کر میں بھی شریک تھا اور میں نے گن کر پانچ مکے رسید کئے تھے۔''رضی الدین صاحب نے فرمایا:''وہ کیسے مکے تھے کہ میں صحیح سالم یہاں موجود ہوں۔''

قیصر بھائی نے پورے اعتماد کے ساتھ رضی صاحب کو دعوت مبارزت دے دی:

''یہاں ہم دونوں غازی میاں کے مہمان ہیں آیئے باہر چلیں جو باقی حساب ہے وہ بے باق کردیں۔اگر آپ اپنے قدموں سے چل کر یہاں واپس آجائیں تو میرا نام قیصر نہیں۔رضی الدین صاحب نے گاندھی جی کے اسٹائل ہندوستان نمرتا اور جامعی لہجہ میں

ادب سے کہا" ہمارے مسائل کا حل مکہ بازی نہیں غور وفکر سے مسائل کا تجزیہ اوران کے حل کی تلاش ہے۔" پھر مسلمانوں کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ ہندوستان اور پاکستانیوں کی ہر محفل میں اب تک جاری ہے۔اور مکہ بازی کا بھی۔ پاکستان میں یہ ترقی کر کے کلاشنکوف بازی بن گیا ہے۔

احمد سعید صدارت کے امیدوار تھےاوران کا حقیقی معنی میں کوئی حریف نہ تھا۔ان کی مقبولیت علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے تعلیمی مقاصد کو چیلنج کر رہی تھی۔

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین اور الیکشن:

احمد سعید نے علی گڑھ کی سیاست کے ایک اہم رکن سینیرس کو نظر انداز کر دیا۔سینیرس نے تلاش کر کے شاہ عنایت حسین آفتاب کو کھڑا کر دیا۔شاہ صاحب کا تعلق بہار کے ذی اثر صوفیاء کے خاندان سے تھا۔ان کا قد لانبا، رنگ گورا اور گفتگو سنجیدہ تھی۔وہ نہ یونین کے مقرر تھے نہ عوامی آدمی لیکن وہ دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔اُس وقت یونین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ نئے دستور کا تھا۔ذاکر صاحب نے نیا دستور مرتب کرا دیا جس میں اسٹوڈنٹس یونین کو مکمل داخلی خودمختاری تجویز کی گئی تھی۔ یہ دستور یونین کی جنرل باڈی سے پاس ہونا تھا۔اس مسئلہ پر کمیونسٹ اینٹی کمیونسٹ،حق اور باطل،اسلام اور کفر کی جو جنگ یونین میں برپا تھی وہ ہماری سمجھ سے باہر تھی۔اہل اسلام کا جھنڈا احمد سعید کے ہاتھ میں تھا۔کمیونسٹ علَم سلطان نیازی عبید صدیقی اور محمد امین بلبلیا کے ہاتھ میں تھا۔شاہ عنایت حسین درمیان میں تھے لیکن انھیں کمیونسٹ، ہندو، سکھ قوم پرست سینیرس کی حمایت حاصل تھی۔

یونین کی میٹنگ سے پہلے بعض اوقات ہمارے کمرے پر پلاننگ ہوتی کہ احمد سعید کو کیسے خاموش کیا جائے۔احمد سعید پارٹی کا کوئی فورم نہ تھا نہ نام۔مگر وہ اسلامی جوش اور جذبہ سے سرشار تھے۔وہ لوگ بھی منظم ہو کر آتے۔احمد سعید یونین کے دستور کے حافظ تھے۔

وہ کھڑے ہو کر دفعات اور شقیں حوالے کے طور پر دے کر بنے بنائے کام کو بگاڑ دیتے۔

ابھی تک ہمارے لئے یہ صرف تماشا گاہ تھی تجربہ گاہ نہ تھی۔جن مسائل پر قوم نبرد آزما تھی وہ مسائل ہر چند کہ فروعی تھے لیکن یونین پلیٹ فارم ایسی تجربہ گاہ تھا جس کے صحیح استعمال سے قوم پر ہندوستانی جمہوریت میں مؤثر شرکت کے دروازے کھل سکتے تھے۔لیکن افسوس ہے، یونین کے رہنماؤں نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں نہ کوئی مثبت کردار ادا کیا نہ جمہوریت کی آبیاری کی اور نہ کسی پائیدار کام کی بنیاد ڈالی۔البتہ ایک بہت اہم اور مثبت کام علی گڑھ کے کھلنڈروں نے کراچی میں کر ڈالا جہاں ظلِ نظامی اور ذاکر علی خاں کی قیادت میں انھوں نے ہنستے کھیلتے ایک عظیم ادارہ رشک علی گڑھ سرسید یونیورسٹی قائم کردی اور اس کے ساتھ متعدد ذیلی تعلیمی ادارے، شادی لان، علی گڑھ اولڈ بوائز کلب۔ علی گڑھ اولڈ بوائز جو سالانہ سرسید ڈے ڈنر کرتے ہیں کراچی جا کر سرسید یونیورسٹی دیکھیں اور وہاں کے اولڈ بوائز سے جوان رہنے، قہقہے لگانے اور کام کرنے کا سلیقہ سیکھیں۔ میں جب کراچی جاتا ہوں وہاں اپنے خالی کاسہ کو قہقہوں، شعروں، تعمیری خیالوں، عملی پلانوں سے بھر لاتا ہوں اور پھر انہیں دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہوں۔ جب دینے والوں کو دینے میں خست نہیں تو ہم کون ہیں کہ اُسے سینت سینت کر رکھیں؟

نئے دستور کو یونین کی جنرل باڈی سے منظور کرانا بھی ایک مرحلہ بن گیا اور اِدھر کچھ اور ناخوش گوار باتیں بھی پیش آئیں۔ذاکر صاحب علی گڑھ کو سنبھال کر آزاد ہندوستان میں جس مقام پر لے جانا چاہتے تھے احمد سعید کی جذباتی تقاریر اس کے راستے میں سدراہ بن رہی تھیں۔ دراصل احمد سعید اور یونیورسٹی کا بہت بڑا طبقہ تعلیم ختم کر کے پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ہندوستان میں یوں بھی ملازمتیں مفقود تھیں پھر مسلمان ہونا اور علی گڑھ سے ڈگری حاصل کرنا بھی ہندوستان میں منفی کوالیفکیشن تھی۔لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ مسلمان کا جیا تعلیم میں نہ لگتا تھا اور خود یونیورسٹی میں جہاں تعلیمی مقابلہ ہوتا مسلمان

ہندو سے جانتے بوجھتے مار کھا جاتا۔ انجینیر نگ اور سائنس کے مضامین میں مسلمانوں کا داخلہ حجت، ہٹ دھرمی، رعایت، حکومت کی مصلحت سے اس طرح ہو جاتا کہ مسلمان داخلے کے وقت اکثریت میں ہوتے، امتحان تک ہندو مسلم برابری ہوتی اور جوں جوں تعلیمی سال گزرتے مسلمان گھٹتے رہتے اور بہت سے پاکستان کا راستہ لیتے رہتے۔

الیکشن کے زور میں احمد سعید کی جناح کیپ اور ''اسلام خطرے میں ہے'' کی سیاست یونیورسٹی کے توازن پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب پر شاید مرکزی حکومت سے دباؤ پڑا ہو یا وہ خود احمد سعید کو سبق دینا چاہتے ہوں۔ ہر چند کہ وہ جامعہ کے زمانے سے ذاکر صاحب کے چہیتے شاگرد تھے۔ غرض ذاکر صاحب نے اسٹریچی ہال میں ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی اور پندرہ منٹ انگریزی میں بہت مؤثر تقریر کی۔ ذاکر صاحب کے بعض جملے میری اپنی کمزور انگریزی کے باوجود سمجھ میں آئے جس میں انھوں نے کہا تھا'' کہ تم میرے لئے اولاد ہو لیکن جب اولاد غلطی کرتی ہے تو والدین کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ تربیت کرے، تنبیہ کرے اور اگر اس کا اثر نہ ہو تو سزا دے۔ میں سزا کا قائل نہیں۔ لیکن جب میں سزا دیتا ہوں تو وہ بہت سخت ہوتی ہے۔ اور میں فیصلہ کر کے اسے واپس نہیں لیتا۔''

طلباء پر سکوت طاری تھا اس سکوت کو احمد سعید کے پوائنٹ آف آرڈر نے توڑا۔ ذاکر صاحب نے میٹنگ برخواست کر دی۔ طلباء میں اب ہر سو چرچا تھا کہ دیکھو کس کو کیا سزا ملتی ہے۔ لیکن کسی کو کوئی سزا نہ ملی لیکن اس تقریر نے احمد سعید کا طلسم توڑ دیا۔ الیکشن ہوا اور جم کر ہوا۔ دونوں کیمپ سرسید ہال میں تھے۔ دونوں امیدوار متمول تھے۔ چائے کے دیگ ہر وقت گرم رہتی۔ برفی نمک پارہ شمشاد بلڈنگ سے اُٹھ کر ان کیمپوں میں آ گیا تھا۔ دونوں امیدوار چانس لینے کو تیار نہ تھے۔ اس زمانے میں مقروض طلباء کو ووٹ کا حق نہ تھا۔ جو طالب ان کے سامنے اپنی مجبوری رکھتا اس کا قرض ادا ہو جاتا۔

قوم پرست گروپ، کامریڈس، بہاری، سینیرس اور ہندو، شاہ صاحب کے ساتھ

شامل ہو گئے۔ذاکر صاحب کی تقریر نے بھی احمد سعید کا زور توڑا۔یہ ہمارا پہلا الیکشن تھا اور ہم نے بڑھ چڑھ کر شاہ صاحب کا ساتھ دیا۔الیکشن کی روایت تھی کہ سینئرس سب سے پہلے کنڈیڈیٹ کو شیروانی پہنا کر، جناح کیپ تاجِ شاہی کی طرح سر پر آراستہ کر کے اپنے کنڈیڈیٹ کو پوری یونیورسٹی میں گھماتے تھے۔پھر جلسہ نامزدگی کا ہوتا تھا جس میں امیدواروں کے نام پکارے جاتے تھے۔ہر امیدوار اپنے خیالات طلباء کے سامنے پیش کرتا۔اور امیدواروں کے ہمدردوں کے لئے اپنے امیدوار کی سپورٹ کا بہترین موقع تھا۔

اسی شام امیدوار کی کوالیفیکیشنز اور سیاسی معاشرتی منشور شائع ہو کر کمرہ کمرہ تقسیم ہوتا۔یہ چیزیں دوسرے کیمپ سے صیغۂ راز میں رکھی جاتی تھیں تاکہ وہ کہیں بھنک پا کر اس کی اینٹی (anti) نہ شائع کر دیں۔دوسرا دن اینٹی کی اشاعت کا تھا۔ادیب ،شاعر لکھنے والے مخالف امیدوار کا بخیہ ادھیڑتے ،شاعر مزاحیہ نظمیں لکھتے۔رات کی تاریکی میں جب طلباء سو جاتے یہ چیزیں تقسیم ہوتیں۔ساتھ ہی یہ کوشش بھی ہوتی کہ جو مخالفین کا لٹریچر ہے وہ لوگوں کے ہاتھ تک نہ پہنچے۔اس لئے مخالف ٹیم کا کام ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے لٹریچر پر ہاتھ صاف کریں۔ان آخری دنوں میں نعرے لگانے کی اجازت تھی۔

پولنگ کے دن والنٹیرس ووٹروں کو کمروں سے نکال کر لاتے۔امیدوار خود اپنے نعرے لگواتا ہوا ورکرس کے جلو میں پولنگ بوتھ جاتا۔علی گڑھ کی روایت تھی کہ امیدوار اپنے مخالف کو ووٹ دیتا۔شام میں سیل ہو کر ووٹنگ کے ڈبے یونین ہال میں پہنچ جاتے جہاں کنڈیڈیٹ کے نمائندوں کے سامنے بکس کھولے جاتے اور ووٹ کاؤنٹنگ ہوتی۔

الیکشن صدر ،آنریری سکریٹری، لائبریرین اور آٹھ کیبنٹ ممبرس کا ہوتا تھا۔ کیبنٹ میں ہمیشہ دو اک لڑکیاں منتخب ہو کر آجاتیں۔عام طور پر یہ لڑکیاں ہندو یا عیسائی بھی ہوتیں۔منتخب ہونے کے لیے لڑکی ہونا کافی تھا۔

یونین الیکشن میں شیعہ سنی، ہندو مسلم، بہاری یو پی کا اِشو نہ تھا۔اصل معیار امیدوار

کی اپنی شخصیت تھی پھر یونیورسٹی کے اِشو تھے۔ڈائننگ ہال کا کھانا، ہسپتال کا نظام، امتحانوں کا التواء، بورڈنگ کی بدنظمی وغیرہ۔کبھی کبھار قومی اِشو بھی آجاتے۔عام طور پر بائیں بازو کے طلباء کا حکومت پالیسیوں سے ٹکراؤ قوم کے لئے اردوزبان کا مسئلہ مسلمانوں کے ساتھ عدم انصاف،فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ۔اور ہاں سب کی تان ''اسلام خطرہ میں ہے'' پر ٹوٹتی۔

اس الیکشن میں خلاف امید شاہ حسن عطا کامیاب ہو گئے۔یونین کی روایت کے مطابق گنتی کے بعد یونین کی چھت سے مائکروفون پر اعلان ہونا تھا لیکن امیدواروں کے نمائندوں نے پہلے سے اشارے کنائے طے کرر کھے تھے اس لئے خاص خاص لوگوں کو نتیجہ کی خبر ہوگئی تھی اور دونوں کیمپوں میں اگلے مرحلے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ہم لوگ یونین کے لان میں کھڑے ہوئے یونین کے سابق آفیسرس کو اور ووٹ کاؤنٹ کرنے والوں کا انتظار کرر ہے تھے۔

بالآخر اعلان ہوئے اور ہر اعلان پر تالیاں گونجتی اور شور بلند ہوا۔علی گڑھ میں اُس دَور میں خوشی کے موقعہ پر تالیاں بجائی جاتی تھیں اور نعرہ تکبیر نہیں لگایا جاتا تھا۔امریکہ آکر معلوم ہوا کہ تالیاں بجانا حرام ہے اور نعرۂ تکبیر فرض۔چونکہ ہر خوشی کے موقعہ پر نعرۂ تکبیر مناسب نہیں اس لئے امریکن مسلمانوں کے جلسہ میں نہ تالیاں بجتی ہیں نہ نعرے لگتے ہیں۔سوگ کا سا سنجیدہ ماحول رہتا ہے جسے اکثر دیندار لوگ اسلامی ماحول کہتے ہیں۔ علی گڑھ کی ہر محفل اس سنجیدگی کی ضد تھی جو ہم پر اسلام کے نام پر امریکہ میں نافذ ہے۔ وہاں تو اسلام پسند حضرات تک کی، عبدالحق انصاری جیسے ثقہ لوگوں کو چھوڑ کر، موقع و محل سے بے ساختہ مسکرا دیتے تھے اور قہقہہ ہوتا بھی تو جس قدر وہ قہقہیں اور پوری محفل لطف اندوز ہو۔یوں علی گڑھ کی زندگی ایک مسلسل قہقہہ تھی جو زندگی سے بھرپور تھا۔

ہم یونین سے شاہ صاحب کے کیمپ میں آئے تو وہاں شادی کا ماحول تھا۔ ہر

طرف قہقہے، چٹکلے، لطیفے۔ شفیق انجم اور سعید اختر صاحب کی رہنمائی میں شاعر اور ادیب تعزیتی خطوط احمد سعید اوران کے سینئر ورکرس کے نام لکھ رہے تھے اور مرثیے تحریر کر رہے تھے جو شکست خوردہ نمائندے اوراس کے وارثین سینئرس کو بھیجا جانا تھا۔

میں اس کیمپ سے ایس۔ ایم۔ ایسٹ احمد سعید صاحب کے کیمپ پر آیا تو وہاں سینیرس جنازے کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔ وہاں بھی مایوسی اور سوگ کی فضا نہیں تھی۔ جنازہ کے استقبال کی تیاریاں تھیں۔ احمد سعید صاحب نے مبارک باد کا خط شاہ صاحب کو لکھا اور انھیں اپنی مثبت معاونت کا یقین دلایا۔ اُدھر سے شاہ صاحب نے احمد سعید کو تعزیت کا خط لکھا مستقبل کے لئے یونین کے مفاد میں معاونت طلب کی اور سینیرس کے نام مانگے جن کا جنازہ پیٹا جانا تھا۔

جس قدر جنازہ پیٹنا فخر کی بات تھی اسی قدر اُسے پٹوانا بھی بہت بڑا اعزاز تھا۔ جنازہ صرف سینیرس کا پٹتا۔ نوحہ خواں بھی اسی پلے کا سینیر ہوتا۔ صرف سینیرس برآمدے میں کھڑے ہوتے اور جملے کستے، مذاق اڑاتے، مرثیہ پڑھتے۔ ہر جملے پر آہ و بکا بلند ہوتی۔ مرحوم سینیر فخر سے سینہ تانے کرسی پر کھڑا سگریٹ کے کش پر کش لگاتا رہتا۔ پھر سینئر شاعر سامنے آکر اس کا مرثیہ پڑھتا تھا جس پر حاضرین سینہ کوبی محرم کے ماتم کی طرح کرتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلتا۔ چھ سات مرحومین کا ماتم ہوا۔ ان سینیرس میں احمد سعید صاحب کے بھانج داماد سید سعید پیرجی بھی تھے (بعد میں وہ لکھنؤ میں سائنسی تحقیقاتی ادارہ سے وابستہ رہے) ان کے مرثیہ کا ایک شعر یاد ہے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے پیرا
مقابلہ میرے ممیا سسر نے خوب کیا

ان کا جنازہ خوب خوب پٹا وہ سینیر ورکر بھی تھے اور بھانج داماد بھی۔ جن کے جنازے پٹ جاتے وہ دوسرے دن فخر سے سینہ پھلا کر یونیورسٹی میں گھومتے اور جونیرس کو

چائے پلا کر اپنی بزرگی کی تصدیق کراتے۔ پیر جی کی سینئرٹی کا شرف آج تک باقی ہے لیکن دامادی کا رشتہ جلد ختم ہو گیا تھا۔ پیر جی لکھنؤ کی مشہور معروف سائنس کونسل سے ریٹائر ہو کر اپنی قندمکرر بیگم اور لائق اولاد کے ساتھ لکھنؤ میں بامعنی زندگی گزار کر رخصت ہو گئے ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆ (بزاخفش: اخفش فلسفی کی بکری جو ہاں اور نہیں میں گردن ہلانا جانتی تھی۔
اخفش حلقہ علم میں اپنے دلائل پیش کرنے سے پہلے اس بکری کے سامنے رکھتے۔
وہ اگر منفی گردن ہلاتی تو وہ مزید اپنے دلائل دیتے۔ یہاں تک کہ وہ بکری مثبت گردن ہلا دیتی
اور وہ پھر کسی دوسری فکر میں مبتلا ہو جاتی۔)

علیگڑھ پہلا سال
تعطیلات انبہٹہ پیرزادگان میں آمد
(مئی جولائی ۱۹۵۲)

علی گڑھ کا پہلا سال پلک جھپکتے گذر گیا۔ احباب کی معاونت سے امتحان دے دیا اور کامیابی متوقع تھی۔ ہم یہ مصمم ارادہ کر کے نکلے کہ گرمی کی چھٹی میں پڑھے ہوئے سبق کو پکا کریں گے۔ دیوبند چند ہفتے قیام کے بعد ہم نانا جان اور نانی جان کے پاس انبہٹہ آ پہنچے۔ انبہٹہ تعطیلات میں ہم سب ہم عمروں کا معمول تھا کہ ناشتہ کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ اور نو کے درمیان ڈاکخانے پہنچتے۔ ہمارے سامنے سہارنپور سے ڈاک کی بس آتی جس سے ڈاک کا تھیلا اترتا۔ وہ ڈاکخانہ میں کھلتا اور ڈاک منشی اس کی ترتیب شروع کرتا۔ ڈاک خانے والے ہم لوگوں کے ہجوم سے پریشان بھی ہوتے اور ہماری موجودگی سے خوش بھی۔ ڈاک منشی اردو کی شدھ بدھ رکھتا تھا ہم ڈاکخانہ کے دروازے کے باہر سے اچک اچک کر دیکھتے اور اسے نہ صرف بتاتے کس کا خط ہے بلکہ اس خط کو گھر تک پہنچانے کی خدمات بھی پیش کرتے اس طرح منشی جی کا پورا مسلم محلے کا چکر بچ جاتا اور مکتوب الیہ کو خط گھر پر ساڑھے نو کے بجائے دو بجے تک مل جاتا۔ ہم نہ صرف خط پہنچاتے بلکہ اکثر پڑھ کر بھی سناتے اور اگر یہ خط پاکستان کے اعزاء کا ہوتا تو پھر اس کے مضمون کو تشریحی نوٹس کے ساتھ پوری بستی میں پھیلاتے۔

پھر شام میں عورتیں برقعہ اوڑھ کر نکلتیں اور اس مکتوب الیہ کے گھر میں پہنچ کر خود خیر خیریت معلوم کرتیں اور ہدایت کرتیں کہ اس کا جواب لکھواؤ تو ہماری طرف سے بعد دعا و سلام کے یہ لکھوانا۔ غرض جس دن پاکستان سے کسی کا خط آتا اس دن پوری بستی میں چہل پہل رہتی۔

ہفتے میں ایک دن لاہور سے ہمارے ماموں جان بخشی شریف احمد کے پاس ان کے صاحبزادے آفاق احمد انصاری اپنے پرانے اخبارات کا پلندہ بھیج دیتے۔ جب یہ اخبار

لاہور سے انبہٹہ پہنچتے تو کم وبیش ایک ماہ پرانے ہوتے اور کم وبیش ایک ہفتہ کی خبریں ایک دن میں تھوک کے حساب سے لاتے۔ وہ دن نہ صرف ماموں جان کا بلکہ پوری بستی کا بڑا ہنگامی ہوتا۔ پاکستانی اخبار کی ہر سرخی ماموں جان اوران کے عقید تمند قصائیوں، جولاہوں ،تیلیوں، جاٹوں ،سیدوں، شیخوں ،شاہجیوں کے لیے وحی سے کم نہ ہوتی۔ ماموں جان اخبارات کامطالعہ تاریخ وارنہیں کرتے تھے بلکہ سرخی وارحسبِ دلچسپی کرتے تھےاور پھر سب خبروں سے اپنے مذاق،حرارتِ ایمان اور مسلمانانِ کرام کی دلچسپی کے پیش نظران کواپنی فکر کی بیاض میں مرتب کرتے پھرنکل کھڑے ہوتے جیسے مومن جہاد میں جاتا ہے۔

خانقاہ شریف، شاہ مقصود کی بیٹھک ،گھوڑا قصائی کی دکان، حبیب حلوائی کے پکوان، اپنے کھیتوں کے مزارعہ غرض جس طرف جاتے تازہ ترین پاکستانی خبروں سے کشتوں کے پشتے لگادیتے۔کئی دفعہ انھوں نے پاکستان کی فوجوں کودلی میں اتاردیااورکتنی دفعہ انھوں نے جواہرلال نہروکو’’بین القوۃ‘‘(اقدام متحدہ)’’یعنی لندن کی پریوی کونسل‘‘ کے سامنے مجرمانہ پیش کروادیااوروہ وہاں سے پنڈت جی کشمیر کے سلسلہ میں جھوٹے سچے وعدے کرکےاپنی جان بچاکردلی پہنچے۔ماموں جان کے علم کے مطابق انگریز عارضی چھٹی پرولایت گیا تھااورواپسی کاٹکٹ ساتھ لےکرگیا تھا۔

ماموں جان جس بے باکی سے یہ خبریں مسلمان حلقوں میں پہنچاتے اس سے زیادہ جرأت ایمانی کے ساتھ ہندوؤں میں پہنچاتے۔گھر کے بھنگی ،رعایا کے چماران کے کھیت کے مزارعہ تو مجبوراً یہ کہہ کرقبول کرتے :ع

’’میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!‘‘

دن میں جب انبہٹہ کے بازارمیں لالہ مترو،سنتو بساطی،سری رام بنزازاوررات میں پنڈت راج اورچیر مین جین کی بیٹھک میں وہ صاف صاف کہہ دیتے اب ہندوستان کی خیر نہیں۔اورسب بخشی جی کے شکر گزار ہوتے کہ ان جیسے بزرگوں کے ہوتے ہوئے وہ پہلے

سے ہندوؤں کو آنے والے خطرات سے خبر دار کر رہے ہیں اور ہندوستان کی بھلائی کے لیے وہ پاکستان کو بھی روکے ہوئے ہیں۔ ہماری بستی کی رواداری اور وضعداری کا یہ عالم تھا کہ بخشی جی کی اطلاعات پر معترض ہو کر ان کے گالی اور جوتے کھانے کو کوئی تیار نہ تھا۔ وہ سب کے بڑے تھے اور غصہ میں وہ اپنے ہندوستانی بیٹے لئیق احمد اور ان کی دلہن خدیجہ سے جو معاملہ کرتے وہ بستی کے ہر فرد سے کر سکتے تھے۔ اپنی اولاد کی طرح بستی بھی ان کے لیے سعادتمند اولاد کی طرح تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی ان کی ساری اولاد ان کے بیٹے لئیق احمد انصاری اور ان کی فیملی اور بیٹی اختری بیگم اور ان کی فیملی کو ہندوستان میں چھوڑ کر ساری اولاد پاکستان میں تھی اور خوش حال تھی۔ یہاں تک کہ ان کی بیگم امت السجان نے بھی پاکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ سب ان کے لئے سراپا انتظار تھے لیکن وہ نہ اپنا جدی مکان چھوڑنے کو تیار تھے نہ اپنا آبائی وطن۔ وہ مرنا بھی اپنی وطن میں اور دفن ہونا اپنے بزرگوں کے قبرستان ہی میں چاہتے تھے۔ ان کا یہ فیصلہ ان کے پاکستانی اعزاء کے لئے ضد اور نادانی کا تھا لیکن ان کے لئے خودداری یا حب الوطنی کا تھا۔ ان کے اس جذبہ کی انبہٹہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کو قدر تھی اور آخر میں ہوا بھی یہی۔ قدرت نے بھی ان کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیا۔

جہد مسلسل
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دوسرا سال
(1952-53)

علیگڑھ روانگی:

ہم پورے عزم سے تعلیمی منصوبہ لے کر انبیہٹہ تعطیلات میں آئے تھے اور اب بغیر اس کی تکمیل کے علی گڑھ اس ارادے سے جار ہے تھے کی جاتے ہی تعلیمی سلسلہ شروع کر دیں گے اور آج کا سبق کا ہر گز کل پر نہ چھوڑیں گے ۔مگر علی گڑھ پہنچے تو اپنے میں بڑی انقلابی تبدیلی پائی ۔ہم یکا یک سینئر ہو گئے تھے ،فرسٹ ایر میں آنے والے طلباء کے انٹروڈکشن کا ہمیں اختیار حاصل تھا۔فرسٹ ایئر میں ہم پر جو گزری اس کا ہم نے مع سود کے قرض اتارنا شروع کر دیا۔فرسٹ ایئر کے سراسیمہ طلباء کے انٹروڈکشن کی اب یاد آتی ہے تو بجز شرمندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا

علی گڑھ میں ہر کام آکسفورڈ اور کیمبرج کی نقالی میں اصل سے بڑھ کر کیا جاتا تھا ۔انٹروڈکشن کا ایک مثبت اور اخلاقی پہلو ہم نے یہ وضع کیا تھا کہ اس سے تعلقات میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے اور گہرائی بڑھتی ہے۔ پھر سینئر جونیئر کا بڑا بھائی بن کر اس کا خیال رکھتا ہے ۔اس بات میں کچھ حقیقت ضرور تھی۔علی گڑھ کے سینئر اور جونیئر کا تعلق آج بھی قابل احترام مانا جاتا ہے،لیکن اس تعلق کے پیدا کرنے کیلئے نئے طلباء کے انٹروڈکشن کی بدعت کی ضرورت نہ تھی ۔پھر اس میں بھی ایسی حرکتیں داخل ہو گئی تھیں جو اخلاقی حدود سے باہر تھیں۔لیکن اس دور میں علی گڑھ کی ہر روایت مقدس تھی اور ہم کو بھی سکینڈ ایئر میں آمد کے ساتھ ہی لگنے لگی تھی ۔اس روایت کے تقدس کی حفاظت ہماری ذمہ داری تھی۔

یہ بات لندن اسکول آف اکنامکس (۶۶۔۱۹۶۳) میں اور ہارورڈ یونیورسٹی

(۷۶۔۱۹۷۲ء) میں تعلیم پانے کے بعد معلوم ہوئی کہ سینئر طلباء نئے طلباء کا استقبال اور رہنمائی کس دلجوئی اور نظم سے کرتے ہیں۔سینئر طلباء کیمپس کے تعلیمی ٹور میں نئے طلباء کو نہ صرف بلند تاریخی عمارتوں کا تعارف کراتے ہیں بلکہ ادارہ کی تاریخ،مقاصد،پالیسیز اور لائحہ عمل سے بھی روشناس کراتے ہیں اور نئے طلباء کے تمام سوالات کا جواب اور مشکلات کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ہمارے ہاں کی بعض مقدس روایات نہ مقدس ہیں نہ روایات ہیں۔ مغربی اداروں کی اچھی اقدار کو اپنے ہاں رائج کرنے کی ضرورت ہے۔اور بری روایات کو تقدس کا درجہ دے کر پروان نہیں چڑھانا چاہئے۔مغربی اداروں کے مثبت انداز اکثر علی گڑھ اور ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں مفقود ہیں۔

ہم انبیہٹہ سے علی گڑھ واپس یہ طے کر کے آئے تھے جاتے ہی باقاعدگی سے تعلیم شروع کریں گے اور ہم نے اپنے کمرہ ۴۵ میکڈانلڈ میں جلد خود کو منظم کرلیا۔ابھی ہم تیار ہو کر میز پر بیٹھے ہی تھے کہ ہر آنے جانے والے نے ہوٹنگ شروع کردی۔''پارٹنر! ٹاپ کرنا ہے؟'' یار ریکارڈ بریک کروگے؟'' سائنس اور میتھ میٹکس کی تعلیم میں یوں بھی ہمارا دل نہ لگتا تھا لیکن ان ہوٹنگ والوں نے ہمارے سچے دل کے عہد و پیمان کو زیروزبر کردیا۔

یوں بھی تعلیم شروع ہونے سے پہلے کرنے کے بہت سے کام بھی تھے۔ہماری احباب گھروں سے حلوہ،کباب،پراٹھا،کھجوریاں،ابلے انڈے اور علم غلم بہت کچھ لائے تھے۔ان سب کے ہاتھ بٹانا تعلیم سے زیادہ اہم تھا۔اس معاملہ میں عجلت بہت ضروری تھی۔ ایک تو اسباب خوردنی کے کھانے موقوف رکھنے سے اس کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ دوسرا اس سے بھی بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم نے اپنے کام و دہن کا اس وقت حق ادا نہ کیا تو اکثر لوگوں کا خلوء معدہ اپنے توسع میں سارے مال غنیمت کو سیکڑ لے گا۔اس لئے ہر چند کہ ہمیں بدہضمی اور امراض معدہ کی شکایات پہلے سے بھی تھیں اور کھا کر مزید شکایات بھی پیدا ہونے کا خطرہ تھا،ہم نے اپنی ادائیگی فرض میں کوتاہی نہیں کی۔

پہلا سیاسی قدم:

اس عرصہ میں ایک اہم بین الاقوامی میدان میں صف آرائی کا سنہرا موقعہ ہمیں میسر آ گیا۔یونیورسٹی کے اکثر مسائل مقامی نوعیت کے تھے۔ڈائنگ ہال کا کھانا،ڈاکٹروں کی عدم توجہ،مچھروں کی کثرت،محرّم کی چھٹی،امتحان کو التواء،وظیفہ،یہاں قومی مسائل پر سنجیدہ توجہ کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ایک بین الاقوامی مسئلہ پیش آ گیا اور ہماری چھٹی حس اور غیرت ایمانی نے ہمّت مرداں مدد خدا کے مقولہ کے مطابق خود کو اس خدمت کی سعادت کے لئے پیش کر دیا۔

اخبار''سیاست''(مدیر اعلی:اسحٰق علمی) کانپور اور اخبار''الجمیعت''(مدیر مسئول عثمان فارقلیط) کی خبر کے مطابق امریکہ کے رسالے لائف نے حضورﷺ کی تصویر چھاپ کر مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا تھا اور اپنی اسلام دشمنی کا کھلا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔یہ واقعہ کئی ماہ پہلے پیش آیا تھا لیکن کسی غیرت مند مسلمان نے اسے اتفاقاً لندن میں دیکھ لیا اور ہندوستان میں اس حادثہ کی خبر بھیج دی۔اخبار کی اطلاع کے مطابق مسلمانوں میں غم وغصہ پھیل رہا تھا اور وہ جلسے جلوس کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں سے غیرت ایمانی کے ثبوت کے طور پر سخت احتجاج کی اپیل کی تھی۔

ہم نے اس وقت تک لائف میگزین کا نام نہ سنا تھا نہ یہ معلوم تھا کہ اس کے عام مضامین کس نوعیت کے ہوتے ہیں؟ نہ یہ خبر تھی کہ تصویر کی تقریب اشاعت کیا تھی؟اور کیا وہ کسی سیرت طیبہ کے بارے میں کسی مضمون کا حصہ تھی یا مسلمانوں کے خلاف کسی عالمی سازش کا نتیجہ؟بس اس قدر یاد کہ یہ خبر پڑھ کر ہمارا ایمان تازہ ہو گیا اور ہم سیدھے شاہ عنایت حسین آفتاب (صدر یونین) کے کمرے پر سرسید ہال جا پہنچے۔

ہم نے پچھلے سال ان کا الیکشن لڑایا تھا اور غالباً ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی، ہمیں پوری توقع تھی کہ وہ قیادت کے اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور اس اطلاع پر ہمارے شکر گزار ہوں گے۔ان کی دانشمندی سے یہ توقع بھی تھی کہ وہ اس موقعہ سے احمد سعید (انڈا) کو فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے۔ہم ان سے ملے تو معاملہ مختلف نکلا۔

انہوں نے بڑی سردمہری سے خبر سنی اور الٹے ہم سے سوالات شروع کر دیئے۔

''آپ نے لائف میگزین پڑھا؟''

''یونین کا کام افواہوں پر مذمت کے جلسے کرنا نہیں!''

''ہماری مذمت سے لائف میگزین پر کیا اثر پڑے گا؟

لائف میگزین امریکہ کا مشہور و معروف مجلّہ ہے۔حضورﷺ کی تصویر کے چھاپنے سے ہماری زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟''

ہم ان کے اس ردعمل سے سخت مایوس ہونے لگے لیکن ہمارے اندر کا مسلمان بیدار ہو چکا تھا۔اس لئے ہمیں والد صاحب کا ایک جملہ یاد آ گیا، جسے انہوں نے شملہ کانفرنس ۱۹۴۶ء سے پٹیالہ واپسی پر کانگریسی ہم خیال لوگوں سے مایوسی کے عالم میں کہا تھا: ''پاکستان بننا اب مسلم قیادت کا فیصلہ ہے اور مسلم سواد اعظم ان کے ساتھ ہے، ہرچند کہ یہ عمل مصلحت امت کے خلاف ہے!'' ہمیں وہ جملہ اچھا لگا تھا اور یاد ہو گیا تھا۔اس وقت اس کے معنی معلوم نہیں تھے، اب ہر لفظ بامعنی ہو گیا۔اس لئے ہم نے ابا جان کے لب ولہجہ میں پورے تیقّن سے جملے کو اپنے حالات کے مطابق بنا لیا۔

''اس افسوسناک واقعہ پر پروٹیسٹ کرنا مسلم قیادت کا فیصلہ ہے اور مسلمانوں کا سواد اعظم اس کے حق میں ہے اگرچہ یہ مصلحت امت کے خلاف ہو!''

ہمارے اس جملے نے شاہ صاحب کو چونکا دیا اور انہوں نے پہلے تو ہمارے جملے کو ہم پر لوٹا دیا۔''میاں اب نہ مسلم قیادت ہے، نہ مسلمانوں کا سواد اعظم، نہ مصلحت امت۔

آپ اپنی زباں دانی کو یونین کے پلیٹ فارم پر لگائیں اور تعلیم پر محنت کریں۔"

شاہ صاحب کے پاس سے ہم مایوس لوٹے۔لیکن یہ خبر کیمپس میں پھیل چکی تھی۔ الیکشن قریب تھا، احمد سعید دوبارہ صدارت کے امیدوار تھے۔ان کے مقابلے میں محمد امین بلبلیا جنوبی افریقی کے شعلہ بار مقرر تھے۔احمد سعید کو اسلام کے خطرات دیکھنے پر ید طولی اور لب اظہار حاصل تھا۔عنایت حسین آفتاب مسئلہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔چنانچہ مذمت کا جلسہ ہوا، جس میں بڑی ایمان افروز تقاریر ہوئیں اور صاف صاف اہل مغرب، مستشرقین، لائف میگزین حکومت امریکہ اور اقوام متحدہ کو بتادیا گیا کہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے نتائج ان سب کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔اور مطالبہ کیا گیا کہ فوراً میگزین گزشتہ کے لیے معافی مانگے اور جتنے شمارے باقی ہیں انہیں نذر آتش کرے۔آئندہ کیلئے وعدہ کرے کہ اس غلطی کا ارتکاب کبھی نہیں کرے گی۔ساتھ ہی حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ اس رسالہ کی اشاعت فوری طور پر بند کرے اور حکومت امریکہ پرزور ڈالے کہ وہ اس طرح کی شرانگیزی کا مناسب سدّ باب کرے۔

اس جلسے کا ایک روشن پہلو یہ تھا کہ الیکشن کے قریب اور امریکہ کے تعلق نے کامریڈس کو مومنین کی صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ان کے لئے یہ سمجھانا مشکل نہ تھا کہ امریکن امپیریلزم نے حضور ﷺ کی تصویر کے پردے میں مسلمانوں کے حقوق انسانی کو پامال کیا تھا۔انہوں نے بتایا کہ سویت یونین میں کس طرح مسلمان اقلیتیں اور مسلم عوام آزادی اور مساوات کی زندگی گزار رہے ہیں اور وہاں کے نظام میں انجلیس ، مارکس ، لینن اور اسٹالن کے علاوہ کسی بھی عظیم شخصیت کی تصویر چھاپنے کی اجازت نہیں ۔جلسہ تو پرزور ہو گیا لیکن ہمیں افسوس اس کا رہا کہ نہ تو ہمیں کوئی کریڈٹ ملا اور نہ ہی اسٹیج پر آکر ہمیں کچھ کہنے کی ہمت ہوئی۔بس کارِ ثواب تھا، سو الحمد اللہ ہم سے بے اختیاری میں سرزد ہو گیا۔

یونین کے اسٹیج سے تقریر کرنا بڑی ہمت کا کام تھا۔مقرر کے دوست اس کے کٹر دشمن بن کر الفاظ کی سنگ باری کرتے۔کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ فرنٹ پوری تیاری سے اپنے مخالفین کو ڈاؤن کرنے کے لئے آتے۔ہم پہلے سال میں بہت کچھ دیکھ کر فیصلہ کر چکے تھے کہ یہ میدانِ جہاد غازی کے بس کا نہیں ،لیکن ایک اچانک واقعہ نے ہمیں مقرر بنادیا۔

یونین میں عام ڈبیٹس عموماً ہوتی تھیں اور پرائز ڈبیٹس خصوصاً ہوتی تھیں۔ان ڈبیٹس میں عام طور پر موضوعات متعین ہوتے تھے۔کبھی کبھی Extempore (فی البدیہہ) بھی ڈبیٹ ہوتی تھیں ،جس میں جلسہ شروع ہونے کے بعد موضوع کا اعلان ہوتا۔ایک خاص طرح کی فی البدیہہ ڈبیٹ ہوتی جس میں مقرر کو تیاری کے لئے صرف پانچ منٹ ملتے تھے۔یعنی جب پہلا مقرر بولنے کے لئے پہنچتا تھا تو عین اسی وقت اس کے بعد آنے والے مقرر کو اس کا موضوع لاٹری کے ذریعہ نکالنے کے لئے بلایا جاتا۔وہ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے چند منٹ میں اپنے خیالات کو مجتمع کر کے موضوع پر تقریر کرتا۔ایسے ہی ایک ڈبیٹ کا اعلان ہوا اور ہم بھی سننے کے لئے عابد رضا اور اکبر عرشی زادہ اور دیگر میکڈانلڈ کے ساتھیوں کے ساتھ جلدی سے یونین پہنچے۔

یونین ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔احمد سعید اور سلطان نیازی کو جس قدر انعام جیتنے تھے وہ جیت کر ریٹائر ہو چکے تھے لیکن عبید صدیقی (آج کل ہندوستان کے عظیم سائنس دان) بھی میدان میں تھے۔ڈبیٹ شروع ہوئی۔مقررین کی تقاریر اور طلباء کی ہوٹنگ سے بڑا دلچسپ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ہم بھی زوردار طریقہ سے ہوٹنگ کر رہے تھے کہ اچانک ہمارا نام پکارا گیا۔لیکن ہماری میکڈانلڈ کی ٹیم نے سوچی سمجھی سازش کے مطابق ہمیں ''پابدست دیگرے ،دست بدست دیگرے'' اسٹیج پر پہنچادیا۔ہم نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے قسمت کی پرچی اٹھائی اور اس میں موضوع برآمد کیا۔''اس بات میں کوئی شبہ نہیں اردو ادب تنزل پذیر ہے۔''موضوع۔اشتیاق محمد خان کی صحبت نے ہمیں کمیونسٹ تو نہ بنایا

لیکن ان کی نے نوازی نے ترقی پسند ادب سے متعارف کرادیا تھا۔وہ سردار جعفری، فیض، جذبی، کیفی، مجاز، ساحر، منیب الرحمٰن کی جو غزلیں، ہر شام اپنے ذوق کی تسکین اور اشترا کی انقلاب کے مژدہ کے طور پر پڑھتے تھے اور بنیجو پر ان کی دھنیں بناتے تھے۔وہ ہمیں یاد ہو گئیں تھیں۔ادھر ''سرخ آنچل'' کے افسانے اور ترقی پسند ادیبوں کی کاوشوں نے ساتھ دیا اور ہمیں یہ ثابت کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ اردو ادب روبہ ترقی ہے اور نئی جہتوں کی طرف گامزن ہے۔

دراصل یہ موضوع بھی قسمت کی یاوری تھا اور ہمارا پانچ منٹ سے کم قد اور گاندھی مارکہ ڈھانچہ رحم کا طالب تھا۔ہمارے دوستوں کے علاوہ کسی نے ہوٹنگ نہ کی اور ہم تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے بخیریت اپنی سیٹ پر واپس آ گئے۔انعامات کا اعلان ہوا تو ہمیں تھرڈ پرائز ملا۔فرسٹ پرائز عبید صدیقی صاحب کو ملا تھا۔ان کے مقابلے میں تھرڈ پرائز حاصل کرنے کی خاص اہمیت تھی۔سینئرز نے ہم میں جوہر دیکھ لئے تھے اور یونیورسٹی میں ایک نئے شعلہ بار مقرّر کی خبر پھیل گئی تھی۔بعد میں معلوم ہوا کہ ہمیں اسٹیج پر پہنچانے کی سازش عابد رضا اور اکبر عرشی زادہ کی سازش تھی۔

اس تقریر کے بعد عبید صدیقی بھی ڈبیٹس سے ریٹائر ہو گئے اور یونین کے فرسٹ پرائز پر اگلے تین سال کیلئے ہمارا قبضہ ہو گیا۔

۱۹۵۲ء کا صدارتی الیکشن غیر معمولی جوش وخروش سے ہوا۔ادھر احمد سعید انڈا اسلام کے علمبردار تھے۔ادھر محمد امین بلبلیا ترقی پسند اور سرخ انقلاب کے دعویدار۔کمیونسٹ اور ترقی پسند یونیورسٹی میں ۶۰۰ ووٹ سے زیادہ نہیں رکھتے تھے لیکن ہندو سکھ عیسائی طلباء ان کے ساتھ دیتے تھے اور گنے چنے نیشنلسٹ اور ان کے ہم خیال کبھی ادھر کبھی ادھر ڈولتے رہتے تھے۔خود ہم بھی انہیں ڈولنے والوں میں سے تھے۔میں نے اسلام کے نام کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کو کبھی پسند نہیں کیا اور کمیونسٹ تحریک کو عقائد اور مسلک کیلئے خطرہ

سمجھا۔اپنے سیاسی مؤقف اور''اسلام خطرہ میں ہے'' کے مذہبی نقطہء نظر کو میں مسعود حیدر صاحب کو دیئے گئے انٹرویو میں پہلے واضح کر چکا ہوں۔لیکن سیکنڈ ایئر میں ہم علی گڑھ کی سیاست کے محض تماش بین تھے۔

احمد سعید نے ایک سال پہلے کی اسٹریٹجی میں تبدیلی کی۔اب وہ موقع ومحل کے لحاظ سے متوازن باتیں کررہے تھے۔اسلام، پاکستان اور اردو کا استعمال برمحل اور احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا۔ان کے پچھلے سال کے برتاؤ اور تقریروں نے فرقہ وارانہ فضاء میں جو تکدر پھیلایا تھا وہ اخبارات پارلیمنٹ تک پہنچ گیا تھا۔ذاکر صاحب، جس نیشنلسٹ محب وطن ذہن کو بنانا چاہتے تھے،اس کے لئے احمد سعید رکاوٹ بن گئے تھے لیکن ذاکر صاحب کسی جوہر کو ضائع کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ان کی نگاہ میں احمد سعید اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔

اس عرصہ میں ونوبا بھاوے تشریف لائے ان کے اعزاز میں خصوصی جلسہ ہوا۔ذاکر صاحب نے اپنے طلباء کا پرزور دفاع کیا اور الزام لگانے والوں کو سلواتیں سنائیں اور فرمایا۔

> ''ہم پر الزام ہے،ہم نے پاکستان بنوایا۔یہ بات الزام نہیں اس یونیورسٹی کی اجتماعی اور تعمیری قوت کا اعتراف ہے۔ہاں!ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے پاکستان بنوایا اور دنیا میں کتنی یونیورسٹیاں ہیں جنہوں نے کوئی ملک بنوایا ہو!ونوبا جی!میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کل اگر ہم نے پاکستان بنوایا تھا تو آج ہم اپنے آزاد مملکت اور اس کی جمہوریت کے دفاع کے لئے تیار ہیں۔ہم اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت اپنے جان ومال اور عزت وآبرو سے کر کے دکھائیں گے!''

ذاکر صاحب کی تقریر پرجوش اور ذہن ساز تھی۔ان کے استقبالیہ کے بعد احمد سعید کا نمبر آیا۔انہوں نے کھڑے ہوکر ذاکر صاحب کی تقریر کو نئی معنویت دے دی۔

> ''جناب والا مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں پاکستان چلا جاؤں۔میں ان کو یقین

دلاتا ہوں کہ میں پاکستان جاؤں گا۔میں یقیناً ایک دن پاکستان جاؤں گا۔۔"
اتنا کہہ کر احمد سعید ذرا سا ٹھہرے۔یہ جملے سن کر پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ذاکر صاحب کے چہرے کے رنگ متغیر ہو رہے تھے۔اورونو باجی اثبات میں سر ہلا کر اپنی وسیع نظر ی کا ثبوت دے رہے تھے کہ احمد سعید پھر گویا ہوئے۔"لیکن جناب میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے ملک کا سفیر بن کر اس ملک کے عوام کا پیام محبت لے کر پاکستان جاؤں گا!" ذاکر صاحب نے لمبا سا سانس لیا۔ونو باجی مسکرائے اور اسٹریچی ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

احمد سعید نے الیکشن سے قبل بہت سی تالیوں کی گونج میں اس طرح بہت سے ووٹ جیت لئے۔ان ووٹوں میں مسلم نیشنلسٹ گروپ کا اور ان کے ساتھ ہمارا بھی ووٹ تھا۔نیشنلسٹ گروپ نے فیصلہ کیا کہ اگر چہ ہمیں احمد سعید سے نظریاتی اختلاف ہے لیکن اس وقت کے سیاسی حالات میں ہم ووٹ احمد سعید کو دیں۔ہم نے اس الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا۔لیکن احمد سعید کی اس تبدیلی فکر میں ہمیں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی ہلکی سی جھلک نظر آنے لگی اور کچھ تردد کے بعد بُلبُلیا کے تعلق کو نظر انداز کر کے خاموشی سے احمد سعید کو ووٹ ڈال دیا۔

دراصل علی گڑھ کے دو گروپ کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ تھے۔جماعت اسلامی اور کمیونسٹوں کا فلسفہ اور پروگرام واضح تھا۔اینٹی کمیونسٹ "بغض معاویہ" پر مجتمع تھے۔اینٹی کمیونسٹ میں مسلم لیگی ذہن اور پروفیسر ہاشم قدوائی صاحب کی یوتھ کانگریس شامل تھی۔نیشنلسٹ گروپ محض فکر تک محدود تھا اور عمل سے بے نیاز تھا۔یونیورسٹی میں یہ افواہ بھی تھی کہ ذاکر صاحب نے احمد سعید کو بٹھا کر قوم پرستی کا سبق دیا ہے اور وہ ان میں مسلمانوں کے مستقبل کی قیادت کے خواب دیکھ رہے تھے۔کچھ دن بعد الیکشن ہوا، اور خوب جم کر ہوا۔ایک طرف "راج کرے گا بلبلیا" کے نعرے تھے دوسری طرف "احمد سعید زندہ باد" کا غلغلہ تھا۔الیکشن کا نتیجہ احمد سعید کے حق میں نکلا۔حسب روایت جنازہ کی تیاری شروع ہوئی لیکن

اس بار دونوں طرف جذبات بہت برانگیختہ تھے۔احمد سعید کے کیمپ کے جنازہ بردار جب ''بلبلیاہائے ہائے'' کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے کیمپ میں پہنچے تو وہاں لاٹھیوں سے استقبال ہوا۔ان کے کیمپ میں افواہ تھی کہ جنازہ کے پردے میں مسلم گروپ کے حملہ کی تیاری ہے۔ہم اس جنگ کی تاب نہ لاکر موقع واردات سے اپنے ہوسٹل میں دوڑ کر پناہ گزیں ہوگئے۔جنازہ تو نہ پٹا،لیکن اس دن جنازہ کی ''مقدس روایت'' کا جنازہ نکل گیا۔ شاہ عنایت حسین آفتاب اور احمد سعید کا الیکشن علی گڑھ کی مقدس روایت کے مطابق آخری الیکشن ثابت ہوا۔اس کے بعد ہر الیکشن میں جنازہ کی روایت سے بغاوت تھی اور ڈنڈے اور زور بازو کا استعمال عام ہوتا گیا۔

ہمارے میکڈانلڈ پہنچنے کے بعد اشتیاق محمد خان، بھائی خان، ماجد، شارق اور جملہ کامریڈوں کا ہارا ہوا دستہ ۴۵ میکڈانلڈ میں جمع ہوا اور اس نے ''فرقہ پرست غنڈہ گردی '' کے خلاف پیش بندی کے امکانات پر غور کیا اور ہم نے بجبوری انہیں چائے سے نوازا۔ہماری رائے ان سب کی متفقہ رائے سے مختلف تھی۔ہم سمجھتے تھے کہ بلبلیا کیمپ کو پورے احترام سے جنازہ پڑانا چاہئے تھا۔لیکن بلبلیا کے ترقی پسند کامریڈز کی نگاہ میں اس وقت عوامی بیداری کا قافلہ پرامن بقائے باہمی سے خونی انقلاب کی طرف رواں دواں تھا۔اس لئے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا زمانہ آچکا تھا۔

احمد سعید کی صدارت بہت شان کی تھی۔سیئرس، ملیح آباد، رامپور اور قائم گنج کے پٹھان ان کے گرد جمع تھے۔وہ کھاتے پیتے کانپور (مجیدی پریس) کے گھرانے سے تھے۔جیب میں پیسہ بھی ان کی زبان کی طرح بولتا تھا۔یونین میں ہر قدم پر کمیونسٹوں سے ٹکراؤ جاری رہتا اور عام طور پر وہ فتح مند نکلتے۔احمد سعید اور سلطان نیازی کی تقریروں اور نوک جھونک نے اسٹوڈنٹ یونین کو مہذب اکھاڑا بنا کر علی گڑھ کی اجتماعی زندگی میں معنویت عطا کردی تھی۔

ہم نے یونین کی سیاست میں کم اور ڈبیٹ میں زیادہ حصہ لینا شروع کیا۔ادھر ایک اور نادر موقعہ ہاتھ آ گیا۔دلّی کالج دہلی میں آل انڈیا ڈبیٹ تھی۔اس کے ساتھ ہی دو روزہ سیمینار تھا جس کا عنوان تھا ''ہندوستانی زبانوں کا تحریک آزادی میں حصہ۔'' ڈبیٹ کے لیے انتخاب شعبہ اردو کے محترم استاد سید ظہیرالدین علوی کو کرنا تھا۔ہم سے انہوں نے خصوصیت سے کہہ دیا تھا کہ انتخاب کے مقابلے میں شرکت کریں۔یہ انتخاب یونین میں نہیں تھا بلکہ شعبۂ اردو میں تھا بہت کم مقررین نے شرکت کی اور ہم کم وبیش بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ہمارے ساتھ انوار علی خان سوز کا انتخاب ہوا۔

انوار علی خان سوز کا تعلق فکری اور علمی طور پر جماعت اسلامی سے تھا۔وہ کثیر العیال اور قلیل المعاش تھے۔ہم ان کے انتخاب سے زیادہ خوش نہ تھے کہ ہم دلّی میں ذرا آزادانہ گھومنا چاہ رہے تھے اور ان سے خوف تھا کہ وہ ہمیں ''جماعت خانہ'' میں قید کرادیں گے۔لیکن ان سے ملاقات کے بعد ان کے جوہر کھلے۔وہ جماعت سے بدظن ہو چکے تھے اور ان کی خوش گمانی کے لیے کوئی دوسری آئیڈیولوجی نہیں تھی۔ان کے دل میں اسلام کا درد تھا اور زبان پر فلمی دنیا کا ورد تھا۔ان کی پوری زندگی اسی تب وتاب میں گزر گئی۔علی گڑھ سے انگلش میں ایم کرنے کے بعد وہ جامعہ ملیہ میں انگریزی کے استاد ہوئے اور عجیب وغریب حالات میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آئندہ سال ۱۹۵۳ء میں ہمیں اردو اور انہیں انگریزی کے بہترین مقرر کے تمغے ملے۔اس سال مضمون نگاری پر دلنواز صدیقی کے قلم نے اپنے جوہر دکھا کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔تمغہ کی مجموعی قیمت پانچ سو روپیہ بتائی گئی تھی۔جب ہم اور انور علی خان سوز اپنی مالی مجبوریوں کے تحت اپنے تمغے لے کر سنار کے پاس گئے تو اس نے کہا وہ تانبے کے ہیں اور اس پر پالش سونے کی ہے۔گویا ہر چمک دار چیز سونا نہیں ہوتی۔یہ معاملہ ذاکر صاحب تک پہنچا۔ہم نے اس مسئلہ کو غبن ثابت کرنا چاہا لیکن بزرگوں نے بتایا تمغے سجانے کے لئے ہوتے ہیں بیچ کھانے کے لئے نہیں ہوتے۔

خیر! ہمارے انتخاب اور دلی کالج کے شعبۂ اردو کے سیمینار سے شعبۂ اردو کے طلباء میں ہلچل مچ گئی۔ان کی قیادت کا رول ظہیر احمد صدیقی اور ظہیر الدین صدیقی ادا کر رہے تھے۔ایم اے کے طلباء کا ایک وفد رشید احمد صدیقی (صدر شعبہ) سے ملا اور درخواست گزار ہوا۔''سائنس کے تمام شعبوں اور آرٹس کے اکثر شعبوں کے طلباء اسٹڈی گروپ پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاتے ہیں۔ہم شعبۂ اردو دلی کالج کے سیمینار اور ڈبیٹ میں شرکت کے لئے جانا چاہتے ہیں۔''رشید صاحب نے معصومیت سے اپنی جیب کی طرف دیکھا پھر شعبہ کے اساتذہ کی جیبوں پر نظر ڈالی۔پھر طلباء سے پوچھا''آپ لوگ ٹکٹ لے کر جائیں گے یا علی گڑھ کی روایت کے مطابق سفر کریں گے؟'' بہر حال، رشید صاحب نے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا۔دوسرے دن ذاکر صاحب کے تعاون سے پورے طلباء کے سفرخرچ کا انتظام ہوگیا۔کھانے کے پیسے نہ تھے، رشید صاحب نے خواجہ احمد فاروقی صاحب کے نام خط لکھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

''علی گڑھ کے شعبۂ اردو کا قافلہ سیمینار اور آل انڈیا ڈبیٹ میں شرکت کیلئے حاضر ہو رہا ہے۔قیام کا آپ انتظام فرمادیں۔طعام کا یہ خود طے کرلیں گے۔بشرطیکہ آپ اپنی روایتی اخلاقی کمزوری کا شکار ہوکر مہمان نوازی پر نہ اتر آئیں!''

ہم لوگ دودھ میل سے روانگی کے ارادے سے رات کے گیارہ بجے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ایک بجے یہ گاڑی آتی تھی اور علی گڑھ سے بن کر چلتی تھی۔اس میں علی گڑھ سے شاہدرہ تک گوالے اپنے دودھ کے ڈبے لے کر دلّی کیلئے سوار ہوتے تھے، یہ گاڑی بڑی سست رفتاری سے چلتی تھی اور جوں جوں اس میں گوالے داخل ہوتے جاتے اتنے ہی اور مسافر سکڑتے جاتے اور ان کا سفر گوالوں کے رحم و کرم سے انجام پزیر ہوتا۔

اس شب یہ گاڑی خصوصیت سے لیٹ ہوگئی۔ہم لوگ شب بھر انتظار کرتے رہے۔یہاں تک کہ دن نکل آیا، گاڑی آنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور اسٹیشن سے گھر واپس

جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔خطرہ واضح تھا،اگر شعبۂ اردو کو پتہ چل گیا تو سفر کینسل ہو جائے گااور پیسہ واپس کرنا پڑے گا۔بالآخر گاڑی آئی اور ہم لوگ روانہ ہوکر دلّی اور وہاں سے دلّی کالج ظہر کے بعد پہنچے۔صبح کا سیمینار ختم ہو چکا تھا۔کھانا جاری تھا جس میں ہم لوگوں نے شرکت کی۔رشید صاحب کے خط کا فاروقی صاحب پر خاطر خواہ اثر ہوا۔علی گڑھ کا شعبۂ اردو ان کی اخلاقی فراخدلی سے دلی کالج کا مہمان ہو گیا۔دوسرے دن آل انڈیا ڈبیٹ میں ہمیں فرسٹ پرائز اور زہرا سیدین کو سیکنڈ پرائز ملا۔یہ خبر دوسرے دن انگریزی اور اردو اخبارات میں چھپ کر یونیورسٹی میں پھیل گئی۔ہمیں خود اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا اور زہرہ سیدین کی تقریر کو ہم بقید ہوش وحواس فرسٹ پرائز دے چکے تھے۔

دلی میں شعبہ اردو کے نوجوان لیکچرر سید مظفر علی صاحب نے ہمیں دلّی گھمائی اور جامع مسجد کے تاریخی کریم ہوٹل میں دعوت کی اور پیسے اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔اس تفریح میں وہ مختصر سی رقم جو ظہیر احمد صاحب کو تولیت میں تھی وہ فضول خرچ ہوگئی اور سفر باقی رہا۔اس لئے واپسی کا سفر علی گڑھ کی روایت کے مطابق کرنا پڑا۔نمائش کے میدان سے گزرتی ہوئی ٹرین کو بذریعہ زنجیر کشی رکوا کر یونیورسٹی تک سرپٹ دوڑ لگا کر اس سفر کو پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

یہ سال جس طرح آگے کی طرف بھاگا ہماری اسٹڈیز اسی حد تک پیچھے کی طرف جاتی رہیں۔جو مضامین ہم پڑھ رہے تھے وہ مضامین میری دلچسپی کے نہ تھے۔ان کی تکمیل سے ہم انجینئرنگ میں داخلہ لے سکتے تھے اور شاید ہندوستان کی تعمیر میں بشرط ملازمت حصہ لے سکتے تھے۔لیکن انجینئرنگ میں داخلے کے لئے جس علم کی ضرورت تھی وہ ہماری دسترس سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔

ذاکر صاحب فرماتے تھے۔''وقت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ گزر جاتا ہے۔'' در اصل وقت کی خرابی بھی یہی ہے کہ وہ روکے نہیں رکتا اور گزر جاتا ہے۔دوسرا سال ہمارے

لئے ذاتی طور پر بڑی فتح مندی کا سال تھا۔وہ اس تیزی سے گزرا کہ پتہ بھی نہ چلا،ابھی سر بھی نہ گھمایا تھا کہ معلوم ہوا امتحان سر پر کھڑے ہیں۔یہ سال ہمارے لئے اس لئے غیر معمولی اہمیت کا تھا کہ ہم اچانک مقرر کی حیثیت سے متعارف ہو رہے تھے اور جملہ علمی اور ادبی نشستوں میں شریک رہتے تھے۔ادب اسلامی ،ترقی پسند مصنّفین ،شعبۂ اردو اور اسلامک اسٹڈیز کی محفلیں ،ادبی مجلسیں ہر جگہ شریک تھے اور غزل نظم افسانے محفلوں میں پڑھ رہے تھے وہ بعض رسالوں (مدینہ،بجنور،شمع ،بیسویں صدی،غنچہ،معیار اور نئی نسلیں) میں بھی شائع ہو رہے تھے۔

کتابیں امتحان کی تیاری کیلئے کھولیں تو مضامین غیر مانوس نکلے۔فزکس،کیمسٹری اور میتھ۔تینوں مضامین میں سے ایک میں بھی لفاظی کی گنجائش نہ تھی۔یہاں نہ ردیف تھی نہ قافیہ بس سائنس کے نکے بندھے فارمولے تھے۔اگر مضمون سے واقف ہو تو جواب آسان ہے ناواقف ہو تو لاکھ سر کھپاؤ مگر جواب سے محروم رہو۔

اب ہم سنجیدگی سے سائنس اور میتھ کے ان اسباق کو پڑھنے جا رہے تھے جنہیں ہم نے نقش ونگار طاق نسیاں بنا رکھا تھا۔پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ چارپائی نکال کر بستر زمین پر لگا دیا۔مچھر دانی تو ہمیں پورے علی گڑھ کے قیام میں نصیب نہ ہوئی۔اب ہم نے کھٹملوں اور مچھروں کے ساتھ حشرات الارض کے بھی کام و دہن کے لقمہ بن کر اپنے جاگنے کا سامان کر لیا۔پھر ہم نے ان دوستوں کی طرف دیکھا جن سے تعلق میں استواری تھی اور کلاس میں انہیں فرسٹ آنے کی عادت تھی۔اس سلسلے میں موریسن کورٹ کے بہاری دوست جو ہمیشہ چھوٹے موٹے نوٹس ہمیں نقل کرانے کے کام آتے تھے،اب مستعدی سے ہمیں کوچ کرنے لگے۔سید شفیع (موضع سانہہ کے) نے ہمارا چارج لے لیا ۔وہ ہمارے قریبی دوست بھی تھے اور سچے خیر خواہ بھی اور سید علی امام نے آرگینک کیمسٹری (Organic Chemstry) اور طٰہٰ میاں نے فزکس کا ذمہ لے لیا۔

ہماری نئی بستی کے ساتھی سید ظفر احمد نے اپنے خوبصورت سلیقہ سے لکھے ہوئے نوٹس پیش کر دیئے کہ ہم آسانی سے نقل کرلیں۔غرض بہت سے دوستوں کی دریادلی سے بہت کچھ امتحان کے لئے جمع ہو گیا لیکن سائنس کا ذوق نہ پیدا ہو سکا۔ہم سائنس کی کتابوں اور نوٹس کی کاپیوں کو شعروں اور انشائیوں سے سجاتے رہے۔

ہمیں تمام سائنس کی کتابوں کی یہ بات پسند تھی کہ اس میں حل کئے ہوئے بہت سے مسائل مثالوں کی شکل میں موجود تھے جو ہم لیٹ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مطالعہ کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہمارے مذاق کا معاون ہمارے کمرے کا ماحول تھا۔جس میں قائد انقلاب کامریڈ اشتیاق محمد خان درسی کتابوں سے بے نیاز رہ کر امتحان میں تھرڈ ڈویژن کی اور کمیونسٹ انقلاب میں فرسٹ ڈویژن کی تیاری کر رہے تھے اور ان کے کامریڈ دوست نئی انقلابی فتوحات کے افسانے لے کر ہمارے کمرے کو کافی ہاؤس کی جگہ استعمال کرتے تھے۔

انہیں دنوں طرحی مشاعرہ یونین میں ہوا،جس کا مصرع طرح تھا۔

انقلابات نگاہوں میں مچل سکتے ہیں

سید شفیع نے ہر چند ہمارے ذہن کے خلاف یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ہم اس مشاعرہ میں شریک نہ ہوں گے اور امتحان کی تیاری جاری رکھیں گے۔لیکن ہماری داد فریاد پر وہ کچھ پگھلے اور خود بھی ہماری نگہداشت کے لئے یونین پہنچ گئے۔پتہ نہیں کیسے ناظم مشاعرہ نے ہمارا نام پکار دیا اور ہم جو اشعار کاغذ پر سید شفیع کے خوف سے نہ لکھ سکے تھے اور دماغ میں وہ جگہ پا گئے تھے،ان کو وہاں جا کر پڑھ دیا۔

آؤ تیاری ہنگامۂ فردا کرلیں
امتحانات کہیں آکے بھی ٹل سکتے ہیں
اک طرف مشق سخن دوسری جانب سائنس
یعنی عابدؔ میاں ہر رنگ میں ڈھل سکتے ہیں

اس گم نام شاعر کو افکار اور جذبات کے سبب ایسی داد ملی کہ وہ ہمیں باقاعدہ شاعر بنا سکتی تھی، لیکن اباجان کی نصیحت ''شعر کا عروج علم کا زوال ہوتا ہے'' اور دادے ابا (مولانا منصور انصاری) کی وصیت کہ ''عابد میاں کو عظیم سائنس دان بنانا ہے'' ہمارے آڑے آگئی۔ ذوق نے کچھ شعر کہلا لئے اور بے ذوقی نے سائنس داں نہ بننے دیا۔ غرض دونوں ہی میدان ہاتھ سے نکل گئے۔

بالآخر وہ شام آگئی جس کا خوف تھا۔ صبح حساب کا پرچہ تھا اور ہم شفیع میاں کی ساری کوششوں کے باوجود حل کئے ہوئے سوالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ پرچے میں سوالات اکثر تو آسان تھے لیکن ہمارا فارمولہ اس پر چسپاں نہیں ہو رہا تھا۔ غرض الجبرا(Algebra) اور ٹرگنامیٹری(Trignometry) کا پرچہ جس پر ہمیں نوے فیصدی بھروسہ تھا صرف ۱۰-۱۵ فیصدی ہماری امیدوں کو پورا کر سکا۔ ہم نے کمرے پر آخر پوری رجائیت سے یہ فیصلہ کیا کہ اب ہم اگست میں حساب پڑھ کر سپلیمنٹری میں دوبارہ امتحان دیں گے۔ اس یقین دہانی نے پرچہ خراب ہونے کے غم کو غلط کر دیا لیکن ہمارے پڑوسی احمد حسن نے ہمارے پلان کو درہم برہم کر دیا۔ انھوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ٹیوشن پڑھا کر رات بھر درس دیں۔

احمد حسن ''رطلام اسٹیٹ'' کے رہنے والے تھے، تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے۔ تعلیم کے لئے مالی وسائل نہ تھے، اس لئے لگاتار ٹیوشن کرتے تھے۔ غالباً کچھ پس انداز کر کے گھر بھی بھیجتے تھے۔ ہماری اور ان کے مزاج میں بظاہر ایک ہلکا سا فرق تھا لیکن دراصل وہ بنیادی فرق تھا جو انجینئر اور شاعر میں ہوتا ہے۔ وہ ٹھوس شخصیت کے علمی انسان تھے، وہ جو کچھ کر رہے تھے، اس میں انہیں پوری دلچسپی تھی۔ علی گڑھ اس سلسلہ میں جو سہولتیں فراہم کر رہا تھا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ ہماری نرم و گرم شخصیت اپنے مذاق سے جنگ کر رہی تھیں اور علی گڑھ جو سہولتیں پیش کر رہا تھا ان کا ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے۔

احمد حسن ہمیں تسلی دلا کر اپنی ٹیوشن پڑھانے چلے گئے اور ہمیں ایک کشمکش میں مبتلا کر گئے۔ وہ اچھے ٹیوٹر ہو سکتے تھے لیکن جادوگر یا ولی تو نہ تھے کہ رات بھر کی جھاڑ پھونک سے علوم ظاہرہ کو باطنہ بنا سکتے۔ ہمیں نیند تو کیا آتی، ان کے حکم کے مطابق لیٹ کر آنکھیں بند کر کے کروٹیں بدلتے رہے،۔ احمد حسن رات کے ساڑھے بارہ بجے اپنی ٹیوشن پڑھا کر آئے۔ ہم سوچ سوچ کر نڈھال تھے مگر وہ تازہ دم لگ رہے تھے۔ پھر وہ ہمیں لے کر بیٹھے۔ ہماری ایک سادہ مجلّد کاپی پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھ کر فرمایا:۔ "کیل کیولس (Calculus) اور انٹگریشن (Integration) میں آپ کیا جانتے ہیں؟"

"کچھ نہیں!" ہم نے پورے یقین سے حقیقت پسندانہ جواب دے دیا۔

"تب تو بہت اچھا ہے۔" انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "دراصل جو کچھ جانتے ہیں وہ اسے بہت کچھ سمجھتے ہیں اور انکی یہ سمجھ ان کے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔"

ہم ان کی بات تو نہ سمجھ سکے لیکن ہم نے سمجھداری سے سر ہلا دیا۔

انہوں نے پھر نصیحت کی۔ "اب تک جو پڑھا ہو وہ ذہن سے نکال دو اور جو میں پڑھاؤں صرف اس پر توجہ دو۔"

پھر انہوں نے دونوں مضامین کی تعریف اور مختصر تعارف سے شروع کر کے جستہ جستہ کورس پورا کرا دیا۔ علی الصبح ہم کو متوقع سوالات کا اعادہ کرا دیا اور امتحان گاہ جاتے جاتے دعائیں دے دیں۔ ہم نے رات کی نیند کے خمار کو وضو اور نماز فجر سے دور کیا، چائے کے آزمودہ نسخۂ کیمیا کو داخل معدہ کیا۔ حضرت موسیٰ کی وہ دعا جو فرعون وقت کے دربار میں پڑھتے ہوئے وہ داخل ہوئے تھے (ربّ اشرح لی صدری ،اے میرے ربّ! میرے سینے کو انشراح عطا فرما!) ہم پڑھتے ہوئے امتحان گاہ میں داخل ہوئے۔ اور پرچہ کھولا تو گمان یقین میں بدل گیا۔ احمد حسن نے جو کچھ ضروری کہہ کر اعادہ کرایا تھا وہ بعینہٖ پرچے میں لکھا تھا۔ اگر پورے سال پڑھا ہوتا تو نصف گھنٹہ میں پرچہ حل کر دیتا۔ لیکن اٹک اٹک کر بھی وقت

سے پہلے پرچہ ممتحن کے حوالے کر کے نکلے تو احمد حسن میرے استقبال کیلئے دروازے پر کھڑے تھے۔انہوں نے ہمیں ایسی طرح لپٹایا جیسے ہمارے پنجابی احباب اب ہم سے عید ملتے ہیں۔یعنی ہڈی پسلی ایک کردیتے ہیں ہم نے نوے فیصدی پرچہ صحیح کیا تھا۔

اس کے بعد مرحلے اتنے مشکل نہ تھے لیکن اورگینک کیمسٹری Organic (Chemistry) کے فارمولے جو شہد کے چھتوں کے مشابہ لگتے تھے،سید علی امام کے ذریعہ حل کراتے تھے اور امتحان کی رات میں انہوں نے ہماری دوسری کاپی سیاہ کر کے پورے مضمون کا اور اہم موضوعات کا اعادہ کرادیا تھا،اب بھی ان کانسخہ ہمارے کام آگیا لیکن وہ خود کنفیوز ہوگئے۔ہم نے امتحان پاس کرلیا ان کا سپلیمنٹری آگئی۔دوسرے سال ان کی سپلیمنٹری کے وقت ہم نے ان سے معاونت کی بہت کوشش کی لیکن انہیں ہم سے فاصلہ رکھنے میں اپنی عافیت سمجھی اور امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔

امتحان کے بعد سب سے بڑا مرحلہ کسی گھر کی تلاش تھی،جہاں ہم جیسے بے خانماں کو گرما کی تعطیلات میں پناہ مل سکے۔ڈیوٹی سوسائٹی کے معتمد جناب معید خان(المعروف بہ لاحول ولا) کی نگاہ انتخاب عزیز احسن(مارہروی)،سید آصف علی(کانپوری)اور اس خاکسار پر پڑی۔انہو ں نے اس سال علی گڑھ کے چندہ کیلئے حیدرآباد کا انتخاب کیا تھا،ہماری دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔

حیدرآباد برصغیر کی اسلامی تہذیب کا عطر مجموعہ تھا۔ابھی وہاں ہمارے خاندان کا بھی کچھ حصہ مقیم تھا،وہاں کے بہت سے طلباء علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے،ہمیں ان کو میزبانی کا شرف بھی دینا تھا۔ظہیر الدین علوی صاحب نے ہمیں جامعہ اردو کا نمائندہ بنادیا اس کے فوائد کا علم وہا ں کے پورے قیام میں ہوتا رہا۔حیدرآباد کی یادیں آج بھی روشن ہیں اور وہاں کے کھٹے میٹھے ذائقے کام ودہن میں محفوظ ہیں۔شکاگو شریف کے قیام نے ان یادوں کو مزید اجاگر کردیا ہے۔ اب حیدرآباد کی باتیں بشرط عمر واصرار مسعود حیدر صاحب آئندہ کے لئے ملتوی کرتے ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

علی گڑھ میں دوسرا سال
تعطیلات موسم گرما ۱۹۵۳ مئی جون جولائی

انبہٹہ پیرزادگان آمد:

میں سیکنڈ ایر کا امتحان دے کر علی گڑھ سے انبہٹہ پیرزادگان کس طرح پہنچا اس کا بیان مشکل ہے۔ سفر خرچ اس بار بھی چندہ سے پورا ہوا۔ سہارنپور سے انبہٹہ کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اتنے پیسے بچے کہ سہارنپور سے اسٹیٹسمین اخبار اور پھنپوری کے بنئے کی دکان سے بھنے چنے کی دال بطور تحفہ (گھر والوں کے لئے) لے سکوں۔ بھائی جان (مولانا احمد میاں صابری) اور بھائی عطن (مولانا عطا الرحمٰن قدسی) اپنی دارالعلوم کی طالب العلمی کے زمانے میں یہ دال خرید کر لاتے تھے تو اس کی تقسیم محلہ پڑوس تک ہوتی اور ان کا سر افتخار سے بلند ہو جاتا تھا۔ ان دونوں کے اور میرے معاشی حالات میں زیادہ فرق نہ تھا۔ بھائی جان کے والد (مولوی موسیٰ) کا انتقال ہو چکا تھا اور شادی عین عنفوان شباب میں ہو گئی تھی، اس لئے لائی ہوئی دال کی ان کی بیگم اور سسرال کی وجہ سے قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔ بھائی عطن کی والدہ (شمسی بیگم) اور دو بہنیں (سلمیٰ اور حمیدہ) حیات تھیں اور ہندوستان میں تھیں۔ اس لئے ان کی دال قدر و قیمت میں مرغی کے برابر ہو جاتی تھی۔ میری دال بہت پتلی تھی پھر بھی کچھ دیر کے لئے یہ میرا سر بھی فخر سے بلند کر دیتی تھی۔

پروفیسر ہادی حسن صاحب کی نصیحت:

انبہٹہ میں حسب توقع استقبال ہوا اور میں اپنے گھر، اپنی (رشتہ کی) خالاؤں، اقرباء اور دوستوں کے حلقوں کی صبح و شام کی گردش میں آ گیا، ذہن بالکل صاف تھا۔ میں سیکنڈ ائیر پری انجینئرنگ کا امتحان دے کر آیا تھا۔ اور یہ طے کر لیا تھا کہ اس بار تعطیلات میں پڑھ لکھ کر فاضل ہو جاؤں گا۔ میں نے جس بے دلی سے امتحان دیا تھا اس میں فیل ہونا یقینی

تھا۔میرا ارادہ تھرڈ ایئر آرٹس سے اپنا پروگرام شروع کرنے کا تھا،اس لئے میرے پاس فیل ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ میرے فیل ہونے کی ساری کوششیں رائگاں گئیں اور میں پاس ہوگیا۔

پروفیسر ہادی حسن نے اپنی ایک تقریر میں ایسی صورت حال کے بارے میں فرمایا تھا۔

''تم نے کیا پڑھا؟''

''کچھ نہیں!''

''کیا سمجھا؟''

''کچھ نہیں!''

''کیا سیکھا؟''

''کچھ نہیں!''

''کن کھیلوں میں شرکت کی؟''

''کسی میں نہیں''

''کسی ڈبیٹ میں تقریر کی''

''کسی میں نہیں!''

''امتحان پاس کرلیا؟''

''جی ہاں کرلیا!''

''اب کیا کروگے؟''

''پاکستان جاؤں گا!''

''کیوں؟''

''آپ تو جانتے ہیں سر،ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں!'

بھابی عابدہ کی جستجو:

ہمیں ابھی اپنے مستقبل کی فکر نہیں تھی اور ہمارا پاکستان جانے کا ارادہ بھی نہ تھا۔ لیکن بعض بزرگوں کو ہمارے مستقبل کی بہر حال خاص فکر تھی۔ ان فکر مند خواتین میں بھابھی عابدہ (بیگم بھائی عطن) بھی تھیں جنہوں نے اپنے خاص تعلق کے تحت شادی کی ذمہ داری کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لئے تھے۔ انہوں نے ہر چند کہ ذرائع ابلاغ میں اختصاص حاصل نہیں کیا تھا لیکن ان کے قدرتی زبان و بیان نے ہماری شخصیت میں چار چاند اور آٹھ خوش رنگ پھول لگا دیئے تھے جن گھروں میں لڑکیاں تھیں وہاں ہمارا استقبال بھی کچھ دامادوں والا ہونے لگا تھا۔ بھابھی عابدہ نے ہمیں سخت تنبیہ کر دی تھی کہ: ''خبر دار جو تم نے میری پسند کی لڑکی کے علاوہ شادی کی ہو۔''

اس کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ ان کی شادی جس انداز سے بھائی عطن سے ہوئی تھی اس کے بارے میں متعدد قصے مشہور تھے۔ انہوں نے اپنی محبت اور دانائی سے بھائی عطن کا دل دماغ تک ٹوپی سمیت جیت لیا تھا لیکن اپنی ساس (سگی خالہ) اور نند (آپا حمیدہ) کی زبان کا مقابلہ مصلحتاً نہ کر پاتی تھیں۔ مجھ سے انہیں بہت امیدیں تھیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا دیا تھا کہ وہ خود بھی بھائی عطن کے لئے میری واحد پسند تھیں۔ میری اس بات کا انہوں نے یقین بھی کر لیا تھا۔

بھابھی عابدہ اپنے شوہر کے پیش دستے کے طور پر کلکتہ سے اپنے میکے رامپور (منیھاران) آ چکی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ سسرال سے بلاوا آئے یا کوئی لینے آئے تو وہ عزت سے آئیں۔ مگر یہاں سے کوئی پر جوش یا رسمی استقبال کے لئے تیار نہ تھا۔ نانی جان کے سامنے یہ مسئلہ آتا تھا تو وہ فرماتیں ''میاں وہ بڑے خاندان کی لڑکی ہے، مارے باندھے آ بھی گئی تو یہاں کب اس کا دل لگے گا۔ وہ انتظار میں ہے کہ شوہر آئے گا تو پھر سے ڈولا لے کر جائے گا تو وہ براجمان ہوں گی۔''

ہمارا اقتصادی مسئلہ:

ہمیں بھابھی عابدہ کو لینے کے لئے جانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ کہ اس طرح کے سفر موسم گرما کی واحد دلچسپی تھے۔ دوسرے بھابھی عابدہ نے اکثر ذکر کیا تھا کہ رامپور کے بعض خاندانوں میں انہوں نے پہلے ہی بات چھیڑ رکھی ہے وہ ہمیں دیکھنا بھی چاہتے ہیں اور جلد فیصلہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہر چند اس طرح کا فیصلہ ابھی ہمارے حساب سے کم از کم آٹھ دس سال دور تھا لیکن ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے'' کے زمرے میں تھوڑی بہت تا کا جھانکی میں اپنی قدر و قیمت کے اندازہ کرنے کا موقع بہر حال تھا۔

تیسرا اہم مسئلہ اقتصادی نوعیت کا تھا۔ علی گڑھ سے انبہٹہ تک کے سفر میں ہمارا چشمہ ناکدان سے درنیم ہو گیا تھا۔ اور اس کی مرمت کے لئے دو روپیہ درکار تھے۔ جس کا ملنا کارے دارد تھا۔ ہم نے سوچا اگر یہ سفر کا موقعہ میسر آئے گا تو ہوسکتا ہے کہ سفر خرچ سے کسی طرح دو روپے نکل آئیں جو ہماری شخصیت کے اس اٹوٹ انگ کو ہم پھر سے جوڑ دیں۔ یوں بھی چوندھی چوندھی آنکھیں لے کر مستقبل کی سسرالوں کا چکر خطروں سے خالی نہ تھا۔

اگر چہ ہمارے نانے ابا ہمیں بے اختیارانہ چاہتے تھے لیکن ان کا ذریعہ آمدنی محدود سے محدود تر ہو رہا تھا۔ پاکستان سے بھائی جان (احمد میاں صابری۔ پوتے) جو ماہوار خرچ بھیجتے تھے وہ بند ہو چکا تھا۔ کھیت کسانوں کی ملکیت میں چلے گئے تھے۔ رادھن پور ریاست کا وظیفہ بمدِ پیرزادگی و سجادگی (درگاہ سید حافظ علی صاحبؒ) ریاست کے ہندوستان کے انضمام کے ساتھ منقطع ہو گیا تھا۔ چند دکانوں اور مکانوں کی آمدنی اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ بھائی عطن نے کلکتہ سے والدہ کے نام پچاس روپیہ ماہوار کا خرچ (اپنی نصف تنخواہ) مقرر کیا تھا جو ہر چند کہ گھر ہی میں خرچ ہوتا مگر وہ ان کی والدہ کی تحویل میں تھا اور ان کے ہی ہاتھ سے خرچ ہوتا تھا۔ بعد میں تنخواہ کے اضافے کے ساتھ یہ سو روپیہ ہو گیا تھا۔ اور اس سے گھر کی آسودگی اور نانی جان کے خانگی رسوخ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے روایتی ماحول میں ایسا شاذ و نادر تھا کہ کوئی عورت مرد پر اقتصادی برتری حاصل کرے جبکہ امریکہ میں یہ عام تجربہ ہے۔اس اقتصادی برتری کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے مرد کی فضیلت ختم کر دی۔قرآن نے مرد کو فضیلت اس لئے عطا کی تھی کہ وہ اپنا مال عورت پر خرچ کرتا ہے۔اقتصادی طور پر یہ فضیلت عورت کو بہت کم حاصل ہے لیکن مرد اور عورت کے DNA میں آج کے ماحول میں تصادم پیدا ہو گیا ہے۔اور اس تصادم میں صرف ازدواجی تعلقات ہی متاثر نہیں ہو رہے ہیں بلکہ گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ ہمارے گھر پر بھی اس اقتصادی برتری کا اثر تھا۔جو سرد اور گرم جنگ کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا تھا۔اور میں خواہی نخواہی اس کی زد میں آجاتا تھا۔

میرے لئے یہ موسم گرما کی تعطیلات اہم تھیں کہ اس میں میں نے اپنے لئے مستقبل کا تعلیمی پلان بنایا تھا۔میں نے میز پر سائنس کی کتابیں حسب سابق سجائی تھیں۔ اور پڑھنے کے لئے پلان بنا رہا تھا۔جس کے لئے میز کرسی کی ضرورت نہ تھی۔بس آوارہ گردی کی تھی جو ہمیں وافر مقدار میں حاصل تھی۔

نانے ابا کی دلجوئی اور میری بے بال و پری:

نانے ابا کو میرے حیات بعد الممات کی فکر تھی۔میرے سر کے انگریزی بال مونڈھوں تک آگئے تھے۔خالہ امت المنان منجملہ اور ناموں کے (بیڈھنگا،اندھا پیرزادہ) کے مجھے جھبرا بھی کہتی تھیں۔میں خالو یامین صاحب (ریٹائرڈ تحصیلدار) کے گھر سے اسٹیٹسمین لاکر پڑھا کرتا تھا،نانے ابا کو یہ بات بھی ناپسند تھی کہ گھر میں انگریزی کا اخبار آئے اور اس میں تصاویر بھی ہوں۔فرشتے نہ آنے کا نظریہ تو مستند تھا،اس سے بے برکتی بھی یقینی تھی۔

انہوں نے ایک بار پھر سعی لا حاصل کی کہ انگریزی چھوڑ کر دارالعلوم دیوبند چلا جاؤں یا کم از کم انگریزی اخبار گھر میں نہ لاؤں یا اس سے بھی کمتر یہ کہ میں سر کے بال گھٹالوں۔ان کے اس مشورہ پر نانی جان برہم ہو گئیں۔''اجی تم اپنے سر کا جو چاہے کرو لیکن

خبر دار جو میرے بچے کے سر پر اُسترا اور گٹھلی پھروائی ہو۔"

پھر بھی مجھے شفقت آمیز نظروں سے دیکھ کر فرمایا: "اگر تو نے سر گھٹایا تو تجھے اس گھر میں نہ داخل ہونے دوں گی۔"

منڈے سر پر آم کی گٹھلی پھرانا ہمارے حجام چچا عبداللہ کا مجرب نسخہ تھا۔ وہ قلمی آم کی گٹھلی کو لمبائی سے ۳/۱ حصہ تراش کر اس کے اندر کا بیج نکال دیتے تھے پھر اسے دھوپ میں سکھا کر پختہ تر کرتے۔ پھر اس کو قلم شدہ جانب سے سر پر ٹہلاتے۔ اس میں سر کی خشکی جمع ہو جاتی۔ جسے وہ بار بار جھٹک دیتے۔ اس سے روح کو انبساط دماغ کو تازگی اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی۔

نانی جان کے بہت سے موڈ تھے۔ ان کا ذکر بچپن کی یادداشتوں میں گزر چکا۔ ان کی محبت بھی پر خلوص تھی اور غصہ بھی آندھی طوفان تھا۔ گھر میں سر گھٹا کر نہ گھسنے کی بات انہوں نے دراصل میرے سر کے دفاع میں کہی تھی۔ جمعہ کے دن حسب معمول عبداللہ حجام آیا اور اس نے نانے ابا کے سر پر مشین پھرائی پھر ڈاڑھی کو فقہ حنفی کی حدود، ایک مشت دو انگشت میں لا کر سنوارا۔ مونچھوں کو تراش کر سنت نبوی کے مطابق غیر محسوس بنا دیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ نانے ابا نے اس وقت نانی جان کے مقابلے میں ہمت کرتے ہوئے اور میری عاقبت کی فکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا: "بیٹا سر پر تم بھی مشین پھروالو۔" شاید وہ قبولیت کا وقت تھا کہ میں نے سر تسلیم خم کر کے کہا: "عبداللہ چچا، سر پر استرا پھیر دو اور اس کے بعد آم کی گٹھلی۔" عبداللہ نے ہنس کر انکار کر دیا اور نانا جان نے نرمی سے فرمایا:

"مشین پھرنے سے سنت کی تکمیل ہو جائے گی استرے اور گٹھلی کی ضرورت نہیں۔"

لیکن اس وقت اس معاملے میں شریعت کی نرمی میرے دماغ کی گرمی کے جوش کو کم نہ کر سکی۔ اور میں نے عبداللہ چچا کے سامنے سر جھکا کر کہا: "نہیں چچا استرا پھیرو۔" عبداللہ نے ہاتھوں سے استرا سر پر رکھ کر میری خواہش کی تصدیق مزید کی کہ ایک بار استرا

پھرنے کے بعد وہ ان بالوں کو واپس سر نشین نہیں کر سکتے تھے۔استرا چلا تو اس نے نانا ابا کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کو شرف قبولیت بخش دیا تھا اب دوسرا قدم ان کے ذہن میں واضح تھا کہ میں علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر دارالعلوم دیو بند چلا جاؤں۔

سر کے بال کٹنے کے بعد آم کی گٹھلی کی باری تھی۔سر سے بال اترنے سے ایک عمر کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور موسم گرما ہونے کے باوجود تازہ ہواؤں کے جھونکے سر کی چمپی کر رہے تھے کہ گٹھلی نے سر کے مختلف حصوں کا طواف کر کے تراوٹ کو دماغ کے پوشیدہ ترین گوشوں تک پہنچا دیا۔عبداللہ گٹھلی پھیر کر اسے چٹکی مار کر فرش پر جھٹکتے تھے تو اس میں سے سر کی خشکی کا برادہ کچھ زمین پر گرتا تھا کچھ ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔اور کچھ ناک کے ذریعہ دماغ میں واپس داخل ہونے کی کوشش کرتا تھا۔یہ حجامت ایسا روحانی تجربہ تھا کہ اس کو انسانی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔گوتم بدھا نے نروان کے بارے میں فرمایا تھا:''آؤ اور خود تجربہ کرو'' اس عمل کی لذت الفاظ سے ادا نہیں کی جا سکتی ہے۔سر گھٹا کر گٹھلی پھروانا چھوٹا موٹا نروان ہے جس کا لطف بغیر تجربے کے حاصل نہیں ہوتا۔

سر منڈا کر اولے پڑنا:

حجامت کے بعد عبداللہ نے بالوں کو بے دردی سے گھر کے دروازے سے متصل کوڑے پر جھٹک کر اپنے رومال کو ہوا میں کئی بار لہرایا اور ہمارے بالوں کا حال کیا بتائیں؟

اڑالی بلبلوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اس راستے سے دن بھر خواتین بھی گزرتیں وہ ان بالوں کو حسرت سے دیکھتیں۔ ان میں ہماری خالہ امت المنان بھی تھیں۔وہ جہاں جاتیں یہ خبر دیتیں کہ پتہ نہیں کس جھبرو کے جھبرے جھبرے بال ہوا میں اڑ رہے ہیں۔حجامت بافراغت پایۂ تکمیل کو پہنچی تو میں جلتو جلال تو پڑھتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔جہاں نانی جان نے دیکھتے ہی مصنوعی غصہ کے آثار

پیدا کر کے کہا: ''خبیث میں نے تجھے منع کیا تھا کہ یہ چٹیل میدان کرا کے گھر میں نہ گھسنا، اب تو نے کرا ہی لیا ہے تو تو میری صورت کے سامنے سے ہٹ جا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنا چپل میری طرف اس طرح پھینکا کہ وہ ۴۵ ڈگری کے فرق سے جا کر دور گرا۔ نانا جان کو بھی دن بھر نصیحت فضیحت رہی۔ مگر وہ اپنی کامیابی پر مسرور تھے۔

میں دن بھر جدھر بھی گیا وہاں ہائے ہائے اور واویلا مچ گیا۔ اور ہمارے سر پر پتہ نہیں کتنے لوگوں نے ٹھینگہ شہادت کی انگلی کو موڑ کر اس کے پیچھے ہڈی والے حصے کے گنجے سر پر ضرب کاری لگائی۔ ان ٹھینگہ مارنے والوں میں ہمارے شفیق بزرگ شاہ مقصود احمد صابری (سجادہ نشین) بھی تھے جنہوں نے ایسا روایات کی پاسداری میں کیا۔ پھر ہومیو پیتھک کی مجرب دوا دیکر کہا اس سے گنجوں کے بال نکل آتے ہیں اور یہ بے عقلوں کو عقل سکھا دیتی ہے۔ تم کھاؤ پہلے سے زیادہ بال نکلیں گے۔

اسی شب اس گھٹے سر کی برکت سے ایک اور دلچسپ تجربہ ہوا۔ میں دن بھر خالہ امت المنان سے منھ چھپائے رہا۔ رات میں ان کے گھر پہنچا تو وہ ٹمٹماتی لالٹین کی بتی کو نیچا کر کے (تیل کم خرچ کرنے کی غرض سے) نماز عشاء میں مشغول تھی لیکن سفید چادر سے سجا ہوا بستر دعوت استراحت دے رہا تھا۔ خالہ بڑی سلیقہ کی خاتون تھیں۔ زندگی کا ہر شعبہ وہ منظم رکھتیں تھیں جسے میں اکثر ان کے گھر جا کر درہم برہم کر دیتا تھا۔ اسی نسبت سے وہ مجھے بیڈھنگا کہتی تھیں۔ میں اتنا بیڈھنگا عام زندگی میں نہ تھا لیکن ان کو سچا ثابت کرنے کے لئے میں جس قدر تھا اس سے زیادہ ہی بن جاتا تھا۔ ان کے بستر پر میرے علاوہ کسی کو لیٹنے کی تو کیا بیٹھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ میں نے ان کے نماز میں انہماک سے فائدہ اٹھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ سر پر نانا جان کی کپڑے کی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ انہوں نے سلام پھر کر اس نیم اندھیاری میں دیکھا کہ کوئی ان کے بستر پر براجمان ہے۔ وہ سمجھیں ہمارے ہم عمر میاں عباس ہیں۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہوئی نصف نماز سے اٹھیں کہ میاں عباس کو اپنے

پاکیزہ بستر سے ہٹائیں اور قریب آ کر معلوم ہوا کہ وہ ان کا بیڈھنگا ہے۔ میں نے سر سے ٹوپی ہٹادی۔

اچانک ان کا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ اول تو وہ سکتہ کے عالم میں آ گئیں پھر وہیں پلنگ کی پٹی پر دل پکڑ کر بیٹھ گئیں ''ہائے عابد تو نے یہ کیا کیا؟ کیسا میرا جھبرا سا پھرے تھا۔ ہائے میں صبح سے وہ بال کوڑے پر بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں۔ مجھے کیا پتہ یہ بال میرے جھبرے کے ہیں۔'' میرے تسلی دینے سے بھی ان کی تشفی نہ ہوئی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں پھر راغب الی اللہ کر کے نماز کی شکستہ نیت بندھوائی۔ اور میں پھر ان کی ہلکی چادر اور نانا ابا کی دو پلی ٹوپی اوڑھ کر لیٹ گیا اور ستارے گنتا رہا۔ میری کزن (ذرا دور کی) رئیسہ بی داخل ہوئیں۔ ان کا مجھ سے سخت پردہ تازہ تازہ ہوا تھا۔ بلوغ میں داخل ہونے والی خوبصورت لڑکیوں کا شروع شروع کا پردہ بہت سخت ہوتا ہے۔ رئیسہ بی نے پہلے تو سلام کیا میں نے دھڑ مار لیا آنکھیں بند کر لیں وہ سمجھیں ماموں شریف (خالہ بی کے بڑے بھائی) آرام فرما رہے ہیں۔

رئیسہ بی اور ان کی سب بہنیں خدمت اور محبت میں بے مثال تھیں۔ انہوں نے فوراً ثواب کمانے کی آسان ترکیب سوچی۔ میرے پائیتا نے بیٹھ کر انہوں نے ماموں شریف کی پنڈلی سمجھ پاؤں دبانے کے لئے ہاتھ رکھا تو اس کی دبازت سے اندازہ ہوا کہ ان کے ہاتھ کسی اور کی ٹانگ پر ہیں، میں نے آنکھیں بند رکھیں اور ٹوپی ہٹا کر دعاء دی، ''جیتی رہو بیٹی اللہ چاند سا دولہا دے۔'' رئیسہ دعا کیا سنتیں بجلی کی مانند ہائے اللہ کہتی ہوئی بھاگیں تو دروازے سے ٹکرا گئیں۔ سر سے خون جاری ہو گیا مگر اپنے گھر جا کر دم لیا۔ دوسرے دن میں نے عیادت کی تو معلوم ہوا کہ درد کی تکلیف سے پردہ ٹوٹنے کا زخم زیادہ گہرا تھا۔ ہر چند میں نے یقین دلایا کہ ان کا پردہ بدستور باقی رہا۔ نہ میری آنکھوں پر چشمہ تھا نہ خالہ بی کہ لالٹین میں روشنی۔

رئیسہ بی چھ بہنوں کی سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ ان کے والدین مرحومین میں تھے۔ والد دماغی طور پر کمزور تھے اور بازیچۂ اطفال بنے رہتے تھے۔ ان کی والدہ ان کے والد کی پھوپی زاد بہن تھیں اور پانی پت کے علماء اور قاریوں کے مشہور خاندان سے تھین۔ وہ علم، ذہانت اور فطانت اور سلیقہ مندی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ایسا شوہر جسے پورا شہر دیوانہ سمجھتا تھا ان کی نگاہ میں سر تاج، گھر کی عزت اور خاندان کی عظمت کا نشان تھا۔

جب ماموں عقیل باہر سے لڑ بھڑ کر اور نادان لوگوں کے حملے سہہ کر گھر میں گھستے تو ممانی ان کا استقبال کرتیں۔ عزت سے بٹھا کر سمجھاتیں:

''یہ لوگ جاہل اور دیوانے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ اتنے سمجھدار اور عقل مند ہیں۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیوں پرواہ کرتے ہیں۔'' پھر عقیل ماموں کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ اور ان کا ذہن اپنی بچیوں کے مستقبل کی طرف لگ جاتا۔ دونوں والدین بہت جلد رخصت ہوگئے اور اپنی بیٹیوں کو باپ اپنی وجاہت اور ماں اپنی ذہانت اور صبر کی میراث دے گئیں اور سب بہنوں کی شادی اوائل بلوغ میں ہوگئی، کثرت اولاد سے نوازی گئیں، تنگی معاش قسمت رہی لیکن انہوں نے اس تنگی کو کبھی ترشی میں نہیں بدلا۔

بھائی عطن: کماؤ پوت کا استقبال:

بال منڈانے کے بعد اولے پڑنے کا محاورہ سنا تھا اور اس کا تجربہ ہو رہا تھا کہ بھائی عطن کا کلکتہ سے خط آیا۔ اپنی آمد کی تاریخ لکھی اور یہ خواہش کہ: ''اگر عابد میاں جا کر اپنی عابدہ بھابھی کو رامپور سے انبیہٹہ لے آئیں تو مناسب ہوگا۔'' کماؤ پوت کا ہر لفظ، وہ بھی ایسے سپوت کا جو والدین کا سعادت مند ہوں۔ اور خاندان کے لئے ہیرا موتی ہو، والدین کے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے نانی جان کی خودداری اور ہچکچاہٹ کی ساری پیش بندیاں ڈیہہ گئیں اور مجھے حکم ہوا کہ بوریا بستر باندھوں اور فوراً رامپور ''لاڈلی صاحبہ'' کو لینے کے لئے جلد از جلد روانہ ہوں۔ یوں تو میرے لئے بہرحال یہ مژدہ جانفزا تھا اور یہ سفر بہت سے

مستقبل قریب وبعید کے روشن امکانات کا ضامن ہوسکتا تھا لیکن یہ خیال کہ اسی سفر خرچ سے کچھ پس انداز کر کے چشمہ سنور جائے گا، اس سفر کا اہم محرک تھا۔ ہم نے فوراً ہی رخت سفر باندھا۔ ایک مختصری پوٹلی میں ایک رسالہ، دو گھی چپڑی نکیاں، ایک جناح کیپ، ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان رکھا اور تیار ہو گئے۔

رامپور منیہاران (ضلع سہارنپور) مغربی یوپی کے ان مشہور ومعروف قصبات میں سے تھا جس میں ''اشراف'' یعنی: سادات، علوی، صدیقی، فاروقی، عثمانی اور انصاری بستے تھے۔ جنہیں اپنے خون، ہڈی، نجابت، شرافت پر ناز تھا۔ یہاں علماء کی بھی کثرت تھی لیکن شجرہ پر فخر وغرور اس ثمرہ سے کہیں زیادہ تھا جو اقوام عالم محنت سے حاصل کرتی ہیں، شریعت میں اسے اکل حلال کہتے ہیں۔ اکل حلال کمانے والی اقوام: جولاہے، تیلی، حجام، قصائی، سقے، دھنے۔ رنگ ریز وغیرہ اجلاف یا چھوٹی ذات'' کہلاتے تھے۔ اور وہ اشراف کے کنبے برادری کا حصہ نہ تھے۔ اشراف کی نسبت کا اندازہ ان کے حسن معاملہ یا عظمت کردار سے زیادہ ان کے لباس اور وضعداری سے ہوتا تھا۔

منو نے صدیوں پہلے دھرم بنایا تھا، جو ہندوؤں کا سماجی قانون (منودھرما شاسترا) ہے اس میں ان چھوٹی ذاتوں کا مقصد حیات بڑی ذاتوں کی خدمت تھا۔ انہیں بقدر سدرمق محنت کا معاوضہ زندگی نہایت عسرت سے گزارنے کے لئے مل جاتا تھا۔ اگلے جیون میں اسی جیون کے دھرم پالن کا بدلہ ضرور تھا۔ ہمارے علماء نے اسے کفو کے مسائل سے ملا کر اس سماجی ظلم کا شرعی جواز نکال لیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جو اقوام باہر سے آئے وہ تو اشراف ہیں اور ہندوستان کے جن اکل حلال کھانے والے پیشہ وروں نے اسلام قبول کیا وہ اجلاف ہیں۔ ہندو جن اقوام کو اچھوت سمجھتے ہیں وہ مسلمانوں کے بھی اچھوت ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلمان قرآن ناظرہ پڑھا ہے جس کے معنی مفہوم سے وہ واقف نہیں لیکن عمل اس کا منودھرما کے مطابق ہے۔

عشق کی دنیا میں یہ پہلا قدم:

ہم نہ صرف بھائی عطن کی سسرال جا رہے تھے بلکہ اس کا بھی کمزور سا امکان تھا کہ بھابھی عابدہ کے بقول وہاں، ہماری سسرال بننے کے بھی امکانات روشن تھے۔ اس لئے ہم نے ننھے دھوبی کے گھر جا کر کرتے پاجامے شیروانی پر کلف لگوا کر کر استری کروائی۔ پاجامہ پر کڑک استری نے ظاہری شان پیدا کی تو آپا حمیدہ کے بُنے ہوئے کمر بند نے نیفے میں گھس کر پاجامہ کے باطنی حسن کو بھی دوبالا کر دیا۔ خالہ حمیدہ نے کئی برس پیسے بچا بچا کر یہ کمر بند بُنا تھا اور وہ خود محبت سے اپنے ہاتھ سے ہمارے پاجامے میں ڈالتی تھیں۔ رگھو موچی سے پشاوری چپل پر پالش کرائی پھر محلے میں گھوم پھر کر سب کو خدا حافظ کہا اور سفر بخیریت پورا ہونے کے لئے دعا کی درخواست کی۔ لوگوں نے مختلف پیغامات اعزاء کو کہلوائے اور خطوط کی پرزیاں باحتیاط رامپور کے اعزاء کو پہنچانے کے لئے دیں۔ کہا سنا معاف کرایا پھر ہم نے اپنا لباس فاخرہ شیروانی، ٹوپی، علیگڑھ کٹ پاجامہ اور پشاوری چپل زیب تن کیا اور آئینہ میں خود کو دیکھ کر مطمئن کیا۔ گھر والوں سے رخصت لی۔ نانے ابا نے اصرار کیا کہ وہ بس اڈے تک چھوڑنے چلیں گے۔ ان کو حیلوں بہانوں سے روکا۔ اپنے شکستہ چشمے کے دونوں حصے شیروانی کی اندر کی جیب میں حفاظت سے رکھے کہ ان کی سفر کی ایمرجنسی میں ضرورت پڑ سکتی تھی اور واپسی میں اسکی دوئی کو وحدت میں تبدیل کرنے کا امکان تھا۔

نانی اماں نے سفر خرچ کے بارے میں جملہ معلومات جمع کر کے ہمیں نہ صرف ہمارے ٹکٹ کا خرچ دیا بلکہ بہو کی واپسی کے ٹکٹ کے بھی دو روپے دیئے، اس ہدایت کے ساتھ: ''اگر وہ خود ادا کر دے تو بیٹے اسے احتیاط سے بچالانا۔ میرے پاس کہاں دولت کے خزانے ہیں کہ میں فضول خرچیاں کروں۔''

نانی اماں کنجوس نہ تھیں، جزرس تھیں۔ ہمارے اکثر گھرانے بہت کم آمدنی میں بڑے بڑے خرچ چلاتے تھے، خود اعزاء کی مہمانداری اور سماجی تقریبات مختصر آمدنی کا اکثر

حصہ لے جاتیں۔اسی جزرسی سے نانی جان نے تین لڑکیاں عزت سے رخصت کیں تھیں۔ اور کچھ پیسہ حج کے لئے پس انداز کرتی رہیں جوانہیں حاصل نہ ہوسکا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ثواب سے ضرور نوازا ہوگا۔

منزلِ شوق کا پیدل سفر:

انبیہٹہ سے رامپور چار میل کچے راستے سے تھا۔ پکے راستے سے بس کے ذریعے چالیس میل تھا۔انبیہٹہ سے بس سہارنپور لے جاتی اور وہاں سے رامپور کے لئے دوسری بس لینی پڑتی تھی۔کل مسافات اس طرح چالیس میل ہو جاتی اور کل سفر ٹکٹ مبلغ دو روپیہ بنتا۔ میں مبلغ چھ روپیہ جیب میں ڈال کر روانہ ہوا۔ جیب کی گرمی قلب تک پہنچ رہی تھی اور میرا دماغ ایک عظیم مہم کا پلان بنا چکا تھا۔ میں نے بمشکل نانا جان کو تیار کیا تھا کہ وہ موٹر اڈے پر میرے ساتھ نہ چلیں پھر میں میں نے موٹر اڈے کی طرف جاتے جاتے اس کچے راستے کی طرف رخ کرلیا جو مجھے پیدل رامپور پہنچادے گا۔ان دو روپیوں کی بچت سے میرے چشمے کی مرمت ہو جائے گی۔

صبح سہانا سماں آدھ گھنٹے بعد نصف النہار میں ڈھل گیا۔رامپور کا کچا راستہ کبھی پگڈنڈی میں بدل جاتا کبھی کھیتوں کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ چلتا۔جسم پسینہ سے شرابور تھا، نہ کوئی راہ نما تھا، نہ پرسان حال۔دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں تک کہ میں ایک نالے کے قریب پہنچا جہاں پانی اونچا تھا کسی پل کے آثار نہ تھے۔اب نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن کا مفہوم تھا لیکن اس مفہوم کو بھی کوئی سمجھنے والا نظر نہیں آرہا تھا۔

میں تھک ہار کر اس نالے کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور وہ تمام کہانیاں یاد کرتا رہا جو اس پیدل سفر کے متعلق اپنے بزرگ کزنس سے سنیں تھیں کہ راستے بھر وہ جھڑ بیری کے بیر کھاتے، کھیتوں سے گنے چراتے، آم کے باغات سے آم اپنے لئے خاص کرتے، رس کی چکی پر ٹھہرتے اور گاؤں والوں کی مہمان نوازی سے رس پی کر، راب

اور گرم گرم گڑ کھا کر فیضیاب ہوتے۔مگر ان کہانیوں میں سے میرے تجربے میں ایک بھی نہیں آئی۔ بیٹھے بیٹھے یکا یک چشمے کا خیال بھی آیا کہ وہ دو نیم میری شیروانی کی اندرونی جیب میں ہے۔اسے نکال کر ناک کے قریب لا کر جوڑا تو آنکھ تو کیا دماغ تک روشن ہو گیا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں میں کسان کام کر رہے تھے۔درختوں پر سچ مچ کے پتے اور آم لگے تھے اور چڑیاں بنفس نفیس بیٹھی گرمی سے گھبرا کر درختوں پر آرام کر رہی تھیں۔ان مناظر نے ہمت بڑھا دی۔

میں نے نزدیک کے کھیت میں جا کر کسانوں سے رامپور کا راستہ معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ میں راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں اتر آیا تھا۔انہوں نے رہنمائی کی اور میں الٹے قدموں صحیح راستے کی تلاش میں انبہٹہ پیر زادگان کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔ ایک منڈیر سے پاؤں پھسلا تو پشاوری چپل اس کی تاب نہ لا سکا۔اس کا تسمہ ٹوٹ گیا۔اس لئے انہیں پیر سے اتار کر ایک سڑک کے کنارے سے لکڑی اٹھا کر جھنڈے کی مانند بلند کر کے سر پر چڑھا لیا اور لکڑی کے ڈنڈے کو کاندھے کا سہارا دے دیا۔اب گرمی بے تحاشہ پڑنے لگی۔ اس لئے ٹوپی اور شیروانی کو میں نے اس دسترخوان میں باندھا جس میں گھی چپڑی روٹیاں رکھی تھیں اور روٹیوں کو ایک رہٹ کے پانی کی مدد سے معدہ میں منتقل کر دیا۔اب میں ہر تھوڑی دیر بعد چشمے کے دونوں حصوں کو جوڑ کر آنکھوں پر لگا کر کوئی رہنما ڈھونڈتا تھا اس میں سراسر زحمت تھی اس لئے میں نے کوئی بھی جتن اس چشمے کے دو حصوں کو مستقل جوڑنے کا کیا۔اور اس میں ناکامیاب رہا۔

یکا یک خیال آیا آپا حمیدہ نے دو سال کی اپنی بچت سے جس ازار بند کو بنا ہے اس سے کچھ دھاگے مستعار لے لوں۔اس کوشش اور کشمکش میں ازار بند پاجامے سے نکل گیا اور اس لق ودق تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پہلے تو اس ازار بند سے چند دھاگے کھینچے جس کے سبب وہ پورا بکھرنے لگا۔ بمشکل دھاگوں میں گرہ باندھ کر اس کو تھاما۔ درخت سے

تیلی توڑ کر اس کی مدد سے کمر بند واپس نیفے میں پہنچایا اور اس سے پہلے خود کو باندھا پھر چشمے کو اس طرح دھاگوں سے لپیٹا کہ وہ ناک پر تو رکھا رہے لیکن فوکس کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں کی ضرورت پڑے۔ بڑے پانچوں کا پاجامہ بھی میں نے جس قدر اونچا باندھ سکتا تھا باندھا۔ گرمی کے سبب ننگے پاؤں جل رہے تھے اس لئے بہت تیز قدم اُٹھ رہے تھے۔

راہ شوق کی دشواریاں:

راستے میں ایک گاؤں سے گزرا جہاں آم کے باغ میں بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے انہیں دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا لیکن وہ مجھے دیوانہ سمجھ کر ڈلے اٹھالائے اور اپنے کتوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔ میرے سامنے بجز فرار کے کوئی راستہ نہ تھا۔ کتوں کے پیچھا کرنے کی وجہ سے میرے دوڑنے کی رفتار کو اولمپک ریکارڈ تک پہنچا دیا۔ کتے سے میں نے ٹانگ تو بچالی لیکن پاجامے کا پائچہ اس کی زد میں آگیا۔ جوتے اور شیروانی کی بقچی میں نے جان کو خطرے میں ڈال کر محفوظ رکھی۔ میرے حواس اس قدر باختہ تھے کہ اگر زندگی میں کبھی خودکشی کو سوچ سکتا تھا تو یہی موقع تھا۔ میرے استقلال میں تو تزلزل نہ تھا البتہ یہ خیال تھا کہ میں سمدھیانے کس حال میں جا رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ سفر کا راز کھلنے پر بدنامی کا خطرہ تھا۔ یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ نانی جان بچی ہوئی رقم واپس نہ طلب کر لیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے ایک بزرگ مع ریش دراز سائیکل سوار آرہے ہیں۔ وہ میرے حال پر بے اختیار ہنستے ہوئے گزر گئے۔ وہ قریب سے گزر رہے تھے تو دو لمحے ٹھٹکے تھے مگر پھر آگے بڑھ گئے۔ میں نے چند لمحے رک کر جاتی ہوئی سائیکل پر نظر ڈالی تو وہ بھی رک کر پہلے کھڑے ہوئے پھر مسکرائے اور مخالف سمت یعنی انبہٹہ کی طرف چل دیئے۔

میں عجب کشمکش میں پڑ گیا کہ کہیں وہ بھائی احترام الحق نہ ہوں جو عابدہ بھابھی کے بھائی تھے اور پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ۱۹۴۶ء میں دولہا بنے ہوئے

دیکھا تھا۔ وہ ندوہ میں طالب علم تھے ابھی داڑھی شاید نکلی نہ تھی۔ اس وقت وہ مغلیہ شہزادے لگتے تھے۔ وہ نازوں کے پلے تھے۔ شدید پاکستانی تھے اس لئے خدمت اسلام کے جذبے سے مغلوب ہو کر فوراً پاکستان روانہ ہو گئے تھے۔ پاکستان نے سنا تھا ان پر وقت سے پہلے بڑھاپا طاری کر دیا تھا۔ کراچی کی آب و ہوا راس نہ آئی، لاہور کے جفاکش پنجابیوں کے سامنے بزنس میں وہ جم نہ سکے۔ تو انہیں گھر کی یاد آئی مگر تاریخ اپنا صفحہ پلٹ چکی تھی۔

مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ اگر وہ سچ مچ بھائی احترام الحق تھے تو اس سفر کا راز کھل جانے کا خطرہ تھا اور نانی جان کی آواز کان میں گونجنے لگی: ''میرا بیٹا پیدل رامپور گیا اور ماشاءاللہ اس نے میرے دو روپیہ بچا کر مجھے واپس لا دیئے۔'' سارے راستے ہزار طرح کے توہمات دل میں آئے جس نے میرے ذہن کو سست اور رفتار کو چست کر دیا۔

میں تھکا ہارا گرمی کا مارا گرد و غبار سے اٹا ہوا رامپور میں داخل ہوا تو ظہر کی نماز پڑھ کر نمازی گھر جا چکے تھے۔ بازار بند تھے اور پوری قوم سنت قیلولہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے ہوش یکجا کرنے کے لئے مسجد میں پناہ لی۔ ڈول سے پانی بھر کر خود بھی نہایا اور کرتے پاجامے کو بھی غسل دیا۔ شیروانی نے ستر پوشی کا کام انجام دیا۔ نماز ظہر اسی حالت میں ادا کی اور کڑی دھوپ کے باوجود پلک جھپک گئی۔ آنکھ کھلی تو کپڑے سوکھ چکے تھے لیکن ان میں اس قدر سلوٹیں تھیں کہ بغیر دھوبی کے نہیں نکل سکتی تھی۔ پاجامہ کا چاک بھی حسب توقع بڑا تھا جسے درزی کی ضرورت تھی اور جوتا بغیر موچی کی مرمت کے پہنا نہیں جا سکتا تھا۔ صرف شیروانی زیب تن کئے ننگے پیر اور ننگے سر سمدھانے جانا نامناسب لگا اس لیے دکانیں کھلنے کا انتظار کیا۔

کپڑے تو جیسے سلوٹ زدہ تھے ویسے ہی پہن لیے۔ عصر کی نماز کے بعد بازار میں نکلا اول جوتے مرمت کروا کے پالش کرائی پھر درزی سے پاجامے کا شگاف پُر کرایا۔ درزی نے قاضی احتشام الحق کا نام سن کر پیسے بھی چارج نہ کیے۔ پھر جناح کیپ سر پر لگائی چہرے پر شگفتگی کے آثار پیدا کئے اور قاضی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اب میں اس طرح

لگتا چاہتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ موٹر اسٹینڈ سے آرہا ہوں۔

میں قاضی صاحب کی بیٹھک کے پھاٹک سے مسکراتا ہوا داخل ہوا تو قاضی صاحب نے بے اختیار فرمایا: ''کیا پیدل آرہا ہے کہ ایسا بیرنگ حلیہ ہے؟''

قاضی صاحب کی شخصیت رنگا رنگ تھی۔ شخصیت میں وجاہت، آواز میں تمسخر لہجہ میں شگفتگی۔ قاضی صاحب بہت بڑے زمیندار اور حاذق حکیم تھے انہیں میرا حال جاننے کے لیے نبض پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ اور میں نے گھبرا کر قبول کرلیا کہ میں پیدل کے راستے آیا ہوں جس پر انہوں نے ہر طرح کی تنبیہ اور سرزنش کی پھر فرمایا: ''تمہیں راستے میں احترام الحق تو ملے ہوں گے؟'' یہ سن کر میرا سر اس طرح چکرایا کہ نڈھال ہوکر منہ سے بغیر پس و پیش کے نکلا ''جی ہاں۔'' ''پھر کیا مار آئی اس کڑی دھوپ میں جان خطرے میں ڈال کر آنے کی۔'' میں اصل وجہ (جنکا تعلق اقتصادیات سے تھا) کے علاوہ جتنی بھی وجوہات غیر معقول اور معقول سمجھ میں آئیں گنا دیں۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے بہنوئی قاضی احسان الحق (تھانوی) کے ساتھ یہ سفر گھوڑے پر کیا کرتے تھے۔ ان کے آگے پیچھے ملازم دوڑتے تھے:

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

(ساحل سے سبکساروں کو ہمارے حال کی کیا خبر)

شکستِ فتح:

بھابی عابدہ کو خبر کرنے والے نے میرے احوال واقعی اور شکل و حلیے سے بھی آگاہ کردیا۔ بھابی عابدہ نے مجھے دروازے پر بلایا۔ نہ سلام نہ دعا، پیار تو دور کی چیز تھی انہوں نے غصے سے گفتگو کا آغاز کیا: ''تو نے میری عزت بھی خراب کی اور اپنے بڑے بھائی کی بھی۔ میں نے جن شرفاء گھرانوں سے تیری بات کر رکھی تھی اب ان کو کیا منھ دکھاوں گی؟ اگر ایسا حلیہ بیرنگ تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں یہاں سے کسی کو لے کر خود آجاتی۔''

میں نے پہلے تو سوچا واپس لوٹ جاؤں۔ چھ ماہ بعد بالوں سمیت آؤں مگر اب

واپسی بھی ناممکن تھی۔ بھابی عابدہ مجھے چور دروازے سے تہہ خانے میں لے گئیں اور کہا:
''خبردار جو یہاں سے نکلا۔تو نے میرا سارا بنابنایا کھیل بگاڑ دیا۔''

اگلے دن رخصت ہونے تک مجھے انہوں نے تہہ خانے میں محبوس رکھا اور وہاں سے ہم براہ راست بس اسٹینڈ پہونچے ،رخصت کے وقت قاضی صاحب نے دو روپیہ کرایہ کا اور ایک روپیہ جیب خرچ کا حسب روایت ادا کیا۔سہارنپور میں ہم لوگوں نے چشمہ کی دکان سے چشمہ کی مرمت دو روپیہ میں کرائی۔ پنجاب ہوٹل میں سموسہ کھایا اور چائے پی،وہ جملہ اخراجات بھابی عابدہ کے ذمہ رہے۔

انبہٹہ پیرزادگان واپسی:

میں بھابی عابدہ کو ان کے میکے رامپور (منیہاران) سے لے کر ٹھیک بارہ بجے گھر میں داخل ہوا۔ پروگرام کے مطابق بھائی عطن (عطاءالرحمٰن قدسی) کو کلکتہ سے انبہٹہ پہنچ جانا تھا۔اُدھر احترام الحق صاحب کی سرِ راہے ملاقات کے بارے میں میرا خدشہ اس یقین میں بدل چکا تھا کہ انہوں نے انبہٹہ میں ہماری نصف ملاقات کی مکمل روداد سنادی ہوگی اور گھر پر سب لوگ بے تابی سے میرے منتظر ہوں گے۔اصل خطرہ اس بات کا تھا کہ جو ڈیڑھ روپیہ میں نے زبردست ایثار سے بچایا تھا اس کا وجود میری جیب میں سخت خطرہ میں تھا۔

نئی آزمائش:

چلچلاتی دھوپ کے ساتھ لو بھی زور شور سے چل رہی تھی۔گھر میں داخل ہوئے تو منظر ہی عجیب تھا۔گھر میں سناٹا تھا، نانا جان اندرونی دالان میں پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔نانی جان چولہے پر حسب دستور اپنے پیڑھے پر براجمان تھیں۔ نجمہ بی (نواسی) برابر کے تخت سے ٹیک لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے ٹکر ٹکر چھت کو تک رہی تھی۔

ہماری آمد نے نہ خوش آمدید کا ماحول بنایا، نہ کوئی کہرام برپا ہوا۔بس سناٹے میں نانی جان کے منھ سے نکلا'' خدا خیر کرے دیکھو آج کس کا خون ہوتا ہے؟'' پھر ان کی آنکھوں

سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔ میں سمجھا بھائی عطن بیوی کی عدم موجودگی سے بھڑک کر خالہ حسینہ کے کنویں میں چھلانگ مارنے چلے گئے۔ دراصل نانی جان اپنی بہو (اور سگی بھانجی) کے بروقت انبیہٹہ نہ پہنچنے پر پہلے سے ہی برہم تھیں اور اگر وہ پہنچ جاتیں تو کسی اور بہانے برہم ہو جاتیں۔ترس بھائی عطن پر آیا کہ انہیں سفر سے آتے ہی قلابازیوں کی زحمت کرنی پڑی۔ پرسشِ احوال پر واقعہ بہت سنگین نکلا۔ واقعی سنگین!

بھائی عطن کا عزمِ رزم آرائی:

دراصل بھائی عطن چولہے سے جلتی لکڑی نکال کر اپنے سالار جنگ احترام الحق صاحب کی بائیسکل پر اپنا ناحق قبضہ جما کر، انہیں دھکیل کر، گنگوہ ۵ میل دور اپنے سب سے بڑے بہنوئی (نجمہ کے والد) پیر جی عزیز الرحمٰن کی پٹائی کرنے کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے احترام الحق صاحب اور ان کے پیچھے بھائی انیس احمد (سب سے چھوٹے داماد اور واقعہ کے راوی) پا پیادہ نکل کھڑے ہوئے تھے۔

واقعہ یوں ہوا کہ ابھی بھائی عطن کلکتہ سے پہنچ کر سلام دعاء سے فارغ ہو کر چولہے کے سامنے پیتل کے نانی اماں کے جہیز کے لوٹے کو میز بنا کر اور اس پر اپنی پلیٹ رکھ کر لقمہ توڑ رہے تھے کہ ان کے چھوٹے بہنوئی (عمر میں سن رسیدہ سماعت میں گزیدہ) انیس احمد صاحب نے دبے لفظوں میں ذکر کر دیا کہ: میاں عزیز نے کل رات اپنی بیگم بجی سلمیٰ (بھائی عطن کی بہن) کی بہت پٹائی کی۔

اسی عرصہ میں احترام صاحب رامپور (منیہاران) سے کچے راستہ ۵ میل سائیکل پر سفر کر کے پہنچ چکے تھے۔ اشتعال بھائی عطن کو بیوی کے وہاں موجود نہ ہونے اور اس امر پر والدہ کی خصوصی توجہ دلانے سے بھی ہوگا۔ غرض اس وقت اشتعال کے ساتھ جلتی لکڑی کا ہتھیار اور گرد آلود بائیسکل بھی میسر آ گئی، انہوں نے نہ سالے اور بہنوئی کا آؤ دیکھا، نہ گرمی اور چولہے کا تاؤ وہ اس پانچ میل کے سفر پر، لو کے جھکڑ سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گنگوہ روانہ ہو گئے۔ وہ پانچ میل کا فاصلہ جو اس وقت لو کی حدت اور گرمی کی شدت میں کالے کوسوں کا تھا۔

ہمیں بچپن سے بھائی عطن سے غیر معمولی تعلق رہا ہے اور ان کے غصے سے بھی واقف تھے کہ جب آتا تھا تو ماموں الہ بخش (گنگوہ کے معروف جن) بن کر آتا تھا۔ ورنہ ان سے زیادہ شفیق اور باغ و بہار شخصیت پوری بستی میں مشکل سے ملتی تھی۔ بھائی عزیز کا احترام وہ بڑے بھائی کی طرح کرتے تھے لیکن بھائی انیس کے زور بیان یا بیگم کی غیر موجودگی کے امتحان نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ ہم نے اپنی برادرانہ ذمہ داری محسوس کی کہ ہم اس معرکہ آرائی کے وقت صلح صفائی کے لئے موجود ہوں یا محلّہ کے کسی گوشے میں پوشیدہ ہو کر کم از کم وہ منظر ہی دیکھ لیں جو نا قابل دید محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن سفر سے چلچلاتی دھوپ اور لو میں لوٹ کر پھر پیدل چار میل کا سفر کرنا بھی آسان نہ تھا۔

بمشکل پوری بستی میں گھوم پھر کر بھائی شمیم سائیکل مکینک کو دوپہر کے قیلولہ کے خواب گراں سے بیدار کر کے ان سے ۱۲ر آنے روز پر بائیسکل کرایہ پر لی۔ انہیں تشویش تھی مسئلہ کیا ہے؟ لیکن ہمیں ہدایت تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ حالانکہ ہماری بستی میں بزرگوں کے روحانی تصرفات سے خبروں کو پھیلنے کے لئے زبان وقلم کی نہیں سینہ بہ سینہ کی ضرورت تھی مگر اس وقت ہماری زبان سے نکل گیا کہ ''شاہ امتیاز جہاں سجادہ نشین درگاہ شاہ عبدالقدوس، گنگوہ شریف میں سخت علیل ہیں۔'' یہ بات ان کو اس قدر نا معقول لگی کہ وہ مصر ہو گئے کہ ہم ۱۲ر آنے برباد نہ کریں بلکہ بس سے ۵ر آنے خرچ کر کے جائیں۔ یہ بات انہوں نے ہماری ہمدردی میں اس طرح کہی گویا انہیں غیب کا علم تھا کہ شاہ صاحب جیسے صحتمند اور تومند آدمی کی علالت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بمشکل ان سے یہ بات منوا سکے کہ سائیکل کے سفر کی آزادی بس کی غلامی سے بدرجہا بہتر ہے اور ہم بائیسکل لے کر گھر کے افراد کے روکنے کے باوجود روانہ ہو گئے۔ ذہن میں جنگ کے جو نقشے تھے ان میں مہابھارت، جنگ بدر اور پانی پت کے میدان کے تاریخی حوالوں نے نئے رنگ بھر دیئے تھے۔ ہم اختر انصاری کا یہ شعر پڑھتے ہوئے رخصت ہوئے:

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ہم بستی سے نکل کر بس والی سڑک پر پہنچے تو گھنے پیپل کے درخت کے نیچے انیس احمد صاحب نیم غنودگی کے عالم میں استراحت فرمارہے تھے۔ بائیسکل کی آواز سے آنکھ کھولی اور ہمیں دیکھ کر بند کر لی۔ دراصل وہ بھی ہمارے گھٹے ہوئے سر کو دیکھ کر ہمیں نہ پہچان سکے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے اطمینان دلا کر کہا کہ: ''فکر نہ کرو جو ہونا ہوگا وہ ہو چکا ہوگا!! اچھا ہے ذرا دیر سے پہنچیں، جب ذرا موسم ٹھنڈا ہو جائے اور ماحول پرسکون ہو اور میاں عزیز کا غصہ اتر چکا ہو۔''

انہوں نے مجھے بھی پوری کہانی اس طرح سنائی جیسے وہ عینی شاہد ہوں۔ مقصد ان کا اپنے بڑے ہم زلف کے مقابلے میں کچھ پوائنٹ سسرال والوں سے جیتنا تھا۔ لیکن انھیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بالنگ کتنا بڑا فاؤل کر رہی ہے۔

میں انہیں مزید آرام کی ہدایت کر کے ان کی ہمت شکنی کے باوجود آگے بڑھا تو وہ جلتی ہوئی لکڑی ملی جواب تلک سلگ رہی تھی۔ لکڑی کو دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آ گیا:

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار
جو دور ہوں تو دھواں دیں ملیں تو جلنے لگیں

اور ذرا آگے بڑھا تو بھائی احترام بھی اسی طرح رہٹ کے پاس پانی سے پیاس بجھا رہے تھے۔ اس بار انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور پڑتپاک سے ملاقات کی۔ رامپور سے انبیہٹہ کے راستے میں نہ مل سکنے کی معذرت کی اور آئندہ نہ بھولنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے منت سماجت اور حجت سے میرے شریک سفر بننے پر اصرار کیا۔

مجھے انہوں نے اگلے ڈنڈے پر بٹھا کر بائیسکل کھینی شروع کر دی اور کچھ دیر بعد ہانپ کر ہارس ٹریڈنگ کر لی۔ یعنی زمام بائیسکل میرے حوالے کر دی۔ تمام راستہ

قیامت کا تھا جس میں ہم جسمانی طور پر جہنم کے اڑوس پڑوس میں تھے اور روحانی طور پر میدان جنگ میں، کورو پانڈو کا معاملہ تھا، دونوں طرف اپنے تھے۔ دراصل بھائی عطن کے راستے میں ہتھیار ڈال دینے سے یہ بات تو طے ہوگئی تھی کہ اب جنگ یک طرفہ ہے۔ دراصل بھائی عزیز الرحمٰن صاحب کو کسی جلتی لکڑی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پوری لکڑی کی ٹال کے مالک تھے۔ ان کی سدا بہار شخصیت کو اگر غصہ آجاتا تو اس سے شاخِ سبز جل اٹھتی۔ ان کی ٹال کی لکڑیاں سوکھی تھیں اور ان کی دکان میں مٹی کے تیل کی سپلائی بھی وافر تھی۔ اس لئے ان کا دفاع مضبوط تھا۔ اور بھائی عطن کا اقدام خطرناک ہوسکتا تھا۔

گنگوہ میں پیش آمدہ حالات کو سوچ کر بھائی احترام کو اپنی بہن کے مستقبل کی فکر ہوئی۔ ہم انہیں تسلی دلاتے رہے کہ بھائی عطن اتنے نادان نہیں کہ وہ نہتے ہی بھائی عزیز سے بھڑ جائیں گے۔ وہ پہلے اپنی بہن حمیدہ (بیگم انیس احمد) سے مل کر پھر شاہ امتیاز جہاں (ماموں) کے گھر جا کر اسلحہ سے لیس ہو کر حملہ آور ہوں گے اور اس عرصہ میں کوشش کریں گے کہ لوگ انہیں روک لیں۔ غرض جتنا فاصلہ تھا اتنے ہی توہمات تھے اتنے ہی منفی خیالات اور منفی باتیں اسی قدر تھکاوٹ۔ خدا خدا کر کے ۲ بجے کے قریب گنگوہ شریف پہونچے۔ یہ وقت شرفاء کے سونے کا ہوتا ہے۔

رسیدہ بود بلائے و لے!

بھائی عزیز صاحب کی دکان کی گلی میں سر ڈال کر بہت دور اور احتیاط سے جھانک کر دیکھا۔ دکان کا دروازہ بند تھا اور خون کا نام ونشان نہ تھا۔ دراصل بھائی عزیز دوپہر میں دکان بند کر کے سونے کے عادی تھے۔ محلے میں مکمل سناٹا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں مردانہ وار بڑھتے ہوئے محلہ چھتے کی ان کی دکان کے سامنے سے "جلتو جلال تو" پڑھتے ہوئے لرزیدہ ولغزیدہ قدموں سے گذرے اور کمال سرعت کے ساتھ شاہ امتیاز جہاں کے گھر میں بغیر علیک سلیک کے داخل ہوگئے۔ وہاں جا کر عجیب ہی مناظر دیکھے۔

برآمدہ میں آنکھیں بند کئے بھائی عطن پڑے ہیں پورا خاندان شاہ امتیاز جہاں کی رہنمائی میں ان کے گرد جمع ہے۔ کوئی پانی چھڑک رہا ہے کوئی لخلخہ سنگھار ہا ہے، کوئی چائے کے قطرے منہ میں ڈال رہا ہے، کوئی کہہ رہا ہے الٹا جوتا سنگھانے سے بے ہوش تو بے ہوش مردے کے بھی ایک دفعہ تو جان پڑ جاتی ہے۔ بھائی عطن ساکت وصامت آنکھیں بند کیے ہیں۔ ہوں نہ ہاں، ٹس نہ مس، ادھر شاہ امتیاز جہاں نبض دیکھ کر فرما رہے ہیں ''ارے تیری قسمت ماری گئی ہے تجھے کچھ نہیں ہوا؟ تیری نبض بھی ٹھیک ہے، آنکھوں کی پتلیاں بھی ٹھیک سے گھوم رہی ہیں'' لیکن ساری تسلی کے باوجود خواتین رو رو کر اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ ہماری آمد سے کہانی مکمل ہوگئی اور شاہ صاحب سے ہمارا ڈائیلاگ شروع ہوگیا۔ پہلے تو انہوں نے سر گھٹانے کا پرسادیا پھر پوچھا:

''کیا قیامت ٹوٹ گئی کہ تم لوگ اس طرح بھری دوپہر میں آرہے ہو؟''

''ہم لوگ تو بھائی عطن اور بھائی عزیز کی جنگ بچانے آئے ہیں۔''

''کیا مار آئی کیسی جنگ؟ میاں عزیز سے جنگ کر کے بھی عطن کو شاہ عبدالقدوس کے قبرستان میں سونا ہے؟ قصہ کیا ہے؟''

''معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کل رات بھائی عزیز نے آپا سلمیٰ کو بہت مارا ہے، بھائی عطن ان سے بدلہ لینے آئے ہیں۔''

''کیوں ہم کیا مر گئے؟ کہ عطن کو یہ کام کرنے کی ضرورت پڑی۔ کون کہتا ہے؟ ہم نے تو کوئی چیخ و پکار نہیں سنی؟''

''بھائی انیس گنگوہ سے انبہٹہ پہونچے تھے انہوں نے یہ خبر زود اثر سنائی۔ بھائی عطن گھر سے جلتی لکڑی لیکر نکلے تھے، وہ راستہ میں گر گئی۔ انہیں وہاں براہ راست بھائی عزیز سے جاکر نبرد آزما ہونا تھا۔ شاید آپ کے پاس جلتی لکڑی کے لئے آئے ہوں گے۔''

''سہراباولا! میاں انیس کے بھٹ کان میں دنیا کے کسی آدمی کی آواز نہیں جاتی،

سلمیٰ کی آواز کہاں سے آ گئی۔میاں عزیز کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو جائے گی۔لکڑی تو کیا لکڑا بھی گر جائے گا، وہ اسی کے جوتے سے اس کا سر صاف کر دیں گے۔میاں بیوی کے جھگڑے میں کس عقلمند نے کہا ہے کہ بچے پڑیں۔کہیں شرفاء میں اس طرح لاٹھی ڈنڈے چلے ہیں؟''

شاہ امتیاز جہاں جس قدر شخصیت میں وجیہ تھے، اسی قدر زبان میں رطب اللسان تھے۔ان کی ڈانٹ جس قدر طویل ہو رہی تھی بھائی عطن کی غنودگی بڑھ رہی تھی۔اور ہمیں وہ کچھ کہنے کا سنہری موقعہ ملا تھا۔جو بھائی عطن کے ہوش میں ہماری زبان پر آنے سے رہ جاتا۔وہ خیالات اگر بھائی عطن ہوش میں ہوتے تو زبان پر تو کیا ذہن میں بھی نہ آتے۔مجھے حکم ہوا کہ میں فوراً آپا حمیدہ کو محلہ چوک سے جا کر لاؤں کیوں کہ میاں انیس، بیوی کے مشورے کے بغیر اتنا اہم الزام میاں عزیز پر نہیں لگا سکتے تھے۔یوں بھی شرفاء کے خاندان میں ایسے اہم کام بیوی کے مشورے کے بغیر انجام نہیں پاتے تھے۔

آپا حمیدہ نے میری شکل دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔وہ سمجھ گئیں اس بے وقت انبیہٹہ سے آنے کا مطلب ضرور کوئی حادثہ ہے گویا انہیں حادثہ کا پہلے سے اندازہ تھا۔انہوں نے فوراً برقعہ اوڑھا اور روتی دھوتی میرے ساتھ ہو لیں۔اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی پیش کریں شاہ صاحب نے فردِ جرم عائد کر کے اصل مجرم کا فیصلہ ان کے حق میں کر دیا۔آپا حمیدہ نے لاکھ قسمیں کھائیں کہ واقعہ صحیح ہے اور راوی معتبر ہیں لیکن شاہ صاحب نے ایک نہ سنی، بالآخر فیصلہ ہوا کہ سہ پہر سے پہلے اور بھائی عزیز کے سو کر اٹھنے سے پیشتر معاملہ کی تحقیق کے لئے میں آپا سلمیٰ کے پاس محلہ کٹی کئی جاؤں۔محلہ کٹی کا راستہ بھائی عزیز کی دکان کے سامنے سے گزرتا تھا۔شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ''احتیاط سے جانا میاں عزیز کو بھنک نہ پڑے تم لوگوں کو بہت جلد میاں عزیز کی بیداری سے پہلے انبیہٹہ کے لئے نکلنا ہے۔'' یہ سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے لیکن بھائی عطن کو ہوش آ گیا مجھے اس موقعہ پر گلستان کی ایک حکایت یاد آ گئی:

''ایک بار ایک لومڑی بھاگ رہی تھی، کسی نے پوچھا ''تو کیوں بھاگ رہی ہے؟''

کہنے لگی ''لوگ شیر کا شکار کر رہے ہیں۔''

''لوگ شیر کا شکار کر رہے ہیں تجھے شیر سے کیا نسبت؟''

''اگر انہوں نے مجھے شیر کا بچہ سمجھ کر مار دیا تو کون نسبت پوچھنے آئے گا؟''

چینی اور تاجپوشی:

میں بھی لومڑی کی طرح خوفزدہ تھا کہ اگر یہ راز افشاء ہوگیا تو عزیز بھائی میرا حساب پہلے بے باق کردیں گے پھر بھائی عطن کا نمبر آئے گا۔ اس لئے میں نے سوچا بجائے بہادری دکھا کر پشیمان ہونے کے اس وقت بزدلی کا اظہار کر کے پریشان ہولوں۔ میرے اظہار تشویش کی وجہ سے نئے راستے کا تعین ہوا چھتوں چھت ہوتا ہوا، کسی چھوٹی سی گلی میں اترنا تھا اور یہی واپسی کا راستہ بھی متعین ہوا۔ پھر بھی میں ہراساں آپا سلمیٰ کے گھر جا رہا ہوں۔ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے عزیز بھائی سے چومکھی لڑ رہا ہوں۔ میں گلی در گلی ہوتا ہوا وادیٔ سلمیٰ آپا میں جا پہونچا اور کنڈی کھٹکھٹادی۔ اس زور و شور سے کنڈی بجی کہ پورا محلہ اٹھ گیا۔ آپا سلمیٰ بھی کس مساتی ہوئی دروازے تک آئیں اور فرمایا ''بھائی کیا بات ہے میں سمجھی حضرت اسرافیلؑ نے صور پھونک دیا۔'' میں نے کہا ''آپا قیامت برپا ہے تبھی تو تمہارے بھائی میاں عطن تمہارے میاں اور سرتاج کی تاجپوشی کے لئے یہ نفس نفیس بھری دوپہر میں براجمان ہوئے ہیں۔''

آپا سلمیٰ کے گھر ماشاء اللہ ہر سال ایک لڑکی کا اضافہ ہوتا تھا۔ ایک سال کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہ ہوسکا تو اگلے سال جوڑواں لڑکیاں پیدا ہوگئیں۔ اس وقت یاد نہیں کتنی لڑکیاں عدم سے وجود میں آچکیں تھیں اور کتنی بے تابانہ انتظار کر رہی تھیں۔ میرے پہونچنے پر سارا گھر جاگ گیا۔ فوراً چائے کا انتظام شروع ہوگیا جس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔

آپا سلمیٰ میں حس مزاح بھی بدرجۂ اتم تھی۔ انہوں نے اصل مقصد سفر جاننے کی کوشش کی اور ہم نے مِن وَعَن عرض کردیا اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ پاؤں کا میڈیکل

ایکزامینیشن بھی شروع کردیا۔ آپا نے سب سن کر ہنس کر پوری سنجیدگی سے فرمایا ''عطن سے کہہ دے اگر اپنے سر کی سلامتی چاہتا ہے تو واپس چلا جائے۔ اگر وہ مردود یہ سمجھتا ہے کہ میں ان بچوں کو لے کر اس کے کلکتہ کی کال کوٹھری میں اپنا گھر چھوڑ کر بیٹھوں گی تو وہ دیوانہ ہے۔''

میں نے آپا کی نصیحت پلے باندھی پھر بھی شرارت سے پوچھا ''آپا کوئی تو بات ہوئی ہے جو انبہٹہ تک پہونچ گئی۔ سچ بتاؤ کیا بھائی عزیز نے آپ کو سچ مچ مارا ہے؟''

''ایسے کہاں کے وہ رستم ہیں۔'' یہ بات آپا نے جس برجستگی سے کہی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رستم سچ مچ اپنی بیوی کو مارتا تھا یا بیوی کی پٹائی کے لئے رستم ہونا شرعی حجت ہے۔ یا مرد جو خود کو رستم سمجھتا ہوا سکے لئے اپنی زور آزمائی کا یہ گھریلو نسخہ ہے۔

''مگر کچھ تو ہوا ہوگا کہ پورے تحصیل نکوڑ میں جس کا شہرہ ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شہر والے دیوانے ہیں تو میں کیا کروں؟'' انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر آپا کچھ تو بات ہوگی جس کا بتنگڑ بنا۔''

''بات کیا تھی بس میں نے برتن دھو کر تام چینی اور چینی کے برتن ایک ٹوکری میں رکھے ہوئے تھے انہوں نے کہا چینی کے برتن چینی کے ساتھ رکھو۔ تام چینی کے برتن تام چینی کے ساتھ رکھو ورنہ چینی کے برتن تام چینی کے برتنوں سے ٹکرا کر ٹوٹ جائیں گے۔'' بس میں نے یہ جواب دیدیا کہ ''تم اپنی دکان سنبھالو مجھے گھر سنبھالنے دو میں چینی کے برتن تام چینی کے برتنوں میں رکھوں یا چینی کے تام چینی کے برتنوں میں۔ انہیں غصہ آ گیا میں نے بھی ذرا تیز جواب دیدیا کہ: ''میں نے کیا چینی کے برتن تمہارے گھر میں پہلی دفعہ دیکھے ہیں؟ ہیں بھی تو یہ میرے جہیز کے۔'' بس وہ غصہ میں چیخنے لگے، میں نے بھی کہہ دیا ''جاؤ جا کر اپنے خریداروں پہ چیخو، میں تم سے کوئی ڈر کے بھاگنے سے تو رہی۔''

آپا سلمٰی اپنا قصہ سنا رہی تھیں اور لڑکیاں کھسر پسر کر کے ہنس رہی تھیں اور میں معاملے کی باقاعدہ پوری تفتیش (جسے عرف عام میں کرید کہتے ہیں) میں لگا تھا۔

''آپا سچ سچ بتاؤ بھائی نے تمہیں مارا یا نہیں؟''

''مارتے کیا؟ کونسی میری ہڈی توڑ دی۔ بس یونہی چھوسا دیا تھا۔ پھر بھائی وہی تو دن رات محنت کر کے کما کے لاویں۔ بچوں کو کھلاویں اگر کبھی کچھ کہہ دیں تو کونسی میری عزت گھٹ جاتی ہے۔ میں بھی تو موقع محل سے انہیں سنا دیتی ہوں' اور ہر دفعہ مجھ سے وہ الجھتے بھی نہیں اور اکثر تو وہ میری سن کے بس جلتے پٹختے دکان کو چل دیتے ہیں۔''

''تو آپا'' میں اس نتیجہ پہ پہونچا ہوں کہ بھائی عزیز نے آپ کو چینی اور تام چینی کے برتن ایک ٹوکری میں رکھنے کے جرم میں طمانچہ مار کر سزا دی؟''

''ہٹ پرے! میں نے کب کہا، طمانچہ نہیں انہوں نے تمنچہ مارا! تو جلدی سے چائے پی، وہ تھوڑی دیر میں اٹھ کر گھر چائے پینے نہ آ جائیں۔ انکی دکان پر جا کر ان کو ہرگز کوئی بات نہ کہنا۔ اور جا کر عطن سے کہہ دے اس نے اپنے بڑے بھائی کے بارے میں ایسا کیوں سوچا۔ وہ مجھے پیار سے رکھیں یا ماریں، میں اس گھر میں لوٹ کر نہ جاؤں گی جہاں سے مجھے رخصت کر دیا گیا ہے۔''

میں نے تشتری میں چائے انڈیل کر پھونک مار مار کر ٹھنڈی کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے غٹاغٹ پی کر واپس گلیوں سے ہوتا ہوا امتیاز جہاں شاہ صاحب کے گھر پہونچ گیا۔ راستے بھر چوکنا رہا کہیں بھائی عزیز سے ملاقات نہ ہو جائے اور وہ میرے دل کا چور نہ پکڑ لیں۔ شاہ صاحب کے گھر پہونچ کر اصل واقعہ کی خبر کی اور آپا سلمٰی کا پیغام چینی اور تام چینی طمانچہ اور تمنچہ کا پھل پھول لگا کر پہونچا دیا۔

گھر واپسی:

وہاں ایمرجنسی شوریٰ کا فیصلہ ہوا کہ اس واقعہ کی کسی کو خبر نہ ہو اور ہم لوگ چور راستوں سے ہوتے ہوئے انبیہٹہ پیرزادگان اپنی بائسکلوں سمیت روانہ ہو جائیں۔ اس وقت تک بھائی عطن ہوش میں آ چکے تھے۔ آپا سلمٰی کا پیغام سن کر ان کے ہوش اور ٹھکانے لگ

گئے اور ہم بے نیل ومرام پانی پت کے میدان سے گھر واپس ہوئے۔ گویا ع

آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

چوری چھپے گلیوں سے نکل کر دو سائکلوں پر ڈبلنگ کرتے ہوئے واپس شام کے چھ بجے کے قریب انبہٹہ پہونچ کر صاحب فراش ہوگئے۔ کسی کا سر گھٹنے میں گھس گیا تھا کسی کا مونڈھا معدہ میں جا اترا تھا اور سب کی عقل ٹخنوں میں جا گزیں ہوگئی تھی اور فہم گدی میں اٹک گئی تھی۔ جتنے مریض تھے اس سے زیادہ حکیم اور مشیر صحت تھے۔ غرض مختلف مالشوں، فہمائشوں، دواؤں اور دعاؤں سے کچھ افاقہ ہوا کچھ بہادر قوال کے رنگ نے:

آج رنگ ہے ری مہا رنگ ہے ری مورے نجام الدین کے گھر رنگ ہے ری اور آخر میں میلاد شریف اور آیت کریمہ کے ختم نے صحت کا مژدہ سنا دیا۔ مشترکہ درد نے دونوں دیوبندیوں اور بریلیوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا، غرض: ع

تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے۔

اس واقعہ کے تشہیر نہ کرنے کا فیصلہ بڑا کامیاب رہا اور روبصحت ہونے کے چند دن بعد یہ لوگ بے خطر بھائی عطن کے کلکتہ سے لائے ہوئے تحائف کی رہنمائی میں گنگوہ گئے، دعوتیں ضیافتیں ہوئیں اور بھائی عزیز صاحب نے اپنی مثالی تواضع اور بے مثال مہمان نوازی سے نوازا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

گنگوہ کی دعوت شیراز:

میں موسم گرماں کی تعطیل کے بعد علی گڑھ چلا گیا تھا۔ موسم سرما کی تعطیلات میں واپسی ہوئی تو گنگوہ جانا ہوا۔ بھائی عزیز نے روایتی اخلاق برتا اور مرصع دعوت کا انتظام کیا۔ تخت پر دسترخوان بچھا، کھانا لگا اور ہماری پلیٹ میں اپنے ہاتھ سے بھائی عزیز نے کھانا اتارا۔ اصرار سے کھلایا، بچوں نے کھانے کے بعد والے ہاتھ دھلائے، پھر بھائی عزیز نے ہمیشہ کی

طرح شفقت آمیز نظر سے پہلے مجھے دیکھا پھر ان کریڈیبل ہلک (hulk Incredible) کی طرح رنگ بدلا اور غصہ سے کانپتے ہوئے فرمایا: ''میاں عابد سنا ہے تم لوگ جون میں میاں عطن، میاں احترام اور میاں انیس کے ساتھ مجھے سبق پڑھانے چولہے کی جلتی لکڑیاں لے کر آئے تھے، قسم وحدۂ لاشریک کی مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے بعد آ کر تم دعوت اڑا گئے اور تحفے پکڑا گئے۔ اگر مجھے بھنک بھی پڑ جاتی تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تم چاروں کو گردن سے پکڑ کر لکڑیوں سمیت کلو بھٹیارے کے بھاڑ میں جھونک دیتا...۔''

غرض چھ ماہ کا غصہ بھائی عزیز نے مجھ نہتے انصاری پر ایک بھرپور معنی خیز جملے سے اتار دیا۔ بچیاں سہمی کھڑی تھیں مگر آپا سلمیٰ نے بھائی عزیز کا زنانہ وار کا مقابلہ کیا اور میرے دفاع میں ڈٹ گئیں۔ ادھر میں نے کہا:

''بھائی صاحب! میں تو آپ کو بچانے آیا تھا اور اس معاملہ میں میری مداخلت ریڈکراس کے کام سے زیادہ نہ تھی۔''

اس پر بھائی عزیز نے تحقیر سے کہا ''مجھے بچانے؟ میاں اپنی خیر مناؤ!''

میں پھر گویا ہوا: ''بھائی صاحب ہم خاندان انصار نے تو ۱۴۰۰ء سال پہلے اپنے حق کے لئے نہ ستیہ گرہ کی، نہ دھرنا دیا، نہ گھراؤ کیا، نہ ہڑتال کی اور جنگ تو ہم کیا کرتے۔ ہم آپ سے آپ کے خانگی روایتی حق میں کیسے مداخلت کرتے؟ بلکہ بھائی عطن موسم گرما، کلکتہ سے انبیہٹہ تک سفر کی تکان، باورچی خانے کی تمازت، موقعہ کی نزاکت، بیوی کی گھر سے غیر حاضری اس معاملہ میں والدہ کی ہمدردی پر وقتی طور پر برافروختہ ہوئے۔ جلتی لکڑی انہوں نے انبیہٹہ کے نواح میں پھینک دی تھی یعنی جنگ سے پہلے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ہمت انہوں نے نواح گنگوہ میں داخل ہونے کے بعد توڑ دی، ان کی شرمندگی نے بے ہوشی کی شکل اختیار کر لی۔ اور انبیہٹہ جا کر انہوں نے ندامت کے آنسو بہائے۔ اور ہم

جب جب اس واقعہ کو یاد کر کے ہنستے تھے وہ سن سن کر روتے تھے۔آپ کو اندازہ نہیں ان کو آپ سے کس قدر عقیدت و محبت ہے۔ یہ ان کی شرمندگی تھی کہ جو تحائف وہ پورے خاندان کے لائے تھے آپ کو دے گئے۔اور خود ہمیں تحفہ کے بجائے وعدۂ فردا پر ٹرخادیا۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے اور اس میں بھی اس کی بڑی حکمت ہے۔"

ہم نے سیکنڈ ایر میں علی گڑھ کے ڈبیٹ کا تھرڈ پرائز اور دلی کالج آل انڈیا ڈبیٹ کا فرسٹ پرائز اور یونیورسٹی کا سیفی فدا حسین گولڈ میڈل جیتا تھا۔اس ایک سال میں جو کچھ علی گڑھ نے سکھایا تھا وہ الفاظ کا خزانہ اور پولسن کا مکھن عزیز بھائی پر لگا دیا۔اب ان کے غصہ میں ہلکی سی تبسم کی آمیزش ہوئی اور انہوں نے سوال کر دیا۔

ازدواجی زندگی کی حکمت:

"کیوں صاحبزادے! آپ لوگوں کی اس نامعقول حرکت میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے جو آپ جیسے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان کو نظر آئی؟۔"

اب ہماری باری تھی" بھائی صاحب آپا سلمیٰ نے آپ کی شفقت، محبت خیال وغیرہ کے جو واقعات سنائے وہ تو کامیاب ازدواجی زندگی کا اہم باب ہیں اور ہم کنواروں کے لئے مشعل راہ۔آپ کا مقام پہلے بھی عظیم تھا اب تو آپ تمام گنگوہی کے شوہروں کے لئے منارۂ نور ہیں۔"

آپا سلمیٰ نے اس درمیان کئی بار ٹوکا بھی کہ:" چل ہٹ کہاں کا جھوٹ سچ اڑا رہا ہے۔" مگر عزیز بھائی کو سننے میں لطف آرہا تھا اور میں الف لیلیٰ کی داستان کی طرح آپا سلمیٰ کی پانچ منٹ کی گفتگو کو گھنٹوں پر محیط کر رہا تھا کہ وقت گہرے زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے یہ تو خانگی غلط فہمیاں تھیں۔اور ان لوگوں میں تھیں جنکی بنیاد خوش فہمیوں پر ہوتی ہے۔

ادھر بھائی عزیز آپا سلمیٰ سے مستقل کشیدہ رہتے تھے۔ان کی پوری کوشش اور حسن توقع کے باوجود آپا سلمیٰ کے لڑکیوں کا سالانہ ایڈیشن جاری تھا۔ بھائی عزیز نے پانچویں بچی

تک صبر کیا پھر مبارک باد کو چڑ بنالیا۔گھر بھی بچی کی پیدائش کے بعد ہفتوں نہ آتے۔شاید اس گفتگو کا اثر تھا کہ واقعات کے تموج ،آپا سلمٰی اور بھائی عزیز کے تعلقات میں ایسی استواری آئی کہ ۹ ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں (عرف عام کے مطابق) چاند سے بیٹے حفیظ الرحمٰن سے آٹھ یا دس بیٹیوں کے بعد نواز دیا۔(ہمارا حساب کمزور ہے اور یادداشت میں فرق آرہا ہے اس لئے نمبروں کے تعین میں غلطی کا امکان ہے تصدیق کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔)

اب اس واقعہ کا کوئی کردار بھی ہمارے اور نجمہ بی (مقیم لاہور) کے علاوہ بقید حیات نہیں۔آپ ان واقعات کی تصدیق کی زحمت نہ گوارا کریں۔مرحومین کے مغفرت کی اور زندوں کے بامعنی زندگی کی توفیق کی دعا کریں۔

غرض تعطیلات گذر گئیں۔امتحان کے نتیجے میں ہم سیکنڈ ڈویژن میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوگئے،میز پر جس طرح کتابیں سجائی تھیں ان کے حسن ترتیب میں فرق نہیں آیا۔ ہم بھائی عطن کی فیاضی سے علیگڑھ کا ٹکٹ خرید کر یونیورسٹی پہونچ گئے۔

علیگڑھ۔تیسرا سال

(جولائی ۱۹۵۳ سے مئی ۱۹۵۴ء)

یونین کی سیاست میں پہلا قدم:

سکینڈ ایر کے رزلٹ نے بھی حیرت میں ڈال دیا تھا، اتنی تھوڑی محنت کے بعد ہائی سکینڈ کلاس مارک اور میتھمیٹکس میں فرسٹ ڈویژن نے میری ایسی ہمت افزائی کی کہ میں نے تھرڈ ایر میں پھر فزکس کیمسٹری اور میتھمٹکس میں داخلہ لے لیا۔ میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اگر چند ہفتوں کی کوشش سے میں ہائی سکینڈ لاسکتا ہوں تو سال بھر کی عرق ریزی سے فرسٹ ڈویژن بھی آسکتی ہے، تعلیم شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ جو کچھ انٹرمیڈیٹ میں پڑھا تھا وہ فارمولے تھے۔ تھرڈ ایر کی تعلیم کچھ اور ہی شے تھی، پھر ہمارے بہاری دوست سید محمد شفیع رخصت ہوکر سندری (بہار) انجینیر نگ کرنے چلے گئے اور ہمیں بے یار و مددگار سائنس سے مقابلہ کے لئے چھوڑ گئے۔

شروع سال سے ہی درسیات میں محنت کا عہد بھی قائم نہ رہ سکا کہ ہمارے بعض احباب سکینڈ ایر (رفیع اللہ عنایتی، عابد رضا بیدار، اکبر عرشی زادہ، ظہیر قریشی) نے جنکا تعلق رامپور سے تھا ہمیں یونین کی سکریٹری شپ کا کنڈیڈیٹ بنا دیا۔ وہ یونین کے ڈبیٹس میں شرکت کے لئے ہمیں باجماعت لے جاتے اور ہم انعام پر انعام جیت رہے تھے، اس سال ہم کو بہترین اسپیکر کا سیفی بُرہان الدین گولڈ میڈل ملنے والا تھا، جو مجموعی کاموں کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا تھا۔

ہمارے الیکشن کی خبر تو عام ہوگئی لیکن جس کنڈیڈیٹ کے پاس تعلیم جاری رکھنے کے پیسے نہ تھے، الیکشن میں سینیرس کا مرغا کیسے بنتا؟ مگر یہ احباب طے کر چکے تھے کہ مجھے قدم پیچھے نہیں ہٹانا اور میرے سامنے آگے جانے کا راستہ مسدود تھا۔

اُس سال کا آغاز یوں بھی مالی کرائسس کے ساتھ ہوا تھا، والد صاحب نے

دوسال پوری معاونت کی اور دوسرے سال کے آخر میں سخت بیمار ہوگئے۔ انکا اخبار جمہوریت بھی ان کے شاگرد جمیل مہدی کے ہاتھوں میں چلا گیا، جمیل مہدی ان کے رفیق سے رقیب بن گئے۔والد صاحب کا اس سلسلے کا ایک شعر سنتے چلئے:

جنہیں اپنے ہاتھوں بنایا تھا ہم نے
وہ بت اب ہمارے خدا بن گئے ہیں

بمبئی سے اخراجات جو بند ہوئے تو پھر علی گڑھ کے قیام میں نہ کھل سکے۔ پھر ہم تھے اور علی گڑھ تھا جس نے ہمیں پڑھادیا۔ یہ قطرہ گہر تو نہ بن سکا مگر جو کچھ بھی بنا اس میں اس ادارہ کا احسان ہے۔ ہم نے مصلحتاً رہائش پھوپھا جان (شاہ فاروق صاحب صابری) کے گھر پھوپی جان (محمودہ خاتون) کے پاس رکھی کہ کھانے اور رہائش کا خرچ بچے گا اور پھوپی جان (جو لا ولد تھیں) کی تمنا پوری ہوجائے گی۔ لیکن پھوپا جان کا معاملہ نازک تھا، وہ علی گڑھ کی تعلیم کے قائل نہ تھے۔ بلکہ کسی بھی تعلیم کے قائل نہ تھے انھوں نے وہبی علوم میں بزعم خود دستگاہ حاصل کی تھی، وہ اسے خاندان کے مختلف نونہالوں پر آزما چکے تھے۔ میں مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گیا۔ انہیں میرے کلاس جانے، تقریر کرنے، دیر سے آنے، آوارہ گردی بنام لیڈری کرنے، پر اعتراض تھا۔ بقول انکے اس طرح کی حرکتوں نے ہماری پچھلی تین نسلوں کو تباہ کیا تھا اور وہ اس چوتھی نسل کو تعلیم ظاہری کے فریب سے بچانا چاہتے تھے۔ اس کشمکش کے ساتھ ایک اور دلخراش واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کو ہلا دیا اور مجھے عمر بھر اس کا ملال رہا۔

مُنّی بی جو ملی اور بچھڑ گئی:

پھوپی جان کے ملازم نے اپنی بیٹی منی بی ان کے پاس چھوڑ دی تھی، اسکی عمر نو دس سال تھی، پھوپی جان نے اسے بیٹیوں سے زیادہ پیار دیا، اس کی تعلیم کا انتظام کیا اور کھانے پکانے رہنے سہنے کی تربیت کی، زبان اسکی نکھر کر ٹکسالی ہوگئی، آداب تعلیم یافتہ گھرانوں کے اس کے مزاج میں رچ بس گئے۔ مجھے اسکی ذات میں بہن اور پھوپی جان پھوپا جان کو بیٹی

مل گئی۔ایک دن اس کا باپ آیا اور اس نے کہا اس کو اس کی بہن کے ملانے لے جانا ہے، یہ سن کر منی بی بلک بلک کر رونے لگی اور کہا: ''یہ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ دے گا، اس نے میری بہن کو بھی بیچ دیا۔ مجھے بچالو۔'' اُدھر پھوپی جان کی رو رو کر بُری حالت تھی، پھوپا جان اسے سمجھا رہے تھے اور کچھ مالی تصفیہ بھی ملازم سے کرنا چاہتے تھے، مگر وہ بوڑھا کسی سے ایڈوانس پیسہ لے کر کھا چکا تھا۔ منی بی تڑپتی، لوٹتی، روتی دھوتی، گھسٹتی باپ کے ساتھ چلی گئی پھر اسکا پتہ نہ چلا۔ یہ بوڑھا علی گڑھ کے قیام میں کئی بار ملا لیکن اس نے اس کا پتہ نہ دیا۔ یہ سنتے رہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو کسی کے ہاتھ ایک ہزار میں بیچ دیا۔ اس زمانے میں ہزار کی رقم قیاس سے زیادہ تھی۔ منی کی آہ و بکا اور پھوپی جان کا صدمہ میں زندگی بھر نہ بھول سکا۔ قسمت کیا کیا کھیل کرتی ہے۔ منی بی اگر پھوپی جان کے پاس رہتی تو پتہ نہیں اسکا کیا مستقبل بنتا علی گڑھ میں ہی میں ایسے کئی گھرانوں کو جانتا ہوں جہاں ایسی لڑکیاں اور لڑکے آئے اور کندن بن کر بامِ عروج پر پہونچے۔ میری چھوٹی بہن نے ایک بچی کو گود لے کر اس کی پرورش کی تھی اور اس کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ اس نے ایم ایڈ کیا اور اس کی شادی ایک تعلیم یافتہ بزنس مین سے ہوگئی۔ وہ ماشاءاللہ خوش وخرم ہے۔

پروفیسر اشفاق خان کی کرم فرمائی:

اس صدمہ نے مجھے ہلا دیا پھوپا جان کی تربیت سے میری رہی سہی تعلیمی یکسوئی بھی ختم ہوگئی میرے پاس کوئی آمدنی نہ تھی کہ میں کہیں آزادانہ رہوں بورڈنگ بھر چکے تھے، میں نے یہ بات اپنے سابق سینیر پارٹنر اشتیاق محمد خان سے کہی تو انہوں نے تپاک سے کہا تم اشفاق خان (پروفیسر فزکس) وارڈن صاحب سے بات کرلو وہ تمہیں اجازت دے ہی دیں گے۔ میرے جونیر پارٹنر صالح نیر (ابن شفیع الدین نیر) ہیں انہیں کسی اعتراض کا سوال نہیں۔''

میں نے صورت حال اشفاق صاحب کے سامنے رکھی تو انہوں نے خوش دلی سے اجازت دے دی، اشفاق صاحب یوں بھی علی گڑھ کے شفیق استاد تھے، لیکن ان سے

ایک رشتہ بجنور کا بھی تھا، انکے سسر حامد علی خاں کے ہمارے والد دوست تھے اور ہمارے بچپن میں ان کے کرائے دار رہے تھے۔ میری عمر ایک سال تھی اور (والدہ میمونہ خاتون) حیات تھیں اُس تعلق کو ان کی ساس اور بیٹی نے علی گڑھ کے قیام میں نبھایا۔ وہ مختلف اوقات میں مجھے گھر پر بلا کر پورے پردے کے پیچھے سے خاطر تواضع کرتی تھیں اور محبت سے والدہ مرحومہ کا ذکر تیں۔ محبت کا یہ رشتہ علی گڑھ کے استاد اور شاگرد کے ساتھ اس قدر مضبوط ہوگیا کہ میں کمرہ نمبر ۴۸ میکڈانلڈ ہوسٹل میں اشتیاق محمد خان اور صالح نیر کا فری تھرڈ پارٹنر ہوگیا۔ اشفاق صاحب نے کوشش کر کے فری کھانا اسٹوڈنٹ شپ میں جاری کرادیا اور اس طرح میرے تھرڈ ایر کے بخیر گذرنے کا اہتمام ہوگیا۔

الیکشن کا ناکام تجربہ:

اب الیکشن کیمپین جو شروع ہوئی تو صدارتی انتخاب میں مقابل محمد امین بلبلیا اور شفیع قریشی صاحب تھے اور سکریٹری میں صرف ہم تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جماعت اسلامی کے سید انور علی کی ایجاد سے منور حسین خاں کھڑے ہوگئے۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے ان کے مقابل انیس الرحمٰن شیروانی تھے۔ ہر چند کے جماعت کے حلقے کا کوئی خاص اثر یونیورسٹی کی اجتماعی زندگی پر نہ تھا پھر بھی منور حسین کے ساتھ ایک جماعت تھی جسکا منی فیسٹو اسلام تھا۔ انیس شیروانی کے پاس جملہ مالی وسائل تھے جو سینیرس کو مرغ نمک پارے برفی اور چائے فراہم کر سکتے تھے۔ منور حسین شائستہ اور سنجیدہ آدمی تھے، پوری جماعت سے متاثر لوگوں میں دینداری اور دنیاداری کا نادر امتزاج ہوتا ہے۔ سید انور علی کو وہ امتزاج ہم میں نظر نہ آیا۔

انیس صاحب کے ساتھ الیکشن لڑانے والوں میں منجملہ اور سینیرس کے ایک سینئر استاد اظہر عرف استاد چھوارا اپنے سینیر پارٹی کے ساتھ تھے۔ مجھے اپنے امکانات زیر ونظر آئے لیکن ہماری پارٹی کسی طرح ہمارا نام واپس لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ خصوصیت سے

جبکہ ہم نے اپنا اعلان سید انور علی بیگ کے کنڈیڈیٹ سے پہلے کر دیا تھا، ہم حلقۂ ادب اسلامی کی نشستوں میں حاضری لگوا کر یہ سمجھے تھے کہ ہماری اجازت کے بغیر جماعت قدم اٹھائے گی یا نہ اٹھائے کم از کم ہم سے مشورہ تو کرے گی۔ ہماری ٹیم نے یہ مسئلہ انور علی صاحب کے ساتھ اٹھایا کہ ہم نے فیصلہ کرنے میں پہل کی تھی اس لئے انکا کنڈیڈیٹ بیٹھ جائے مگر انہوں نے یونیورسٹی میں اسلام کو غیر مسلم خطرات کمیونسٹ سازشیں اور ہندو ذہن سے خوف کا ایسا نقشہ کھینچا کہ ہمیں لگا منور حسین مولانا مودودی کے اس مکمل منشور کو علی گڑھ کی یونین میں نافذ کر دیں گے جو مولانا مودودی پاکستان میں نہ کرا سکے۔

انور علی صاحب نے وعدہ کیا کہ اگر ہم اُس سال بیٹھ جائیں تو آئندہ سال وہ ہمیں سپورٹ کریں گے۔ بہر حال ہماری ٹیم وہاں سے ناکامیاب واپس ہوئی تو انیس شیروانی ہمارے پاس خود تشریف لے آئے اور انہوں نے سید صاحب کی طرح نام واپس لینے کی ترغیب میں کوئی دینی عقلی نقلی دلیل تو نہ دی لیکن یہ واضح کر دیا کہ وہ ہر حال میں جیت رہے ہیں۔وسائل کی ان کے پاس فراوانی ہے،اس لئے اگر ہم اس سال بیٹھ جائیں اور ان کی حمایت کریں تو آئندہ سال وہ نہ صرف ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ جملہ اخراجات کے بھی کفیل ہوں گے۔

میں ذاتی طور پر بیٹھنے کے لئے تیار تھا کہ ہمارے بزرگوار اسینئر استاد چھوارا ایک شب میں چپکے سے تشریف لے آئے اور رازداری کے خیال سے وہ ایسی جگہ لے گئے جہاں ہم دونوں تھے اور تیسرا خدا تھا۔ پھر انہوں نے دھیمے لہجے میں فرمایا: ''میں انیس شیروانی کا چیف کنڈکٹر تمہیں جتانے کی خاطر بن گیا ہوں۔تم شوق سے الیکشن لڑو تمہارے چائے نمک پارے اور الیکشن کا خرچہ انیس شیروانی کے بجٹ سے آئے گا۔'' استاد پھر استاد تھے ہمارے لئے یہ پالیسی اختیار کرنا ناممکن تھا۔

استاد چھوارا کا تعلق بنگلور سے تھا انہوں نے غالباً ہائی اسکول میں ٹاپ کیا تھا لیکن

علی گڑھ کی سیاست میں آ کر وہ ہر سال ڈراپ کر رہے تھے۔ ۲۷ء کے زمانے میں ریاض الرحمان خاں شیروانی، سعید اختر، شفیق انجم وغیرہ کے ساتھ نیشنلٹ گروپ میں شامل تھے۔ کانگریسی نیشنلزم کے واسطے سے وہ ہمارے بزرگ پیر بھائی تھے۔اوران کا نسخۂ کیمیا ہماری کامیابی کی ضمانت تھا۔ہم سیاست کے بارے میں پہلے شش و پنج میں تھے اور اس تجربہ سے گذر رہے تھے جنکا آئندہ سال مزید تجربہ کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ذہن بن رہا تھا کہ ہمارے بس کی سیاست نہیں ہے، لیکن چند ٹھوکریں اور کھانی تھیں۔

ہم نے تنِ تنہا اس صورت حال سے تنگ آ کر اپنے ودڈرال (withdrawl) کا اعلان کر کے اپنے مخلص دوستوں کو خود سے بدگمان کر دیا۔ اور ہمارے گروپ کے پیر مغاں مولانا رفیع اللہ عنایتی کے پروگرام کو، کہ ہمارے اس پہلے قدم کے بعد ہمیں ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کے منصب تک جانا تھا، بہت بڑا دھچکہ لگا۔ اس گروپ سے کچھ تعلقات اس قدر کشیدہ رہے کہ اگلے سال ہماری حمایت کے لئے ان کا جوش خروش بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

ہم نے البتہ کسی کے حق میں دستبرداری نہیں دی تھی اس لئے دونوں طرف شکر گذاری نہ تھی، ہم چند دن سیاسی خلاء میں رہے۔

ادھر محمد امین بلبلیا جو بائیں بازوں کنڈیڈیٹ تھے اور سال گذشتہ احمد سعید انڈا کے اسلامی فرنٹ کے مقابلے میں ان سے الیکشن ہار چکے تھے اب صدارت کیلئے فرنٹ رنر تھے۔ بلبلیا اعلان شدہ ایس ایف کے پلیٹ فارم سے تھے اور مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے مانے جاتے تھے۔علی گڑھ کا اسلامک فرنٹ حرکت میں آیا اور اس نے تلاش کر کے ہمارے سینیر دوست شفیع قریشی کو کنڈیڈیٹ بنا دیا اور شفیع صاحب نے ہمیں اپنے نومینیشن کی تقریر کے لئے چن لیا۔

میرے تعلقات بلبلیا صاحب سے بھی تھے، اور اشتیاق محمد خاں کی پارٹنر شپ کے سبب ہمیں بہت سے لوگ یوں بھی کامریڈ سمجھتے تھے۔ لوگوں کی اس خوش فہمی میں کچھ ہماری

بداحتیاطی تھی اور کچھ خود اعتمادی۔ بداحتیاطی تو یہ تھی کہ ہم ہر اس حلقے میں شرکت کرتے تھے جہاں ہنگامہ ہوتا۔ اپنی نظمیں اور افسانے ہم ادب اسلامی میں بھی پڑھتے تھے اور ترقی پسند مصنفین میں بھی۔ اسلامی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے تھے اور ایس ایف کے جلسوں میں بھی۔ دوستی بھی ہماری دونوں حلقوں میں تھی اور علی گڑھ کے قیام سے اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہماری خود اعتمادی یہ تھی کہ مشائخ چشت کی نسبت، دیوبند کی تربیت اور جمعیۃ العلماء کی بیعت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ہمیں اپنے کمیونسٹ ہو جانے یا جماعت اسلامی میں شریک ہونے کا خیال بھی نہ آیا۔ اس لئے ہم آزاد امیدوار رہے۔ مگر بقول علامہ اقبالؒ:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں جینے کی پابندی وہاں مرنے کی پابندی

لیکن علی گڑھ میں کسی کے آزاد رہنے کا سوال نہ تھا، ہمارا چھوٹا سا قوم پرست مسلمانوں کا حلقہ بھی کوئی موثر نہ تھا اور ہر الیکشن میں اپنا موقف بدلتا رہتا تھا، ہاشم قدوئی صاحب کی دونفری یوتھ کانگریس (جس میں ظہیرالدین صاحب اور مسٹر بھٹاچاریہ ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمونہ تھے) ہمیشہ اینٹی کیمونسٹ رہتی اور ہمیں اس میں کبھی دلچسپی نہ رہی، میرے سامنے اپنے موقف کے سلسلہ میں چند چیزیں اس وقت بھی واضح تھیں اور اب بھی ہیں۔

۱- اسلامی عقائد اور عبادات کے مطابق زندگی گزارنا اور ان کو صحیح سمجھنا۔

۲- اپنی ہندوستانی ہونے پر فخر اور قومی زندگی میں شرکت کے دھارے کی کوشش۔

۳- خود پاکستان نہ جانے کا ارادہ اور دوسروں کو ایسا کرنے سے روکنا۔

۴- خود اپنی صحیح العقیدہ کانگریسی مسلمان (جمعیۃ العلماء والا) ہونے پر تیقن۔

۵- ہندو مسلم اتحاد و تفاہم کی اہمیت اور اس کے لئے کوششیں۔

۶- اردو سے محبت اور اس کی ترویج و اشاعت کی کوشش۔

۷- ھندی کو قومی زبان تسلیم کر کے جس کو قبول کرنا اور سیکھنا اور سکھانا۔

آج بھی میں ہندوستان اور امریکہ کے تناظر میں انہیں نظریات پر قائم ہوں۔
اب زندگی کے تجربات کے بعد میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات کی بحالی اور دوستی کو بھی ناگزیر سمجھتا ہوں۔ یہ دوستی نہ صرف مذہبی اور تہذیبی بنیادوں کو استوار کرے گی بلکہ پورے برّاعظم کے لئے اقتصادی اجتماعی اور تہذیبی ترقی کا راستہ کھولے گی۔ ہمیں تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے تاریخی فیصلہ کا احترام کرنا چاہیئے درحقیقت تینوں ملک ایک دوسرے کے بغیر مذہبی، تہذیبی، تاریخی، لسانی اور اقتصادی طور پر نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل امریکہ، چین اور روس کی دوستی سے نہیں ہوسکتی۔ اس کا واحد ذریعہ باہمی اتحاد، رواداری اور تعلقات ہیں۔ یہ تعلق اور تفاہم عین فطرت ہے۔ قدرت نے پورے خطۂ جنوبی ایشیا کو ایک جغرافیائی اور تہذیبی وحدت بنایا ہے۔ ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ایک دوسرے کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہیں گے۔

محمد امین بلبلیا اور شفیع قریشی صدارتی امیدوار:

صدارتی امیدوار بلبلیا بہت اچھے اور ولولہ انگیز مقرر تھے انکا تعلق جنوبی افریقہ سے تھا۔ اس زمانے میں جنوبی افریقہ کے کافی طلباء علی گڑھ آتے تھے۔ افسوس بلبلیا نے جنوبی افریقہ جاکر علی گڑھ کو اور اس قیادت کے کیریر کو بھلا دیا جس کے لئے علی گڑھ نے ان کو تیار کیا تھا۔ میں الیکشن میں بلبلیا کے ساتھ انکی اہلیت وذہانت اور جنوبی افریقہ کے مستقبل کی جدوجہد میں شرکت کے امکانات پر دیتا، مگر شفیع قریشی کے ذاتی تعلقات وجہ ترجیح بن گئے۔ اور ہمارے نیشنلسٹ گروپ کا رجحان بھی شفیع قریشی کی طرف تھا۔

شفیع قریشی اردو انگریزی دونوں میں بہت اچھے مقرر تھے شخصیت بھی دل آویز تھی۔ ان کے روم پاٹنر ہمارے عزیز اور ہم وطن دیوبندی دوست ''بوجی'' تھے (جن کا اصلی نام آج تک معلوم نہیں)۔ انکی وجہ سے شفیع صاحب سے تعلقات بڑھے اور دوستی میں تبدیل ہوگئے۔ اس وقت کشمیر کے طلباء کی ریل پیل تھی۔ شفیع قریشی کے علاوہ غلام نبی آزاد، مفتی محمد

سعید، شمیم احمد شمیم صحافی (مرحوم) غلام نبی ہا گرو اور مفتی طاہر اس دور کی نمایاں شخصیات تھیں۔

میرے اور قریشی صاحب کے خیالات میں ہندوستانی پاکستانی اور کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بہت فرق تھا۔ اکثر کشمیری مسلمانوں کی طرح یہ بھی حق خودارادیت کے قائل تھے اور اس کے ایڈوکیٹ تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کشمیر ہمارے ہندوستان کا حصہ رہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کا وجود ایک طاقت بنے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق مثبت خیالات میں ہم آہنگی تھی، بعد میں قریشی صاحب کے خیالات میں خود کشمیر کے مسئلہ پر تبدیلی پیدا ہوئی اور دروغ برگردن راوی انہوں نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق ناگزیر ہے اور اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ ایسا انہوں نے کنونس ہوکر کیا یا مجبوراً اسکا علم نہیں۔ اس فکری تبدیلی نے انہیں بہت نوازا یہ معلوم نہیں کہ کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے انہوں نے کیا خدمات انجام دیں۔ لیکن انہوں نے طوعاً وکرہاً یا خوش دلی سے کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ تسلیم کرلیا تھا۔

میں خود تو یونین الیکشن میں کنڈیڈیٹ نہ بن سکا شفیع قریشی کی کنڈکٹری کی حیثیت سے ہم نے نمایاں رول ادا کیا۔ وہ الیکشن ہار گئے اور بلبلیا جیت گئے۔ سیکریٹری کے لئے منور حسن خان بڑی اکثریت سے آ گئے۔ اس طرح ایس ایف کے پریزیڈنٹ اور جماعت کے سیکریٹری کا نیا محاذ یونین میں قائم ہو گیا سید انور صاحب اور منور حسن کا بڑا اسلامی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے یونین کے بجٹ میں ۶۰۰ روپیہ لیکچرس اسلام سیریز کے لئے رکھوائے تھے۔ اس طرح یونین میں ہر سال کچھ اسکالرس آکر اسلام کے کسی پہلو پر تقریر کرتے تھے اچھے سے اچھے مقررین کو سننے کے لئے حاضرین کو لانے کا اکثر مسئلہ ہوتا۔ ہندوؤں کی طرف سے لیکچرس پر اعتراض نہ تھا لیکن ادھر ان کی طرف سے یہ پریشر بھی تھا کہ مشاعرے کے ساتھ ساتھ قومی زبان ھندی کا کوئی سمیلن بھی ہو۔ میں بھی کوی سمیلن کے حق میں تھا کہ ہمیں قومی زبان کا احترام کرنا چاہیئے لیکن اسلام دوستوں نے اس سال کوی سمیلن نہیں

ہونے دیا۔ جسے بہت سے پر جوش مسلمانوں نے اسلام کی فتح سمجھا۔

برٹش گیانا کے مہمان:

یہ دور de-colonization کا تھا اور اس وقت کیربین کے ملک برٹش گیانا کے دو لیڈر چیڈی جگن اور برنہم (Burnahum) علی گڑھ آئے تھے دونوں ملکہ برطانیہ سے اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد کر رہے تھے۔ چیڈی جگن ہندوستانی نژاد تھے اور برنہم افریقن نسل کے تھے۔ ان دونوں کا یونین میں ایسا زوردار استقبال ہوا جو شاید ہی کسی کا ہوا ہو۔ اس جلسہ میں بلبلیا کی انقلابی تقریر کا آہنگ ابتک فردوس گوش ہے۔ ان دونوں مہمانوں پر پھولوں کی روایتی بارش نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ بلبلیا کی تقریر سے ہم کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھی گیانا پہونچ کر اس کی اینٹی کولونیل جدو جہد میں شرکت کر رہے ہیں۔ بعد میں لندن اور امریکہ میں ان دونوں لیڈروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں تو دونوں کو یونین کا استقبال اور پھولوں کی بارش یاد تھی۔ دراصل یونین کے پھولوں کی بارش کی زد میں جو مہمان آگیا وہ اسکو کبھی نہ بھولا۔

۲۰۰۵ میں یونین نے ہمیں بھی اپنے سوسالہ جشن کے موقع پر مہمان خصوصی بنا کر یہ اعزاز بخش دیا اور ہم بھی ان پھولوں کی برسات سے گذر گئے اور ہمیں بھی وہ لمحات ہمیشہ یادرہیں گے۔ گویا:

آپ کا ساتھ ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات بات پھولوں کی

اس سال ۱۹۵۳ اردو کے جملہ فرسٹ پرائز ہمارے حصے میں آئے تھے جسکا ایک سبب یہ تھا کہ احمد سعید اور عبید صدیقی اردو تقریری مقابلوں سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ہمیں اردو کے بہترین اسپیکر کا تمغہ سیفی فدا حسین گولڈ میڈل ملا۔ انوار علی خان سوز کو انگریزی کا میڈل اور دلنواز صدیقی کو اردو ونر کا۔ افسوس یہ دونوں ساتھی اب بچھڑ چکے ہیں۔

بعد میں مالی مجبوری کی وجہ سے ہم اور انوار علی خان اپنے میڈل بیچنے سنار کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ یہ تانبے پر سونے کا پالش ہے اور اسکی قیمت تیس روپے ہیں ہماری اطلاع کے مطابق اس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی ہم دونوں نے ملکر ذاکر صاحب کو عرضی بھیجی کہ اس گھپلے کو اہم سمجھا جائے لیکن انہوں نے فرمایا ''میڈل کا ملنا اعزاز ہے اور اسکی قیمت اعزاز نہیں۔'' میرا میڈل ممبئی میں (۵۶ء میں) چوری ہو گیا تھا اور اس کے سٹرفکیٹ کو دیمک کھا گئی۔'' ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

انجمن ترقی اردو کے ساتھ وابستگی:

ہم یونین کے سیاسی الجھن سے تو بچ گئے لیکن ایک دوسری سیاسی کشمکش میں نا سمجھی میں گھر گئے۔ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کا مرکز سلطان جہاں منزل علی گڑھ میں تھا۔ مولانا آزاد مولوی عبدالحق کے پاکستان سدھارنے کے بعد اسکی نشاط ثانیہ کے ذمہ دار تھے۔ ذاکر صاحب صدر تھے اور قاضی عبدالغفار صاحب سکریٹری جنرل۔ قاضی صاحب کے ''مجنوں کے خطوط'' اور ''لیلی کی ڈائری'' ہم پڑھ کر انکے معتقد ہو چکے تھے۔ ان کے خاص قرب اور انجمن کے ذمہ دار خیر بھورؔی صاحب تھے جنکی انجمن کے بعد بیٹھک اکثر فوق کریمی صاحب کی دکان پر ہوتی تھی۔ فوق صاحب ان دنوں اپنی دوکانداری سے زیادہ اردو کو اسکا جائز مقام دلانے کے لئے اقوام متحدہ جانے کی تیاری کر رہے تھے، اس سلسلہ کا پہلا ثابت اور آزمودہ قدم وہ اٹھا چکے تھے یعنی عالمی اردو کانفرنس کا سائن بورڈ بنوا کر انہوں نے دوکان کے سامنے استادہ کر دیا تھا۔

انجمن کے کاموں سے اور قاضی عبدالغفار صاحب کی قیادت سے حیات اللہ انصاری ایڈیٹر قومی آواز اور انکی شریک حیات خوش نہ تھے۔ یو پی انجمن کی قیادت انکے ہاتھ میں تھی۔ ہم حیات اللہ صاحب کے قومی آواز اور رشتۂ انصاریت کی وجہ سے قریب تھے لیکن

انجمن اور قاضی صاحب اور خیر بھوروی صاحب سے ہماری میکڈانلڈ میں رہائش کے سبب محلے داری تھی۔انجمن کا دفتر سلطان جہاں بلڈنگ میں تھا۔ہم نے خیر بھوروی صاحب کی ایما پر دو چار احباب کو جمع کر کے انجمن کی شاخ علی گڑھ میں قائم کردی۔اسکی صدارت کے لئے ہم نے انصار کی قدیم روایت کے مطابق خود کو نظر انداز کر کے محمد اسلم ابن مولانا حفظ الرحمٰن کا نام پیش کیا اور انہوں نے صدر ہوتے ہی ہمارا نام سیکریٹری کے لئے پیش کردیا،اب ہم دونوں انجمن (یو پی) کے مستند ووٹر ہو گئے تھے اور اسکے اجلاس لکھنو میں پہونچ کر انجمن یا قاضی صاحب کے مقاصد کے لئے حیات اللہ انصاری صاحب سے نبرد آزما ہو گئے۔وہ ہمارا عہد شباب تھا۔اب ہم ایسی غلطی خلیق انجم کے بارے میں کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔وہ ہر طرح چوکس آدمی ہیں۔وہ گوپی چند نارنگ کے دوست ہیں اور کسی سے انہیں خطرہ نہیں۔

جامعہ اردو کی خدمت اور شاگردی:

ایک دوسرا خوش گوار تجربہ ظہیرالدین علوی صاحب کی شاگردی میں جامعہ اردو کے کاموں میں شرکت تھی۔انھیں دنوں علوی صاحب کی دعوت پر نسیم قریشی صاحب لکھنو سے تشریف لائے اور جامعہ اردو کے معلم کی حیثیت سے کام شروع کردیا ہم ان کے متعلم بن گئے،نسیم قریشی،ظہیرالدین علوی سے کچھ کم غیر معمولی شخصیت نہ تھے۔پان انکی طاقت تھی سوتے جاگتے منہ کبھی نہ خالی رہا پان وہ لگاتار منہ در منہ کھاتے تھے۔پان انکے گھر کی شہزادی تھی اور وہ اسکے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے۔گفتگو کرتے تو پیک کے ساتھ اردو الفاظ اور لکھنو کے با محاورہ جملے پھولوں کی طرح جھڑتے اور آس پاس کے لوگوں پر،تکیوں، رومالوں اور تولیوں پر اپنے نقش چھوڑ جاتے۔اردو پڑھانے میں ان کو جس قدر لطف آتا تھا اتنا ہی ہمیں ان سے اردو پڑھنے میں آتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے انکا انتخاب اردو لیکچرر کے لئے ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی علی گڑھ

میگزین کے علی گڑھ نمبر کی ادارت ان کے حصہ میں آ گئی ،انہوں نے فوراً ہی ہمارا انتخاب منجملہ اور لوگوں کے میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈ کیلئے کر لیا۔اب ہماری اردو خاندانی ورثہ سے نکل کر تہذیب کے دائرے میں آ گئی،شعبہ اردو اور جامعہ اردو دو سال ہمارا اوڑھنا بچھونا نسیم صاحب اور علوی صاحب کی وجہ سے رہی۔ان سے ہم نے صرف اردو ہی نہیں سیکھی بلکہ اخلاص اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کی تربیت بھی پائی۔نسیم صاحب کے زیر سایہ میگزین کی ذمہ داریاں نبھا کر ہم نے علمی تحقیقی اور صحافتی تجربہ حاصل کیا۔

نسیم صاحب کبھی یو پی مسلم لیگ سرگرم لیڈر رہتے تھے علی گڑھ میں آ کر وہ سیاست ہو کر خالص اردو بن گئے۔لکھنؤ میں مشاعروں کی نظامت سے اسکو چار چاند لگاتے تھے علی گڑھ کے مشاعروں میں جاتے بھی نہ تھے۔

یونین ہال کے مغرب میں دو تین کمرے تھے جس میں سے ایک نسیم صاحب کے پاس تھا، دوسرا خلیل الرحمٰن اعظمی کے تیسرا مختار الدین آرزو کے۔ ہر شام وہاں غیر رسمی نشست ہوتی اور ادیبوں شاعروں اور شاگردوں کا مجمع رہتا ہمارے لئے فزکس کیمسٹری اور میتھ میں ایسی محفل کے مقابلے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بس دل پر جبر کر کے پڑھائی تو جاری تھی، گو بقول خود:

اک طرف مشق سخن دوسری جانب سائنس
یعنی عابد میاں ہر رنگ میں ڈھل سکتے ہیں

لیکن اس محفل اور ایسی محفلوں میں اشعار اور افسانے سنا کر ہم اپنی مستقبل کے امکانات کو روشن کر رہے تھے۔اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو ہم اپنے ہی دیس اور احباب میں ایسے اجنبی نہ ہوتے جیسے آج ہیں۔ ہماری تہذیب میں شاعری اور افسانہ نگاری انسان کو ادیب اور علامہ بناتے ہیں۔کوئی اور علمی اور ادبی کام نہ اس کا پیٹ بھر سکتے ہیں اور نہ اسے مقبولیت سے نواز سکتے ہیں۔

ہم نے جامعہ اردو سے ادیب کامل فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا سرٹیفکیٹ ملا تو اس میں ولدیت حامد الانصاری غازی کے بجائے حامد اللہ افسر تھی۔ وہ سرٹیفکیٹ واپس کیا اور آج تک دوسرا سرٹیفیکیٹ لینے کی فرصت نہ ملی۔ حالاں کہ ہمارے دوست قاسم صدیقی اس کے وائس چانسلر رہے تھے۔

ہم سے ایک بار ظہیر الدین علوی صاحب نے فرمایا تھا کہ امریکہ میں کسی صاحب کو جامعہ اردو کی ڈگری کی وجہ سے امریکن یونیورسٹی میں پڑھانے کا کام مل گیا تھا۔ ہمیں ۱۹۷۴ میں خود اس کا تجربہ ہوا جب یونیورسٹی آف منی سوٹا میں ہمارا جنوبی ایشین اسٹڈیز میں تقرر ہوا اور ہم نے وہاں جامعہ اردو کے سہارے اردو اور مدارس کی درسیات کے سہارے فارسی پڑھائی، غرض ع:　رکھ لی خدا نے میری شاعری کی لاج۔

سائنس سے آرٹ سائڈ۔ ذاکر صاحب کا حکم نما مشورہ:

علی گڑھ کی سیاسی سماجی زندگی کی اتنی اہم مصروفیات میں ہمیں فزکس کیمسٹری کو پڑھنے کی کہاں فرصت تھی، ہمارے میتھمیٹکس کے استاد کاظمی صاحب پر یہ بات عیاں تھی کہ ہمارا ذہن دو جمع دو کے لئے نہیں بنا اور انہوں نے اشارتاً یہ بات ہم پر واضح کر دی تھی۔ فزکس میں ہمارے کلاس فیلو سید ظفر احمد اپنے موتیوں کی طرح لکھے ہوئے نوٹس کو نقل مارنے کو دیدیتے لیکن سید شفیع کی طرح انہیں امتحان کے زمانے میں پتہ مار کر پڑھانے کی فرصت نہ تھی۔ ہمارے فزکس کے استاد ڈاکٹر رئیس صاحب (ڈاکٹر شکتی رئیس کے شوہر) تھے جو بہت اچھے استاد اور شفیق بزرگ تھے۔ انہیں ہمارے فزکس میں حال زار کا اندازہ تھا ایک دن انہوں نے اپنے دفتر میں طلب کیا اور پہلے مسکرا کر پھر سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور تھوڑی بہت پرسش احوال کے بعد فرمایا: ''اگر آپ میرا مشورہ قبول کریں تو فزکس کے بجائے کوئی اور مضمون کا انتخاب کریں جو آپ کے ذوق سے مطابقت رکھتا ہو۔''

میں نے انہیں سنجیدہ ہو کر محنت کا یقین دلایا تو محسوس ہوا وہ ہماری سنجیدگی کے

وعدہ سے مطمئن نہیں تھے مگر نصیحت کے علاوہ وہ کر بھی کیا کر سکتے تھے۔اب تھرڈ ایر میں سال کا اکثر حصہ گذر چکا تھا اور باقی وقت گزارے بغیر چارہ نہ تھا، اگر ہم پاس بھی ہو جاتے تو فورتھ ایر کے مسائل کا مشکل کشا کون ہوتا؟ کاظمی صاحب کی تادیب رئیس صاحب کی فہمائش کو کسی استاد کامل کی ضرورت تھی جو قول فیصل کے ساتھ ہمیں سائنس سائڈ سے آرٹس سائڈ میں پہونچادے، یہ کام ذاکر صاحب نے انجام دیا۔ذاکر صاحب نے اس موضوع پر ہمارا ڈائیلاگ ہمارے مضمون ''ذاکر صاحب'' میں پوری تفصیل سے آچکا ہے۔جب تھرڈ ایر میں ہمیں ڈھیروں فرسٹ پرائز ملے اور سیفی فدا حسین بہترین مقرر کا تمغہ ہمارا مقدر بنا تو ذاکر صاحب کی مشفقانہ نظریں ہم پر مرکوز ہوگئیں۔

ایک شام کو وی سی لاج کے لان میں جب بنواری فوٹو گرافر اپنے کیمرہ کا فوکس درست کرنے میں لگا ہوا تھا ذاکر صاحب نے ہماری علوم سائنس سے بے اعتنائی اور ادب و سیاست سے ہماری دلربائی دیکھ کر ہماری قسمت کا اس دن فیصلہ کر دیا کہ سال آئندہ ہم سائنس سائڈ چھوڑ کر آرٹس سائڈ میں منتقل ہو جائیں اور تھرڈ ایر کا آرٹس سائڈ سے پھر بی۔ اے کا آغاز کریں۔اس طرح ہمارا کیریر بدل گیا۔

ذاکر صاحب نے ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے فرمایا:''میں نے جو کچھ آپ سے کہا ہے وہ مشورہ نہیں ہے حکم ہے اس پر آپ عمل کریں۔'' پھر انہوں نے اپنا وہ تاریخی جملہ دہرایا جسے ہم نے ان کے قلم سے اپنی بیاض میں محفوظ کر لیا اور وہاں سے دل کی بیاض پر منتقل کر لیا اب بھی وہ جملہ سن لیں، اسے دل کی بیاض پر منتقل کر لیں اور عمل کے لئے شمع راہ بنالیں۔'' جو کام کرو دل لگا کر کرو، اگر وہ کام اس قابل ہے کہ کیا جا سکے تو اس قابل بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے۔''

علی گڑھ تیسرا سال۔
تعطیلات
مئی۔جولائی ۱۹۵۴ء
حیدرآباد کا سفر

تھرڈ ایر کے اواخر میں معید خاں (لاحول ولا) کی نظرِ انتخاب منجملہ اور لوگوں کے مجھ پر بھی پڑی کہ میں اُس وفد میں شامل ہوں جو حیدرآباد جا کر مسلم یونیورسٹی کی ڈیوٹی سوسائٹی کے لیے چندہ جمع کرے۔اس وفد کے دو اہم سینئرس کے نام عزیز احسن اور ثمو بھائی تھے اور ایک اور میرے دوست اور کلاس فیلو آصف علی تھے۔ یہ دعوت میرے لیے مژدہ سے کم نہیں تھی۔اول تو اس نے گرمی کی تعطیلات میں مجھے ایک مشغلہ دیدیا تھا ورنہ مجھ بے گھر کے لیے علی گڑھ کے قیام میں سب سے بڑا مسئلہ گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کا ہوتا تھا۔ دوسرے حیدرآباد کا تصور شمالی ہندوستان میں اس دور کے یوروپ اور امریکہ سے کم نہ تھا۔ ہرچند پولس ایکشن کے بعد اس کی تہذیبی اور سیاسی طاقت مجروح ہوئی تھی لیکن عثمان علی خاں والی ریاست کے تدبر نے حیدرآباد شہر اور سکندرہ کو بچالیا تھا اور حکومت ہند اور اس کی سیکولر جمہوری قیادت کی وسعت قلبی نے مفتوح نظام کو تخت سے اتار کر راج پرمکھ کی کرسی پر بٹھادیا تھا۔اس لیے زوال حیدرآباد کی اصل کہانی پولس ایکشن نہیں بلکہ مجلس اتحاد المسلمین کے رہنما قاسم رضوی اور حیدرآباد کے پرائم منسٹر لائق علی خان کی ناعاقبت اندیشی کی ہے۔کیوں کہ:

اس کو پڑھ نہیں پائے قوم کے نئے رہبر
بام و در پہ لکھیں تھیں وقت نے جو تحریریں

(عابدؔ)

الحاق کی گفتگو فیل ہونے کے بعد پولیس ایکشن حکومتِ ہند کا آخری عمل تھا او راس نے ریاست حیدرآباد میں تباہی مچادی۔ جو کچھ گئی گذری حالت میں میر عثمان علی خان

(نظام حیدرآباد) نے بچالیا وہ ان کی دوراندیشی اور تدبر تھا۔میری نگاہ میں نظام برصغیر کے واحد حکمران ہیں جنہوں نے اپنے مقبرہ کے بجائے اپنی رعایا کے لئے مستقبل کا تاج محل تعمیر کیا اور شکست فاش کے بعد حالات سے صلح کر کے تمام اہالیان حیدرآباد کو زندگی کو نئے حالات میں نئے عنوان سے تعمیر کا حوصلہ دیا۔حقیقت یہ ہے کہ نظام نے حکومت ہند اور وقت کے تقاضوں کے سامنے جھک کر قوم کے سر کو بلند ہی نہیں کیا بلکہ اس کو نئے زمانے کے نئے امکانات کو استعمال کرنے کا نیا راستہ بھی دکھایا۔حیدرآباد نظام کی فہم و تدبر کی وجہ سے ایک خطۂ زمین نہیں رہا بلکہ ایک تہذیب بن کر ساری دنیا میں پھیل گیا۔آج بھی حیدرآباد ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کا ایک جزیرہ ہے،اس تہذیب کا سرچشمہ اب تعصب و تنگ نظری کی گرمی سے اپنے وطن دوآبہ میں خشک ہو چکا ہے۔

ہمارے خاندان کا بھی ایک حصہ حیدرآباد میں آباد تھا۔رامنتا پور،عثمانیہ یونیورسٹی سے قریب تھا جہاں ہمارا ددھیالی خاندان آباد تھا۔مغل پورہ،عنبر پیٹھ اور لال ٹیکری میں بھی بہت سے اعزاء بسے ہوئے تھے۔میں نے معید خان صاحب کی یہ دعوت فوراً قبول کرلی لیکن جب معلوم ہوا کہ اس کارواں کے میرِ کارواں ٹمو بھائی ہوں گے تو میں نے معذرت کردی۔ٹمو بھائی ایم ایڈ کے طالب علم تھے۔ان کے والد حفیظ الرحمٰن صاحب ایجوکیشنل کالج کے پرنسپل تھے اور علی گڑھ کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار تھا۔ٹمو بھائی سے میری ملاقات نہ تھی وہ روایتی سینیر تھے اور ان کے بارے میں جو سنا تھا اس سے ان سے خوف آتا تھا۔ان کے بھائی احسان سے فرسٹ ایر میں میری ہاتھا پائی ہو چکی تھی۔دراصل ہاتھ ان کا تھا اور پائی میری تھی۔ٹمو بھائی سے دستکش رہنے کا ایک اور سبب بھی تھا۔

ان کی کلاس فیلو سلمٰی اقبال مشہور شاعر علامہ اقبال سہیل کی صاحبزادی تھیں۔ہم سلمٰی اقبال سے تو واقف نہ تھے لیکن علامہ اقبال سہیل کے عقیدت مندوں میں تھے۔سب کا خیال تھا کہ سلمٰی اقبال ایم ایڈ میں ٹاپ کریں گے۔وہ امتحان کے لیے رکشا لے کر نکلیں تو

انہیں معلوم ہوا کہ کسی بد بخت نے یونیورسٹی کے در و دیوار پر لکھ دیا ہے۔ ''کل رات سلمیٰ اقبال رکشا والے کے ساتھ پکڑی گئی۔'' سلمیٰ آپا پر اس وقت کیا گذری ہوگی اس کا کسی کو کیا اندازہ ہوسکتا ہے، وہ رو دھو کر گھر چلی گئیں اور ٹمو بھائی نے ٹاپ کرلیا۔ اس واقعہ میں ہر طرف جہاں سلمیٰ اقبال سے اظہار ہمدردی تھا وہاں ٹمو بھائی کا نام لیا جا رہا تھا۔ اصل حقیقت کی خبر خدا کو تھی یا دیوار پر لکھنے والے کو، ٹمو بھائی امتحان پاس کر کے لیکچرر بنے ریڈر اور پروفیسر رہے لیکن یونیورسٹی میں یہ بات زباں زد رہی کہ ان کے والد کا اثر اور ان کی اپنی تدابیر کا اس کامیابی میں کافی سے زیادہ دخل رہا۔

ہم ٹھہرے جونیر کہاں جھوٹ سچ کی تصدیق میں پڑتے۔ اور اگر ہم علی گڑھ کی افواہوں کی تصدیق میں لگ جاتے تو یہ فل ٹائم جاب سے کم نہ تھا۔ ہم نے معید خاں صاحب سے جا کر سفر سے معذرت کر دی اور اس کی اصل وجہ بھی بتا دی۔ انہوں نے تذکرتاً یہ بات ٹمو بھائی سے کہہ دی۔ میرا نام یونین کے واسطے سے ٹمو بھائی کے کان میں پڑ چکا تھا۔ لیکن ہم یوں بھی جونیر تھے، وہ ناراض ہو کر مزاج پرسی کی غرض سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ میکڈانلڈ میں آئے ہماری تلاش کی خوش قسمتی سے میں موجود نہ تھا۔

ع رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

سیّد عزیز احسن، سیّد آصف علی اور یہ خاکسار:

بعد میں میں نے معید خاں سے اس بات کی شکایت کی اور آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور انہوں نے معاملے کو رفع دفع کرا دیا اور سلیقہ سے سمجھا بجھا کر ٹمو بھائی کو وفد سے باہر کر دیا۔ یا وہ خود اپنی دوسری مشغولیات کا شکار ہو گئے۔ غرض آصف علی اور میں عزیز احسن کی رہنمائی میں حیدرآباد کے لیے تیار ہو کر روانہ ہو گئے۔ حیدرآباد میں ہمیں علی گڑھ کلب لکڑی کے پل پر قیام کرنا تھا اور نواب ناظر یار جنگ صدر علی گڑھ اولڈ بوائز کلب کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا تھا۔ دلی سے حیدرآباد ٹرین کا راستہ دشوار تھا۔ قلیوں کی مدد

سے ہم گاڑی میں ٹھونس دیے گئے اور پھر مجھے عزیز احسن اور آصف علی نے سامان والے تختہ پر خطرات سے محفوظ کر کے لٹا دیا۔ جگہ رزرویشن کرنے کا یہی طریقہ تھا اور خطرات سے خالی نہ تھا۔

عزیز احسن اور آصف علی کھڑکیوں پر پہرے دار بنا دیے گئے کہ جو دروازہ چھوڑ کر کھڑکی سے اندر آئے اسے دھکا دے کر باہر واپس کر دیں۔ لیکن دو ہٹے کٹے مستعد لوگوں نے انہیں پسپا کر کے کھڑکی سے خود کو قسط وار داخل کرالیا اور پھر ان نو واردوں نے کھڑکی کی چوکیداری عزیز احسن اور آصف علی کو معزول کر کے خود سنبھال لی اور کمال خوبی سے اس فرض منصبی کو حیدر آباد تک انجام دیتے رہے۔

ہٹوں کٹوں کا تعارف ہوا تو پتہ چلا یہ دونوں حضور نظام کے نمائندے ہیں اور مولانا و مجتہد علی نقی صاحب کو لے کر حضور نظام کی دعوت پر حیدر آباد جا رہے ہیں ان میں ایک صاحب کا نام لطیف تھا اور دوسرے کا نسب زیدی۔ یہ دونوں حضرات حیدر آباد میں ہمارے خاص میزبان بنے رہے۔ انہوں نے حیدر آبادی میزبانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

حیدر آباد پہونچے تو معلوم ہوا حیدر آباد پھر حیدر آباد ہے۔ یہ ہندوستان جسے ہم ہندوستان کہتے تھے اس کا حصہ نہیں لگ رہا تھا۔ ہر طرف شیروانیاں، ترکی ٹوپی پھندنے سمیت، بلند بالا قد والے مرد اور برقعے اور چادر میں پوشیدہ خواتین حیدر آباد کے آرکیٹکچر کی نفاست اور قدامت کی طرح ہر دو اصناف مرد و زن ہم آہنگ۔ ہر بات پر ''ہاؤ'' اور ''جی ہاؤ'' انکساری ایسی کہ ہر وقت ان کی منڈی ہمارے پیٹ میں گھس جاتی تھی۔ میٹھی باتیں اور کھٹے کھانے، وہاں علی گڑھ برادری نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جو علی گیرین نہیں تھے وہ بھی علی گڑھ کے نام پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جو بچ رہتے وہ جامعہ اردو سے تعلق کی بنیاد پر مہربان ہو جاتے۔

عزیز احسن کی قیادت بہت کامیاب تھی۔ ان کے بھی بہت سے اعزاء دار الشفاء میں آباد تھے۔ عزیز احسن سنی تھے یہ لوگ شیعہ تھے عزیز احسن کے مارہرہ کے خاندان میں

شیعہ سنی ازدواج کا رواج تھا۔ پھر انہوں نے برسوں موسم گرما میں حیدرآباد سے آنے والی لڑکیوں کے لیے ورک کر کے حیدرآباد میں اپنا ایک خاص مقام بنا رکھا تھا۔ انہوں نے فورتھ پیپر کے ذریعے جن لڑکیوں کو کامیاب کرایا تھا اب ہم سب ان کے خاندان کا لطف مہمان نوازی لے رہے تھے۔

جب محترم ظہیرالدین علوی صاحب (شیخ الجامعہ جامعہ اردو) کو ہماری روانگی کی خبر ملی تھی تو انہوں نے جامعہ اردو کے امتحانات کے متعلق خصوصی ہدایات دیں تھیں۔ وہاں جامعہ اردو کے مراکز قائم تھے۔ مراکز کی اقتصادیات اور سیاسیات تھیں۔ ہمارے معاملہ میں ان کا حسن ظن دعوتوں میں بدل جاتا تھا۔ ایسی محبت، عزت افزائی اور مہمان نوازی تو شمالی ہندوستان میں داماد کو بھی نصیب نہیں ہوتی جو ہم کو حاصل تھیں۔ دعوتیں اور محفلیں عزیز احسن کے حسین مزاح سے قہقہ زار بن جاتیں۔

عزیز احسن نے اپنے اور ہم نے اپنے اعزاء ڈھونڈ لیے۔ آصف علی اس مقابلے میں بے چارے ہی رہے۔ لیکن حیدرآباد کی آوارہ گردی نے اور اپنی رطب اللسانی نے انہیں بھی قافلہ بنا دیا تھا۔ ہم خالی وقت میں اپنے عزیزوں میں مشغول ہو جاتے تھے تو وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرے رہتے۔

علی گڑھ کلب سے متصل لال ٹیکری میں ہمارے بہنوئی (کزن طاہرہ آپا کے شوہر) احسان انصاری رہتے تھے جو رامنتاپور کی اپنی شاندار کوٹھی چھوڑ کر چھوٹے سے کوارٹر میں اپنی سالی کے گھر سی (C) کوارٹر میں پناہ گزین تھے۔ وہ دل کے مریض تھے اور رامنتاپور شہر ڈاکٹروں سے دور تھا۔ وہ موسم آموں کا تھا اور احسان انصاری صاحب روزانہ ہی ہمارے آم نوازی خصوصیت سے فرما کر ہمارے میزبان بنتے رہتے تھے۔ احسان انصاری مشہور شاعر آزاد انصاری کے بیٹے تھے آزاد انصاری قآنی ہند کہلاتے تھے۔ یعنی ان کی شاعری نثر کی طرح قواعد کے مطابق ہوتی تھی۔ وہ اس دور کے مقبول شاعر تھے ان کا ایک شعر بہت

مقبول ہوکر زبان زد ہو گیا تھا۔

افسوس کتنے سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

احسان صاحب کی پہلی شادی ہماری پھوپی سے (ابا جان کی کزن امت الرحمٰن) سے ہوئی تھے۔ ان سے پانچ لڑکے اور دولڑکیاں تھیں۔ سب بچے تعلیم سے فارغ ہوکر پاکستان جاچکے تھے۔ان کی دوسری شادی ہماری کزن طاہرہ آپا سے ہوئی اوران سے ان کے چارلڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ وہ سب لال ٹیکری کے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے۔ گھر میں جگہ کم مگر دلوں میں کشادگی بہت زیادہ تھی۔

ہمارے کام کی نوعیت یہ تھی کہ ہم تینوں علی گڑھ کے نمائندوں کے ساتھ دھکے کھانے کے لیےکوئی تیار نہ تھا۔ہم تینوں صبح ۶/ آنے روز پر سائیکلیں کرائے پر لے کرلکڑی کے پل کی قیام گاہ سے نکلتے تھے۔تین بجے واپس آکر لنچ تناول کرتے۔پھر قیلولہ کرتے اور رات میں کہیں نہ کہیں دعوت کھاتے۔ جہاں حیدرآبادیوں کا اخلاق مہمان نوازی میں بلند تھا وہاں چندہ دینے میں پست تھا۔ یہ غالباً اس وقت کے حالات کا اثر تھا کہ جو غریب نہیں تھے انہوں نے بھی اپنے اوپر غربت طاری کررکھی تھی۔غرض دردر کی خاک ہم چھانتے رہے اور ایک سے ایک عجائبات دیکھتے رہے۔ ہر میک کی شاندار گاڑیاں پیٹرول سے محروم یادِ ماضی کی یادگار گیراج میں آرام سے کھڑی تھیں۔کمروں کی زیبائش پوری تاریخ کی آئینہ دار تھی۔درودیوار اور ماضی کی کہانی تصویروں کی زبانی بیان کرتے ہوئے۔فرنیچر گویا میوزیم سے لاکر لگا دیا گیا ہے۔کھانا چائے پان اور پھر عطریات سے تواضع مگر نقد غائب۔حالات کے لیے ہرایک شکوہ سنج، ماضی کی تاریخ کے صفحات میں گم۔ مستقبل سے مایوس۔

ہمارے بزرگوار احسان صاحب اوران کا پورا خاندان سیاست سے کرکٹ تک پاکستانی تھا۔اخبار کے بھی وہی حصے پڑھتے تھے جو پاکستان سے متعلق ہوتے۔کرکٹ والے

صفحات کو بار بار پڑھ کر محفوظ کر لیتے خاص طور پر اگر اس میں پاکستان کی جیت کا ذکر ہوتا یا حنیف محمد خاں کا اسکور ہوتا۔ ہمارے ایک دوسرے پھوپا معزالدین صاحب رامتاپور میں رہتے تھے ان کا تعلق جون پور سے دیکھا۔ان کا قیام رامتاپور کی ماڈرن کوٹھی میں تھا۔ وہ لاولد تھے۔گھر میں نوکر چاکر سے چہل پہل تھی۔ میں پہلی بار پہونچا تھا۔سب ملازمین نے چاند میاں کہہ کر استقبال کیا۔میرا دل دماغ چاند چاند ہو گیا۔زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا ہمیں کوئی چاند کا مشابہ سمجھے گا۔تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ چاند میاں احسان صاحب کے لڑکے ڈاکٹر نجمی کا حیدرآبادی خطاب ہے۔وہ پاکستان (لاہور) میں ڈاکٹر تھے۔میں نہ صرف ان سے مشابہ تھا بلکہ ان کے سب بھائیوں سے بھی مشابہت تھی۔یہ خاندان اپنی آئیڈلوجی کی آئیڈیل سرزمین پاکستان چلا گیا تھا جو اس وقت حیدرآباد میں باقی تھا وہ بھی آہستہ آہستہ پاکستان روانہ ہوتا رہا۔پھر وہاں سے مواقع کی سرزمین کنیڈا اور امریکہ آ کر بس گیا۔

مجھ پر ان کا اس مشابہت سے ایک فائدہ ڈاکٹر نجمی کو ہوا۔ ان کا پیغام ہماری پھوپی امت الدیان (ان کی خالہ جان) نے حیدرآباد میں دے رکھا تھا۔ وہ لوگ تیار نہ تھے۔ایک تو انہوں نے لڑکا نہیں دیکھا تھا دوسرے ڈاکٹر کے گھوڑے جوڑے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ پہلا مسئلہ تو پھوپی جان نے مجھے دکھا کر حل کر دیا کہ اصل کی کاربن کاپی ہے۔ مجھے اس تجربہ سے بہت تقویت ہوئی۔ میں اپنی صحت اور قد و قامت کی وجہ سے کم و بیش شادی سے مایوس تھا۔ اوائل شباب کی اس پراکسی (Proxy) نے مستقبل کے امکانات کو تقویت بخش دی۔گھوڑے جوڑے کی بات کے جواب میں پھوپی جان کو اس یقین دہانی میں خاصی دشواری پیش آئی کہ ''ہم دیوبند کے خاندانِ علماء میں سے ہیں اور گھوڑے جوڑے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔نہ ہمارا مطالبہ ہے اور نہ ہم لیں گے۔'' اس کے ماننے میں لڑکی والوں کو یہ اشکال تھا کہ پھر سسرال میں لڑکی کی عزت نہیں ہوگی اور اس کو طعن و تشنیع سے نوازا جائے گا۔ پھوپی جان نے کسی نہ کسی طرح بات منوالی اور ڈاکٹر نجمی کی شادی

ہوگئی۔ بعد میں یہ پورا خاندان پاکستان منتقل ہوگیا اور وہاں سے کنیڈا اور امریکہ میں آ کر رس بس گیا۔ڈاکٹر نجمی جولائی ۲۰۱۳ء سان ڈیاگو میں سدھار گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی اولا دان کی ہم پیشہ ہے اور امریکہ میں شادوآباد ہے۔

ہمارا خاندان۔دیوبند اور علی گڑھ:

دیوبند کے علماء کا ذکر آیا تو یہ بتادوں کہ ہمارے خاندان کا تعلق دیوبند اور علی گڑھ سے یکساں ہے۔ یہ پھوپیاں مولانا رشید احمد انصاری اور دادی اسلامن کے صاحبزادیاں تھیں۔مولانا رشید احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے صدرِ شعبہ تھے اور مولانا عبداللہ انصاری (ڈین شعبۂ دینیات) کے داماد تھے۔مولانا عبداللہ انصاری کو سرسید بڑی کوشش وکاوش سے علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کا صدر بنا کر لائے تھے۔مولانا عبداللہ انصاری مولانا قاسم نانوتوی کے داماد، دارالعلوم دیوبند کے پہلے گریجویٹ اور مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی (معلم اول دلی کالج) کے نواسے اور شاگرد تھے۔مولانا مملوک علی، سرسید، مولانا قاسم، مولانا نذیر احمد، مولانا ذکاءاللہ غرض ہمارے صف اول کے محسنین کے علم وادب کے استاد تھے۔غرض ہمارے خاندان کا تعلق علی گڑھ اور دیوبند دونوں تعلیمی اداروں اور تحریکوں سے مساویانہ ہے۔

ہمیں حیدرآباد میں محبتوں کے بہت سے تحفے ملے۔پھوپا معزالدین کے ذریعہ ہمیں ان کے کزن نواب خلیل الرحمٰن (جون پوری، مقیم علی گڑھ) کا بہت خاص اور بابرکت تحفہ ملا۔ ان سے علی گڑھ کی ملاقات اور ان کی فیملی کی شفقتوں نے میری محرومیوں کو نیا عنوان دے دیا۔ اور وہ یادیں احساس شکرگذاری کے ساتھ ساتھ آج تک دل کے نگارخانے میں بسی ہیں۔ جومحبت مجھے اپنے گھر میں میسر نہ آسکی وہ نواب خلیل صاحب اور ان کے خاندان نے نوازدی:

خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

حیدرآباد کی ایک بہت خاص یاد باغ عام کی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی تھی جو ہم تینوں اس ذوق وشوق سے انجام دیتے کہ وہاں سابق والیِ حیدرآباد اور راج پرکھ میر عثمان علی خاں کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ مسجد میں خطبہ بھی ان کے نام کا تھا اور اس میں میر عثمان خان کے نام کے بعد بانگ دہل خَلَّدَ اللّٰهُ مُلْكَهُ وَسَلْطَنَتَهُ کا اعلان ہوتا۔

ہمیں اس وقت تعجب ہوا تھا کہ کیسے یہ ایام ماضی کی یادگار کو مستقبل کا حصہ بنا رہے ہیں۔ لیکن اب نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے بہت بعد ہم نے اسلام آباد کی ایک جامع مسجد کے خطبہ عید میں اور جامعہ ملیہ اوکھلا کی ایک مسجد میں خطبہ جمعہ میں کئی سو برس پہلے کے عباسی خلیفہ کے نام کے ساتھ یہی الفاظ کو سنا اور سر کو دھنا۔ اور جب ہم نے امام صاحبان کی توجہ اس طرف دلائی کہ اس خلیفہ کی وفات کو کم وبیش نو سو سال ہو چکے ہیں تو انہوں نے شائع شدہ خطبہ دکھا کر ہماری غلط فہمی کی اصلاح کر دی۔

عزیز احسن نے مزید قیام کا ارادہ کیا ان کا خیال تھا کہ دار الشفاء میں ان کے دردِ دل کا علاج ہے۔ آصف میاں اور میں بمبئی روانہ ہو گئے۔ زادِ سفر اور علی گڑھ کے اول چھ ماہ کے لیے طاہرہ آپا نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ بگھارے بیگن کا عظیم المرتبت مرتبان ساتھ کر دیا۔ جس کی طویل رفاقت حیدرآباد کی مختصر ملاقاتوں کو علی گڑھ میں جاودانی کرتی رہی۔

ہم نے دو ماہ کے خون پسینہ کی قربانی دے کر چھ سو روپیہ جمع کیا تھا میں یہ رقم حضور نظام کی نوازشات اور علی گڑھ اور میڈیکل کالج کے لیے خصوصی عطیات کے مقابلے میں بہت حقیر تھی لیکن اس میں جس جذبہ اور دیوانگی کا اثر تھا وہ شاید قابل قدر تھا۔ اور جن بگڑے ہوئے حالات میں لوگوں نے معاونت کی وہ اعتراف کے قابل تھے۔

حیدرآباد کی یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے اور شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے سبق آموز کہ جس قنوطیت کا ہمیں شمال میں سامنا کرنا پڑا تھا کچھ عرصے میں ہی حیدر آبادیوں نے اسے اتار پھینکا۔ مشرق وسطی نے بھی تیل کی برآمد کے ساتھ انسانوں کی درآمد

میں حیدر آبادیوں کے حقوق کا خیال رکھا۔حضور نظام نے مدتوں ملک عبدالعزیز کی مالی معاونت کی تھی۔سعودیوں کو حیدر آباد کے احسانات یاد تھے۔حضور نظام کی یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں نے ان حیدر آبادیوں کو تعلیمی طور پر تیار کیا تھا۔ان مواقع کا حیدر آباد نے خوب فائدہ اٹھایا۔اور اٹھا رہے ہیں۔اپنی زندگی کی تعمیر کے ساتھ یہاں اہل خیر دامادم تعلیمی،ثقافتی اور رفاہی ادارے بنا رہے ہیں۔یہی نہیں بلکہ حیدر آبادیوں نے مشرق وسطی اور پاکستان کے علاوہ امریکہ،کنیڈا اور یوروپ(بالخصوص شکاگو)،میں اپنے نئے حیدر آباد قائم کر دیئے ہیں۔اور اپنے مولد و وطن اصلی کو بھی نہیں بھولے۔

بمبئی آمدن ارر فتن:

حیدر آباد سے واپسی پر بمبئی میں ہم نے والد صاحب کو سخت بیمار اور نحیف ونزار دیکھا زندگی کی امید بھی ختم ہو رہی تھی۔انہیں بمبئی کے حاذق الحکماء حکیم حیدر بیگ کا علاج میسر آ گیا اور وہ خطرے سے باہر آ گئے لیکن صاحب فراش تھے۔چند دن بعد آصف میاں بمبئی گھوم کر اپنے گھر کی کانپور چلے گئے اور ہم نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ہماری تعلیم پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی۔اب ہم فیملی کی خدمت کریں گے۔والد صاحب کو آرام پہونچائیں گے اور بہن اور بھائیوں کی تعلیم سے اپنی ذوق علم کی تسکین کریں گے۔

میری خوش قسمتی یا محرومی،گھر کے حالات نے رکنے کی اجازت نہیں دی حالاں کہ میں نے بعض احباب کی مدد سے عطر یا پان کے کھوکے(چھوٹی چھوٹی سی دکان)یا اپنے دوست فرید انجم سلمانی کے سیلون میں حجامت کی تربیت کا انتظام شروع کر دیا تھا۔ابا جان نے اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود مجھے حکماً علی گڑھ جا کر تعلیم کی تکمیل کا حکم دیا اور یقین دہانی کرائی:''تم تعلیم جاری رکھو یہاں تک کہ پی ایچ ڈی کرو۔میں تمہارے لیے انگلینڈ اور امریکہ میں اعلی تعلیم کا انتظام کر دوں گا۔'' ابا جان کے حکم میں ان کی زندگی کی ساری مجبوریاں سمٹ آئی تھیں۔لیکن ان کی مجبوریوں میں بھی امید کی شمعیں روشن تھیں۔

والد صاحب کی حالت دیکھ کر مجھے یہ بھی امید نہیں تھی کہ میں واپس آکر ان کو دیکھ سکوں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت بھی دی اور ان کے ایمان کے تیقن نے میرے لیے لندن اور امریکہ کی راہوں کو ہموار کر دیا۔ ع

گفتہ او گفتہ اللہ شود
گر چہ از حلقوم عبد اللہ شود
اس کا کہا خود اللہ کا کیا ہوجاتا ہے
اگرچہ وہ اللہ کے بندے کا کیا ہوتا ہے

میں بادلِ ناخواستہ بمبئی سے رخصت ہوکر علی گڑھ پہونچ گیا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ اگر ابا جان کا انتقال ہوگیا تو کون ان کی بیگم اور اولاد کی بہبود کا ذمہ دار ہوگا۔ اور ایسا کیوں ہوا کہ گھر کے اتنے سقیم حالات میں بھی مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اس گھر کا دروازہ میرے لیے کھلا رہتا تو میں عطر فروش، پان فروش یا حجام کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز اور شاید اختتام کرتا۔ قرآن پاک میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کس قدر خوبصورتی سے ہماری زندگی کی محرومیوں اور اپنی عنایتوں کی تشریح فرماتے ہیں۔

وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ (البقرہ:۲۱۶)

"ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔"

شاید ہر انسان کی زندگی لیکن یقیناً میری پوری زندگی اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے میرے لیے میری ہر محرومی اللہ کی عنایات کا سرچشمہ رہی ہے۔ میں اپنی ساری محرومیوں اور زندگی کے تلخ ترین تجربات کے باوجود خود کو دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں سمجھتا ہوں۔ الحمد والشکر۔

ابا جان ۱۹۸۰ء میں سینہ کے کینسر کے علاج کے لیے میرے پاس امریکہ تشریف

لائے اور حکم دیا" تم اب یہاں کے شہری بن کر اسلام کے انسانیت نواز پیغام کو عام کرو اور اسلامی تعلیم کا جو کام تم دونوں نے شروع کیا ہے اسے اخلاص نیت سے انصار مدینہ کی روایات کے مطابق ادارہ قائم کر کے انجام دو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بہت سے راستے ہموار کرے گا۔"

اکتوبر ۱۹۹۲ انتقال سے پہلے وہ کاما میں تھے۔ میں امریکہ سے پہونچا تو ہوش میں آ گئے اور فرمایا: عابد میاں تم لوگوں نے اقرأ قائم کر کے بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ میں اسے مشرق میں پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں اسے مغرب میں پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں اسے شمال میں پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں اسے جنوب میں پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں چاروں طرف اقرأ ہی اقرأ ہے۔ ہندوستان کا اور ہندوستان کے مسلمان کا بھی تم پر حق ہے ان کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔" وہ پھر دو دن ہوش میں رہے اور ہم سب بھائیوں سے گفتگو کرتے رہے۔

جمعہ کے دن کہ وہ ان کی زندگی کا آخری دن تھا انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا تمہاری ماں اور بہن دونوں کو تمہاری سپردگی میں چھوڑ رہا ہوں۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ میں نے عرض کیا ہم سب اس فرض کو پورا کریں گے۔

جھنجھلا کر فرمایا: "میں یہ بات صرف تم سے کہہ رہا ہوں۔" "یہ تمہارا فرض ہے۔"

ابا جان کے انتقال کے بعد امّی نے اپنے چار بیٹوں کی موجودگی میں اپنے قیام کے لیے خود عابد اور تسنیمہ کے گھر کا انتخاب کیا۔ ان کے مزاج کی خودداری کو دیکھتے ہوئے یہ ان کی وسیع القلبی بھی تھی کہ انہوں نے ہمارے گھر کا انتخاب کیا۔ ہمارے سب بچوں کو انہوں نے دادی بن کر اپنی محبت اور تربیت سے سنوارا اور زندگی بھر کی تلخیوں کو نیک عنوان اور ہمارے پورے گھر کو خوبصورت یادوں کا تحفہ دے گئیں۔

اور جب وہ امریکہ کی تنہائی سے گھبرا کر بیٹی شہناز کے پاس اور پھر بیٹے ارشد اور بہو مہ جبین کے پاس قیام پذیر رہیں تو تسنیمہ نے ان کے جملہ اخراجات کو بافراط ادا کیا اور

ان کے آخری وقت میں ہم دونوں سنگاپور سے روانہ ہوکر ان کی خدمت میں تین دن حاضر رہے۔انہوں نے آنکھ تو نہیں کھولی ہاتھ اٹھا کر ہم دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ہونٹوں نے جنبش کی لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

حیدرآباد کا قیام مختصر تھا لیکن اس نے یادوں کے گہرے نقوش چھوڑے جسے شکاگو کے حیدرآباد ثانی نے ہمیشہ تازہ رکھا۔

علی گڑھ میں چوتھے سال کا آغاز سیاسی ہلچل کے ساتھ ہوا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چوتھا سال
جولائی ۱۹۵۴ سے مئی ۱۹۵۵ء
بی۔اے۔آرٹس کا پہلا سال

بمبئی سے میں بادل ناخواستہ علی گڑھ پہونچا یہاں لگتا تھا کہ جیسے علی گڑھ میرا منتظر ہو۔ ہماری الیکشن کی ٹیم منتظر تھی اور اب جائے فرار نہیں تھی۔

مضامین کا انتخاب:

ذاکر صاحب کے حکم نما مشورے یا مشورہ نما حکم نے ہمارے علی گڑھ کے فورتھ ایر کو آرٹ سائڈ کا تھرڈ ایر بنا دیا تھا، ہم نے اب اپنے دل پسند مضامین لے لئے۔ پولیٹکل سائنس، انگلش اور اسلامک اسٹڈیز ہماری آنکھ بچپن سے جس ماحول میں کھلی اس میں یہ انتخاب مناسب بھی تھا اور مفید بھی۔ اسلامک اسٹڈیز کے اختیار کے دینی جذبہ میں ایک دنیاوی منفعت بھی تھی یعنی دو سال کے لئے ۱۵ روپیہ ماہوار وظیفہ مستزاد تھا۔ یہ تین وظیفے تھے جو بالترتیب صادق علی، عابداللہ غازی اور کنور رفاقت کو مل گئے۔ انگریزی اگرچہ ہر چند ہمارے خاندانی مزاج کی روایات کے مطابق نہ تھی لیکن ہم پر اس کی افادیت واضح ہو چکی تھی۔ ہم نے اردو میڈیم اسکولوں اور فارسی میڈیم مدرسوں میں پڑھتے ہوئے بھی اس سے ربط ضبط رکھا تھا اس کو ہم نے اردو میں ہجے کر کر کے از خود نصف درجن سے زائد استادوں اور خیر خواہوں کی مدد سے سیکھا تھا۔

مالی طور پر اسلامک اسٹڈیز اسکالرشپ فری فوڈ، ذاکر صاحب کے ذاتی فنڈ سے ہمیں بیس روپیہ اور افریقن طالب علم نوئیل کے ٹیوشن سے پندرہ روپے ان تمام مدوں سے امداد نے بنیادی ضروریات پوری کر دیں۔ دھوبی، چائے اور ناشتہ کے لئے پورے سال جیب خرچ نہ تھا مگر یہ کام بھی لشتم پشتم گھشتا رہا مشکل یہ تھی کہ ہمارے دونوں روم پاٹنر،

اشتیاق محمد خان اور صالح نیر مالی طور پر ہمارے ہی ہم قبیل سے تھے۔

علیگڑھ میں یونین کا الیکشن:

اس بار شروع سال سے ہی یونین کی سکریٹری شپ کے لئے ہم امیدوار تھے ہماری پرانی احباب اور سپورٹرس کی رامپوری ٹیم ہم سے مایوس ہوکر رخصت ہوچکی تھی لیکن نئی ٹیم خود بخود تیار ہوگئی تھی۔ ہمارے نئے سپورٹرس میں ظفر امام ہمارے ساتھی تھے۔ وہ ہمارے انٹر میڈیٹ کے کلاس فیلو تھے اور سندری کے انجینئر نگ کالج کا ایک سال پورا کرنے کے بعد (یا انجینئر نگ سے خائف ہوکر اور یا سماجی علوم میں اپنی دلچسپی محسوس کر کے) انجینئر نگ کو خدا حافظ کہہ کر تھرڈ ایئر میں ہمارے کلاس فیلو بن گئے۔ ہم دونوں کے مضامین بھی تقریباً ایک تھے۔ گوان سے انٹر میڈیٹ میں خاص تعلقات نہ تھے مگر انہوں نے سید شفیع کی غیر حاضری کے بعد ہماری زندگی میں بہاریوں کی کمی کو اس طرح پورا کیا کہ وہ الیکشن میں ہماری سپورٹ میں پوری بہادری کے ساتھ آدھمکے۔ ادھر عرفان اللہ خان علی گڑھ کے نو دار نے رامپور کے احباب کی سردمہری کو گرم جوشی سے بدل دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے الیکشن کی ٹیم تیاری ہوگئی جس کے قائد سہیل بھائی مونگیری تھے۔ اب ہمارے الیکشن کی قیادت رامپور سے بہار منتقل ہوگئی تھی۔ سہیل بھائی ہمارے سینئر تھے۔ وہ اپنے ساتھ اور بہت سے سینئر لے آئے جس میں خالد عزیر، قاضی محمد احمد، عزیز احسن سر فہرست تھے۔ خیال تھا کہ الیکشن بلا مقابلہ ہوگا کہ اچانک معلوم ہوا کہ سید انور علی کے جماعت اسلامی کے حلقہ نے ایک بہاری ہونہار طالب علم امجد علی راہی کو خاموشی اور کمال دانشمندی سے میدان الیکشن میں اتار دیا۔

ہم سید انور علی سے ملے اور گذشتہ سال کا کیا ہوا وعدہ یاد دلا دیا لیکن انہوں نے فرمایا: ”آپ منور حسن کے حق میں تو بیٹھے نہیں تھے دوسرے جو کارنامے منور حسن نے خدمت اسلام کے لئے کیے ہیں ان کو تقویت پہونچانے کے لئے ایک تحریکی شخصیت کی ضرورت

ہے۔تحریکی سے ان کا مطلب جماعت اسلامی کی تحریک تھا۔

ادھر دارالعلوم دیوبند سے جماعت اسلامی کی گمراہی کا فتویٰ ایشو ہو گیا تھا۔جو آڑے وقت میں میرے بڑے کام آسکتا تھا لیکن میں خود اس فتویٰ سے متفق نہ تھا اور اس سے فائدہ اُٹھانا غیر اخلاقی سمجھتا تھا۔میں نے مولانا مودودی کی اکثر کتابیں پڑھی تھیں اور ان میں مجھے کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی تھی۔ان کی فکر دیوبند کی بنیادی فکر اور ہمارے دادا مولانا منصور انصاری اور والد صاحب کی تحریر و تقریر کی سلیس اردو میں شرح معلوم ہوتی تھی۔ان کتابوں نے خود میری ذہن سازی میں مدد کی تھی۔لیکن مجھے جماعت کی سیاست سے اتفاق نہ تھا۔میری خاندانی ہندوستانی اور آفاقی فکر کے مقابلے میں یہ بہت محدود تھی۔اور جدید حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے معذور۔

اس دوران میں میرا دیوبند جانا بھی ہوا اور وہاں سب بزرگوں سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہاں اینٹی جماعت جذبات میں بہت شدت ہے۔اس دوران والد صاحب بھی بمبئی سے تشریف لے آئے میں نے ان سے بھی اس فتوی پر اپنے اشکال پیش کئے انہوں نے فرمایا:''مولانا مودودی کا لہجہ علماء کی طرف توہین آمیز ہے،اور اختلافات صحابہ کا جنہیں مشاجرات صحابہ کہا جاتا ہے ان کی تحریروں میں بے باکانہ استعمال ہے۔''

میں نے اس سلسلہ میں قبلہ قاری محمد طیبؒ صاحب سے بھی گفتگو کی، انہیں بھی مولانا مودودی کی تحریروں میں اہانت صحابہ اور عقائد سلف سے روگردانی نظر آئی۔انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ علماء کی خاموشی سے مولانا مودودی کو اپنے غلط خیالات پھیلانے کا موقعہ مل گیا۔لیکن اب وقت فوری سد باب کا ہے۔انہیں مولانا مودودی کی شخصیت میں غلام احمد بننے کے واضح آثار نظر آرہے تھے۔

میری بچپن سے ذہنی تربیت دادے ابا کی مجاہدانہ زندگی اور ان کی فکر''حکومت الٰہیہ'' کے تصورات پر ہوئی تھی۔اسی کی مکمل تفسیر والد صاحب کی کتاب''اسلام کا نظام حکومت''تھی۔

میں ہر چند مولانا مودودی کی تحریک سے وابستہ نہ تھا لیکن ابتدائی طور پر میں اس کو دادے ابا اور والد صاحب کی سیاسی فکر کا تکمیلی پہلو سمجھتا تھا۔اس لئے علماء دیوبند کی مخالفت میرے ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی ہے۔میری نگاہ میں علما دیوبند اور جماعت اسلامی کا اختلاف اصولی نہیں فروعی تھا۔ لیکن دیوبند میں وہ اختلاف اصل الاصول تھا۔

ادھر ہمارے سیاسی اعلان کے ساتھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے اپنے تعاون کا نہ صرف اعلان کر دیا بلکہ بے ضرورت ایک طویل بیان شائع بھی کر دیا۔ان کی سپورٹ کی وجوہات میں ہمارا نیشنلزم اور سیکولرازم تھا۔اس دور میں جماعت اسلامی کا اپنا کوئی تشخص نہ تھا۔لیکن وہ بھی اسلام کے نام پر مسلم لیگی ذہن کا حصہ تھی۔فرق یہ تھا کہ مسلم لیگی ذہن پاکستان میں نظام اسلام قائم کرنا چاہتا تھا جماعت کے افراد ہندوستان کو اسلامستان بنانے کے داعی تھے۔ہم نے اپنی اخلاقیات سے مجبور ہو کر کبھی کسی دیوبند کے فتوے کو جماعت کے خلاف استعمال نہیں کیا لیکن جماعت سے متعلق چند افراد نے ہمیں اس رنگ میں رنگ دیا جو ہمارا اصلی رنگ نہ تھا۔اس پروپیگنڈے نے ہمیں اگر سرخ نہیں تو دوسروں کی نظر میں گلابی ضرور بنا دیا۔

دراصل ہمارا اصلی رنگ ہندوستان کا ترنگا ہے جس میں تین رنگ ہیں تینوں کا مقصد باہمی رواداری، مفاہمت اور دیانت ہے۔اس بات کو ہم نے جامعہ کے ترانے میں (۶۱ء) میں اس طرح شعری پیکر دے دیا۔

ہمارا اسلام آشتی ہے ہمارا پیغام دوستی ہے
گرا کے نفرت کے بتکدوں کو نیا شوالہ بنا رہے ہیں

بہر حال اس بار بیٹھنے کا سوال نہ تھا۔اگر بیگ صاحب نے ہمیں اسلام دوست نہ سمجھا تھا تو اس کا اتنا اثر نہ ہوتا کیوں کہ علی گڑھ میں اس وقت جماعت اسلامی کا کوئی اثر نہ تھا لیکن طرفہ یہ ہوا کہ اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے ہماری تائید کا اعلان حتی الامکان اور علی الاعلان

کردیا اور ہمارے سپورٹ میں میدان عمل میں کود پڑے۔ ہمارے الیکشن کے کنڈکٹر سہیل صاحب مونگیری تھے اور ورکرس میں نصف درجن سے زیادہ بہاری تھے جن کا ایس ایف یا کمیونزم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جن میں سید ظفر امام، شمس الدین ان کے بھائی زین العابدین علی امام، حسین امام، طہٰ حسین اور نہ جانے کتنے بہاری تھے۔ طرفہ یہ تھا امجد علی راہی نہ یہ کہ بہاری تھے بلکہ بہت اچھے کنڈیڈیٹ بھی تھے۔ مگر ہمارے بہاری دوست صوبائیت سے بلند تھے۔

الیکشن کا ہیڈ کوارٹر سر سید حال میں بنا تو ہمارے ورکرس نے کہا کہ برفی نمک پارے اور چائے کے لیے پیسے نکالو۔ علی گڑھ کی یہ مستند روایت تھی کہ کنڈیڈیٹ الیکشن کا پورا خرچہ خود اٹھاتا تھا۔ یہاں حال یہ تھا کہ ہم شیروانی بھی مستعار لیتے تھے۔ اور ٹوپی بھی اپنے ہمسروں کی اوڑھتے تھے۔ ہمارے سینئر سہیل صاحب مونگیری نے ہماری چیف کنڈکٹر کی امامت یہ سوچ کر قبول نہیں کی تھی کہ ان کو اپنی جیب سے اور احباب کی جیب سے الیکشن لڑانا پڑے گا۔ جب انہیں ہمارے حال زار کا اندازہ ہوا تو انہوں نے بددل ہونے کے بجائے کمر ہمت باندھ لی اور ایک بڑی جماعت امداد کے لیے تیار کرلی۔ ادھر اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے نہ صرف سپورٹ کا اعلان کیا بلکہ چندہ کی مہم بھی شروع کردی غرض علی گڑھ کی تاریخ میں پہلا الیکشن تھا جس میں کنڈیڈیٹ خود اپنا مہمان تھا۔

ہمارے ساتھ جو بہاری جماعت شامل ہوچکی تھی اس نے سہیل صاحب کی سرکردگی میں امجد علی راہی کی بہاری نسبت کو نظر انداز کر کے چندہ میں دل کھول کر مدد کی۔ امجد راہی نے تعلیم کنونٹ میں پائی تھی۔ وہ اچھے مقرر تو نہ تھے لیکن ان کی انگریزی اردو سے زیادہ رواں تھی۔ پھر ان کے ہاتھ میں اسلام کا پرچم تھا گو ہمارا دل بھی ہمیشہ سے اسلام کی محبت سے معمور تھا لیکن علی گڑھ کا اور جماعت اسلامی کا دل اسلام قوم دوستی دور اندیشی اور ارضی حقائق کی آمیزش سے پاک صاف تھا۔ جماعت اسلامی کے لیے ہندوستان شاید اب بھی دارالحرب تھا مسلمانوں کو اس نظام باطل کو عدم تعاون سے شکست دینا دین کا حصہ تھا۔

ہندوستان کے سیکولرازم کے مقابلے میں نظام اسلامی منزل مقصود تھا۔وطن دوستی،ہندوؤں سے مفاہمت اور ہندوستان میں مستقبل کی جدوجہد مشرکانہ جذبات کے مترادف تھی۔سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ ہندوستان کا جمہوری دستوری نظام جوتمام ہندوستانیوں کومساویانہ حقوق عطا کرتا تھااور سماجی طور پر پست اقوام کوخصوصی مراعات دے کراعلیٰ ترین مقام دلانے کی ضمانت دیتا تھاوہ باطل تھااوراس کوتسلیم کرنااوراس کے ساتھ تعاون کرنا گناہ کبیرہ تھا۔

میرے لئے جماعت گروپ کے نہلے پر دیو بند کا دہلا رکھ دینے کا سنہری موقع تھا۔ لیکن میں اپنے مزاج اور تعلیم سے مجبور تھا۔میں اس کے بعد بھی حلقۂ ادبِ اسلامی کی محفلوں میں بھی شریک ہوتا رہتا تھالیکن ترقی پسند مصنفین کے مجلسوں میں بھی جا کرغزل سرائی کرآ تا تھا۔

ہمارے خاندان اور علماء دیو بند میں کچھ خیالات محکمات کی حد تک رائج تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق ''مولانا مودودی نے ۲۷-۲۶ء میں دادے ابا،مولانا منصور انصاری کی تحریروں کی بطوراخبار الجمعیۃ کے ایڈیٹر کے مخالفت کی تھی اور پھر خودان تحریروں کواپنا کرایک تحریک بنانے کا ڈول ڈالا تھا۔مجھےان خیالات واعتراضات سے بھی اتفاق نہ تھا۔

دراصل نظام اسلامی کے قیام کے لئے نئے خیالات عقائد کے درجے میں عالمی طور پرموجود تھے اسے تحریر میں لاکرتحریک اور تنظیم بنانے کا کام مولانا مودودیؒ اورحسن البناؒ نے کیا۔ پھر میری جنگ اس وقت جماعت اسلامی سے نہ تھی اور نہ توبہ توبہ استغفراللہ اسلام سے تھی میرا موقف ہندوستان میں مسلمانوں کے روشن مستقبل سے متعلق تھا۔میں علی گڑھ کے طلباء کے پاکستانی ذہن اور ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے کویااس کی آرزو رکھنے کوغلط سمجھتا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں میں مولانا آزاد،مولانا مدنی،ذاکر صاحب،والدصاحب اور علماء دیو بند اور جمعیۃ العلماء کی فکر کا مبلغ تھااور آج تک ہوں۔میری فکر میں اورایس ایف کی نظر میں کسی حد تک بعض معاملات میں مفاہمت تھی۔اس لیے ایس ایف کی تائید ان کا جماعتی معاملہ تھا جس میں میرا دخل نہ تھا۔میں الیکشن جیت گیالیکن جماعت سے اور پاکستان جانے

والے ذہن سے بعد پیدا ہو گیا۔

گذشتہ سال انیس شیروانی باوجود زرکثیر خرچ کرنے کے الیکشن بری طرح ہار چکے تھے انہوں نے اس سال صدارت کا فیصلہ کرلیا۔ان کے مقابلے میں نیر قدر واصف علی مرزا کھڑے ہوئے تھے۔ نیر قدر مجاہدہ آزادی بیگم حضرت محل کے پڑپوتے اور آخری اودھ کے تاجدار کے پوتے تھے۔ اہل تشیع میں سے تھے لیکن اس دور میں شیعہ سنی عقائد کا یونین کی سیاست اور علی گڑھ کی اجتماعی زندگی میں کوئی اثر نہیں تھا۔ فرق صرف جامع مسجد کی پہلی سنی جماعت فرسٹ شو اور دوسری شیعہ جماعت سیکنڈ شو کہلانے کی حد تک تھا۔ نیر انگریزی کے اچھے مقرر تھے۔ ان کا اپنا کوئی سیاسی یا سماجی موقف نہیں تھا۔ لیکن کھلے ذہن کے آدمی تھے۔ ان کا موقف صاف طور پر ہندوستان کے حق میں تھا۔

نیر کے والد بزرگوار ۱۹۴۷ء کے بعد اپنے آباء واجداد کے تخت وتاج کی بازیابی کی ہر آرزو سے استعفی دے چکے تھے۔ ان کے مخالف ایک شہزادے یوسف مرزا تھے جوان پر باندی بچہ ہونے کا الزام لگا کر خود تخت وتاج کے وارث بن گئے تھے۔ انہوں نے آزادی کے بعد لکھنؤ میں اپنی تاجپوشی تک کرالی تھی۔ لیکن پھر انہیں یوپی کے چیف منسٹر گووند بلبھ پنت کی حکومت کا نوٹس ملا: ''انہوں نے کمالِ دانشمندی سے سروجنی نائیڈو کو یوپی کا گورنر نامزد کیا اور گووند بلبھ پنت کو یوپی کا چیف منسٹر۔ اس نامزدگی کے بعد وہ واپس مٹیا برج واپس چلے گئے۔ لیکن نیر قدر کے والد نے ایک بیان کے ذریعہ حکومت ہند کو سلطنتِ اودھ کا جائز وارث تسلیم کرلیا تھا۔ اور اپنے تمام حقوق سے وہ خود ہی دست بردار ہو گئے تھے۔

نیر قدر اور میں دونوں اطمینان سے الیکشن جیت گئے۔ مقابلہ دونوں کا افتتاح کی تقریب کے بعد پہلا کام بجٹ بنانا تھا۔ ہمارے آفس منیجر شانِ حیدر (امروہوی) تھے۔ دفتری امور کا خوب تجربہ تھا اور وہ ہر جانے والے کو سلیقہ سے خدا حافظ اور آنے والے کو خوش دلی سے خوش آمدید کہنے کے فن سے واقف تھے۔ انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور انگلی پکڑ

کر ہاتھ پکڑا اور یونین کے اسرار و رموز سے تعارف کرایا اور کراتے رہے۔انہوں نے کئی جانے والوں کی یا ہمارے مخالفین کی نہ تنقیص کی نہ غیبت بس ہماری رہنمائی کی۔ ہمارے جانے کے بعد اکثر سنتے ہیں کہ انہوں نے ہماری کافی تعریف کی۔اور ہمیشہ کرتے رہے۔

یونین کا بجٹ، مشاعرہ اور کوی سمیلین:

ہمارا پہلا کام یونین کا بجٹ بنانا تھا۔اس کے آئٹم متعین تھے۔تھوڑے بہت ہی ہیر پھیر کی گنجائش تھی۔ بجٹ کا اہم حصہ سالانہ مشاعرہ تھا جو شعر فہمی سے زیادہ ہوٹنگ اور اس سے بڑھ کر شعراء اور شاعرات کو ٹوپی پہنا کر پگڑی اچھالنے کے لیے مشہور تھا۔ یہاں اچھے شعراء آکر فیل ہو جاتے اور جملہ باز بازی لے جاتے۔ہم نے ۸۰۰ روپے مشاعرے کے لیے رکھے اور اس کے ساتھ ہی ۲۰۰ روپیہ کوی سمیلن کے لیے رکھ دیئے۔ہم نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کوی سمیلن کے ۲۰۰ روپیہ کی رقم کس طرح اسلام کو خطرے میں ڈال دے گی۔

احمد سعید کو صدارت چھوڑے دو سال ہو چکے تھے لیکن یونین ان سے چھوٹے بھی نہیں چھوٹ رہی تھی۔انیس شیروانی سکریٹری شپ اور صدارت کی امیدوں کی ناکامیابی کے بعد کسی نئے رول کی تلاش میں تھے۔کوی سمیلن نے ان دونوں لیڈروں کو اسلام کے تحفظ کا ایک مقصد دے دیا۔یونیورسٹی میں گھوم گھوم کے یہ دونوں محافظین اسلام کوی سملین کو اسلام مسلمان اور مسلم یونیورسٹی کے کردار کے خلاف سازش قرار دے رہے تھے۔

احمد سعید، انیس شیروانی اور امجد راہی اس بجٹ کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ موضوع یہ تھا کہ: ’’آج اگر مقدس یونین میں کوی سمیلن ہوگا تو کل ہون ہوگا اور پرسوں مورتی پوجا۔‘‘ اسلام ایک بار پھر خطرے میں آگیا۔ معاملہ اب ہندو مسلم کی شکل اختیار کر گیا۔اگر ہندی کو صرف ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے تو بھی ان کی تعداد یونیورسٹی میں ۴۰% سے زائد تھی۔لیکن ہمارے سامنے مسئلہ ہندی کے خلاف عصبیت کو توڑنے کا تھا۔اس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی مرکزی ادارہ تھی اور اس کا سو فیصد بجٹ حکومت ہند سے آتا تھا۔

ہندوستان کے دستور نے ہندی کو قومی زبان قرار دیا تھا اور اردو کو ریجنل لینگویج۔ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان ہندی پڑھیں اور اردو کی حفاظت اور بقاء کے لیے پروگرام بنائیں۔ یہ دونوں کام اہم تھے اور کرنے کے تھے۔مقاصد کے لیے پتہ مار کر تسلسل سے جدو جہد کرنا مسلمانوں کے مزاج اور توکل کے خلاف تھا۔لیکن ان تینوں مجاہدین اسلام کے ساتھ اور بہت سے لوگ شامل ہو گئے تھے اور مسئلہ ہندی اردو سے بڑھ کر ہندو مسلم بنتا جارہا تھا۔

اس موقع پر ایس ایف نے بجٹ کی حمایت کا پر جوش طریقہ سے اعلان کردیا۔ اب معاملہ صرف ہندو مسلم نہیں رہا بلکہ کمیونسٹ ورسز اینٹی کمیونسٹ اور اسلام ورسز اینٹی اسلام ہوگیا۔ نیّر اور ہم خواہی نخواہی اب ہندو، کمیونسٹ اور اینٹی اسلام کیمپ میں پہونچا دیے گئے۔ہم پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔ ہماری اردو دانی، جامعہ اردو کی خدمت علی گڑھ میگزین کی ادارت انجمن ترقی اردو کی رکنیت، اردو دستخطی مہم کی قیادت، دار العلوم دیوبند کی نسبت پنج وقتہ نماز کی استقامت، تقاریر سیرت طیبہ پر زور خطابت غرض ہماری جھولی میں جتنی نسبتیں اور جس قدر کام تھے سب چند جذباتی نعروں نے خاک میں ملا دیے۔لوگ ہم سے مطالبہ کرنے لگے کہ ہم انہیں کلمۂ طیبہ سنائیں! دوسری طرف سے آواز آنے لگی: یہ کلمۂ طیبہ کیا جانیں یہ روس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

ہم حیران تھے کہ ہماری ہی جماعت کے بزرگ ساری دنیا میں مارے گداڑے مسلمانوں کا کلمہ ٹھیک کراتے پھر رہے ہیں اور ہمیں سے وہ لوگ کلمہ کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ جو کبھی مسجد کا رخ تو نہیں کرتے البتہ جوش وخروش میں اسلام کے نام پر اپنی جان بھی دیدیتے ہیں اور بخوشی دوسرے کی بھی لے لیتے ہیں۔ہمارا وہی حال تھا جو تحریک پاکستان میں علماء دین اور مفتیان شرع متین کا تھا۔علماء کو جو مغلظات گالیاں پڑیں تھیں وہ بے شمار اور بے مثال تھیں۔ان کو ''حریت'' اخبار دہلی کے ایک خصوصی شمارے میں بقائی صاحب نے شائع کر کے محفوظ کر دیا تھا۔مگر ہم نے ان لوگوں کی باتوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔بس ''حساب

دوستاں در دل'' کا معاملہ رہا اور جس چیز کو ہم مسلمانوں اور مسلم یونیورسٹی کے لیے اہم اور ضروری سمجھتے رہے اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہے۔

ہم علماء پر جدید تعلیم کی اور انگریزی کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں، ہر چند کہ یہ الزام غلط ہیں پھر بھی اس دور کے لحاظ سے اُس کا جواز ہوسکتا تھا لیکن آزاد ہندوستان میں رہ کر اور مرکزی یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہوئے قومی زبان میں ہونے والے کوی سمیلن کے دوسو روپے کے بجٹ کی مخالفت بہت بڑا سانحہ تھا۔ یہ ان کروڑوں کے بجٹ کو متاثر کرسکتا تھا جس پر یہ یونیورسٹی چل رہی تھی۔ افسوس کہ بہت سے ناعاقبت اندیش لوگ اسلام کے نام پر فی سبیل اللہ فساد کرا کے پاکستان جا کر اسے اپنی نوکری کا استحقاق کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔

یونین میں بجٹ پیش ہوا تو احمد سعید، انیس شیروانی کی شعلہ بیانی نے ہمیں پانی پت کے میدان میں پہونچا دیا۔ ایس ایف، چند نیشنلسٹ مسلمس اور ایس ایف کے ممبرس ہندو طالب علم ہار گئے۔ کوی سمیلن کے دوسو روپئے بھی مشاعرہ کو مل گئے اور اسلام زندہ باد ہو گیا۔

یہ واقعہ اور اس طرح کے متعدد واقعات ایسے تھے کہ حکومت اس کا نوٹس لیتی رہتی تھی لیکن اس دور میں ہماری خوش قسمتی سے زمامِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی ان کے دل کشادہ تھے اور ذہن صاف تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو باوجود اس کے سیاسی ماضی کے محفوظ رکھا تھا اور اس کو مرکزی ادارہ بنا کر اور مستحکم کر دیا تھا۔ اس فکر کی قیادت علی گڑھ میں ذاکر صاحب اور دلی میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کر رہے تھے۔

کوی سمیلن اور ہمارا پروٹیسٹ:

یونین میں ناکامیابی کے بعد ہندو طالب علم، ایس ایف ورکرس، نیر قدر اور ہمارے کچھ موید ین کمیونلزم مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوتے باہر نکل آئے۔ ادھر پر جوش نوجوانان اسلام خوشی سے فتح کا جشن مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ یہ واقعہ ہندو مسلم فساد برپا کرسکتا تھا

جس کی زد میں یو پی اور پورا ہندوستان آسکتا تھا لیکن ہم لوگوں نے بدنامی سر لے کر اسے ہندو مسلم نہیں بننے دیا۔عجیب بات یہ ہے کہ کوی سمیلن کا تعلق بھی یونین میں کمیونزم سے ہوگیا اور ہم اس کے قائد قرار دیے گئے۔مجھے اپنی تقریر کا مضمون اب بھی یاد ہے:

''جولوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس مسئلہ کو ہندو مسلم بنا کر وہ ہندو مسلم فساد برپا کرادیں گے وہ غلط سمجھتے ہیں۔ہم ہندو اور مسلمان مل کر یہ عہد کرتے ہیں ہم اس مسئلہ کو ہندو مسلم نہیں بننے دیں گے۔اور ہم مل کر اردو اور ہندی دونوں کی حفاظت کریں گے۔ہمیں اس فیصلے کا افسوس ہے۔کوی سمیلین کا مسئلہ ہندو مسلم نہیں۔یہ قومی یکجہتی کا مسئلہ ہے۔یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قومی زبان کا احترام کریں یہ اس کی ترویج میں بھی حصہ لیں اور مشاعرے کے ساتھ کوی سمیلن بھی منعقد کریں۔اردو ہندی کے بغیر عوام کی زبان نہیں رہے گی اور ہندی اردو کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہندی کو گرا کر ہم اردو کو ترویج نہیں دے سکتے۔''

اسی طرح کے الفاظ نیر قدر صاحب نے بھی کہے ہماری تائید میں کپور صاحب ستیہ بھوشن اور دوسرے ہندو طلباء نے بھی تقاریر کیں۔یونین سے ہم نعرے لگاتے ہوئے ذاکر صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے۔ذاکر صاحب ہمارے نعرے سن کر کرتے پاجامے میں گھر سے باہر نکل آئے۔ہم نے انہیں پوری صورت حال سے آگاہ کر کے مطالبہ کیا وہ فرقہ پرستوں کی سرپرستی نہ کریں جس سے ہماری مراد احمد سعید صاحب اور ان کے رفقاء کی تھی۔اُن کو راہ راست پر لانے کے لیے ذاکر صاحب کوشاں رہتے تھے۔احمد سعید جامعی بھی تھے اور ان میں قائدانہ صلاحیتیں بھی غیر معمولی تھیں۔ذاکر صاحب کے بارے میں سنا ہے ان کو یہ گمان تھا کہ اگر احمد سعید کی فکری اصلاح ہوگئی تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کا ٹھیکہ لے لیں گے۔احمد سعید کی اہلیت اور زورِ خطابت کو دیکھتے ہوئے ذاکر صاحب

کی امید غلط بھی نہیں تھی۔لیکن محض خطابت بغیر علم و عمل کے اکثر فسطائیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب نے ہمارے نعروں کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اور مطالبات کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا:

''یونین جمہوریت کی درسگاہ ہے۔ اگر یہ فیصلہ جمہوری ہے تو جمہوریت میں اس کی استعداد بھی ہے کہ اس کو بدلا جاسکے اور ہم نہ بدل سکیں تو جمہوری معاشرہ ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم جو کام جمہوری اداروں کے ذریعہ نہ ہوسکیں وہ ہم خود انجام دے سکیں۔''

ذاکر صاحب نے ہندی اور اردو کے مسئلے پر فرمایا:

''دونوں زبانیں ہماری ہیں لیکن یہ سوچنا کہ ہم مشاعرہ اور کوی سمیلن کرا کے ان کا حق ادا کر سکتے ہیں غلط ہے۔آپ لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ہم کن طریقوں سے ان زبانوں کی حفاظت اور نشر و اشاعت کر سکتے ہیں۔''

ذاکر صاحب نے اس وقت کے برانگیختہ جذبات کو ٹھنڈا بھی کیا اور مستقبل کے اقدام کی طرف رہنمائی بھی کی۔ ہم نے بھی شکایات کے دفتر بند کر کے عملی کوششوں کی نشاندہی کی اور وعدہ کیا کہ جو ممکن ہے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترویج کے لئے وہ کوشش کریں گے۔کوی سمیلن کے معاملے کو اب آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ یونین پہونچ کر ہم نے ہندو طلباء کو یقین دلایا کہ ہم کوی سملین ضرور منعقد کریں گے۔

اس ملاقات کے بعد ہم نے کوی سمیلن کے منعقد کرنے کے لیے تعاون کی کوشش شروع کی تو رحمت اللہ شیروانی اور نواب چھتاری کے تعاون سے ہی ہمارا بجٹ ۲۰۰ روپیہ سے بڑھ کر چار سو ہوگیا۔ہم نے طے کیا کہ نمائش میں کوی سمیلن میں شریک کویوں کو ہم یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دیں گے۔ہم نے یہ کام شروع کیا تو کم وبیش سبھی کویوں نے یونیورسٹی کوی سمیلن میں شرکت کا ارادہ کرلیا۔ اور نمائش کی کوی سمیلن کمیٹی نے بھی پورا

تعاون کیا۔

نمائش کے کوی سمیلن کے دوسرے دن یونین میں یونیورسٹی کا کوی سمیلن منعقد ہوا جس میں بچن بابو نیرج اور متعدد معروف کوی شامل ہوئے۔ ہمیں یونیورسٹی کی خاموش حمایت حاصل تھی۔ اس کوی سمیلن کے معاونین میں انجمن ترقی اردو بھی شریک تھی اور شرکاء میں اسٹاف کے بہت سے مقتدر حضرات موجود تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلامی اقدار کے محافظ سمجھے جاتے تھے اور انہیں ہندی سے خوف نہ تھا۔ ممتاز آپا لڑکیوں کے جتھے سمیت موجود تھیں۔ ان کی آمد نے ہال کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا اور کویتاؤں کو رومانیت اور معنویت عطا کر دی تھی۔

کویوں نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ، اسلامی تعلیمات اور سیکولر ہندوستان میں مسلم اداروں کے بقاء اور تحفظ کی اہمیت پر سیر حاصل گفتگو بھی کی اور سب کویتاؤں کے وہ حصے پڑھے جوان کے سچے جذبات کے ترجمان تھے۔ دراصل یہ کوی سمیلن کے نام پر مشاعرہ تھا جس میں ہر کوی نے کویتاؤں کے ساتھ فارسی زدہ غزلوں کا سماں باندھ دیا۔ اس خوبصورت شام نے یونین کی شکست کی تلخی کو ختم کر دیا اور مسلم یونیورسٹی میں نئی روایت کی بنیاد ڈال دی۔

کوی سمیلن اور تحریکِ عدم اعتماد:

اس شکست فاتحانہ کی خوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ پتہ چلا احمد سعید کے اسلامی فرنٹ نے عدم اعتماد کی تحریک کے لیے دستخط جمع کرنے شروع کر دیے۔ عدم اعتماد کی تحریک کی بنیاد کوی سمیلن کا انعقاد تھی جس کے ذریعہ یونین کے دستور کی توہین کی گئی تھی اور یونین میں کوی سمیلن منعقد کرا کے یونین کے دستور کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس بار ہم کو بھی مقابلے کے لیے نکلنا پڑا۔ اس وقت اسلام اور کوی سمیلن کے ٹکراؤ میں آہستہ آہستہ لوگ ہماری نقطۂ نظر کو سمجھ رہے تھے۔ لیکن عدم اعتماد کی تجویز قانونی معاملہ تھا جس کے لیے حمایتی اسٹوڈنٹس کو یونین میں لانا ضروری تھا۔ دونوں جانب سے پوری کوشش تھی۔ شاید سرسید کو ۱۸۷۵ء میں انگریزی کی تعلیم دلانے کے مخالفین کا اس طرح سابقہ نہیں پڑا تھا جو ہندوستان کی قومی زبان

کے ایک کوی سمیلن کے منعقد کرنے پر ۱۹۵۴ء میں ہم کو پیش آیا۔ تحریک عدم اعتماد یونین میں پیش ہوئی۔ ہم لوگوں نے یونیورسٹی میں گھوم پھر کر طلباء کو اپنے نقطۂ نظر اور سیاسی عواقب سے آگاہ کیا۔ یونین طلباء سے اس قدر یونین کھچا کھچ بھری تھی کہ ہم نے اپنی علی گڑھ کی زندگی میں نہیں دیکھی۔ جذباتی تقریروں نے جذبات کو بھڑکا دیا تھا۔ یونین پانی پت کا میدان تھی۔ اس بار نان ریزیڈنٹ اسٹوڈنٹ بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ مشاعرہ اور کوی سمیلن جس کا تعلق کسی دین دھرم سے نہ تھا اب مذہبی ایشو بن گیا تھا۔ موشن کے بارے میں مثبت اور منفی آراء کا پتہ لگانا بھی تقریباً ناممکن تھا۔ ہم لوگوں نے میز پر کھڑے ہو کر گننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اب ہمیں سیاسی فیصلہ کرنا تھا جو بڑی ردو کد کے بعد کرنا پڑا۔

صاحبزادہ نیر قدر واصف علی میرزا نے موشن کی شکست کا اعلان کر دیا۔ پوری یونین میدان کارزار بن گئی۔ ہماری میز پر اس قدر بوجھ پڑا کہ اس نے بھی شکست کا ارادہ کر لیا۔ میں اور نیر دونوں عقبی دروازے سے باہر گرتے مگر ہمارے ہمدردوں نے ہمیں گود میں دبوچ لیا۔ میز اس میدانِ کارزار کے شہداء میں شامل ہو گئی۔ اس سے پہلے مجمع ہماری تکا بوٹی کرتا ہمارے ہمدردوں نے یونین کے آفس میں لے جا کر بند کر دیا اور خود پہرے دار بن گئے۔ مجمع منتشر ہوا تو ہم باہر آئے۔ اور یونین کو تہس نہس دیکھا۔ کافی فرنیچر ٹوٹ چکا تھا۔

سرسید کو چند ناسمجھ لوگوں نے کرسٹان کہا ہمیں ہندو نواز، کمیونسٹ، حکومت کے ایجنٹ دھریہ کے القاب سے نوازا گیا اور یہ ان لوگوں کے ذریعہ ہوا جو سرسید کی درسگاہ کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ ان میں سے اکثر کی منزل پاکستان تھی اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حال سے کھیل کر اپنا مستقبل بنانا چاہ رہے تھے۔

احمد سعید، ہمارا کمرہ اور بے چارہ میں:

ذرا ہنگامہ ٹھنڈا ہوا تو ہم اپنے ہمدردوں کے جلو میں اپنے مستقر میکڈانلڈ آ گئے۔ ہم سونے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ دروازہ سے احمد سعید نمودار ہوئے۔

''السلام علیکم! میری جان کیا ہو رہا ہے۔ذرا چائے پلاؤ!''

میں یونین کے حملے سے ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس نئے اخلاق زدہ حملے نے مجھے بے بس کر دیا۔اب جن احمد سعید صاحب سے میری ملاقات ہو رہی تھی وہ یونین میں رہ گئے تھے۔کمرے پر وہ ایک شفیق سینئر تھے جن کی یادداشت سے یونین کی تمام تلخیاں غائب ہو چکی تھیں۔میں چائے بنانے میں مشغول ہوا تو احمد سعید نے گنگنانا شروع کر دیا اور رفنا کانپوری کی مشہور غزل سے اس کا آغاز کر دیا۔

گھر ہوا گلشن ہوا صحرا ہوا
ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا

چائے تیار ہوئی تو پہلے انہوں نے اپنا زبانی دیوان کھول دیا جس کا آخری صفحہ غائب تھا۔اور پھر اپنے موضوع حسن وعشق کے تذکرے شروع کر دیے جس کے اول صفحے کا مجھے علم نہ تھا۔بقول ان کے ان کے نام کی تحقیق کی ضرورت ہے۔چند عشق ایک ساتھ چل رہے تھے لیکن اصل ان کی توجہ کا مرکز ایک خاتون مونا تھیں جو غالباً بعد میں ان کی زوجیت میں آئیں۔ ہماری یک طرفہ گفتگو کا سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔اس میں کہیں کوئی سمیلن ،تحریک عدم اعتماد، یونین اور سیاست کا ذکر نہیں آیا۔ان کی گفتگو سے میری نیند تو کیا حواس اڑ گئے تھے۔ان سے اجازت ملنے کی صورت نہ تھی میں نے خود ساختہ جمائیاں لینی شروع کر دیں اور دو ایک دفعہ سو سو کر اٹھا، بالآخر انہیں سمجھ آئی یا رحم آیا انہوں نے صبح آنے کا وعدہ کر کے رخصت چاہی اور وعدہ کیا کہ صبح دونوں کیفے ڈی پھونس چلیں گے اور انڈے توس کا ناشتہ کریں گے۔

انڈے کا ناشتہ اور سدھانہ:

احمد سعید کے انڈے اور توس کے ناشتہ کی دعوت نعمت غیر مترقبہ تھی۔ہم پر جو گذری تھی اس کا انڈوں سے تدارک تو نہیں ہو سکتا تھا مگر انڈے توس کھائے بھی شاید صدیاں گذر گئیں تھیں۔ہمارا حال غالب والا تھا: ؏ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

صبح انہوں نے مجھے آ کر جگا دیا اور ہم دونوں کیفے ڈی پھونس پہونچ کر اس کے سب سے پہلے مہمان بن گئے۔ انہوں نے بہت فیاضی سے دو انڈے چار توس، نمک پارے اور برفی فی کس ناشتہ کا آرڈر کر دیا۔ اور گفتگو کے سلسلے کو پھر وہاں سے جوڑ دیا جہاں رات کو چھوڑا تھا۔ اب وہ اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ ان کا فائنل انتخاب شعبۂ اردو کی طالبہ مونا تھیں۔ میں ان کی گفتگو سے زیادہ توجہ ناشتہ پر دے رہا تھا۔ مجھے یونیورسٹی کی طرف سے صرف دو وقت کا کھانا ملتا تھا۔ اس میں ناشتہ کے دو مٹری بسکٹ اور مکھن کی پڑیا شامل نہیں تھی۔ نہ ہی چائے یا کوئی اور مشروب اس کا حصہ تھا۔

اس دور میں انڈے کا ناشتہ صرف دامادوں کا اور خاندان کے بزرگوں کا حصہ تھا۔ اس لیے دو انڈے بغیر شرف دامادی کے میرے لئے من وسلویٰ سے کم نہ تھے۔ توس نمک پارے اور برفی اس پر مستزاد تھے۔ احمد سعید صاحب میری بے توجہی کو محسوس کر کے مجھے گفتگو میں شریک کرنے کے لیے فرمایا ''پارٹنر تم بھی عشق کر لو!۔'' میں نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ''میں ابھی انڈر گریجویٹ ہوں اگلے سال بشرط تعلیم کوشش کر کے دیکھوں گا۔'' وہ میرے عشق کے التواء سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اسے بہت مثبت انداز سے لیا۔

''ایک سال میں فرق نہیں پڑتا۔ سائیکولوجی ڈپارٹمنٹ اور اردو ڈپارٹمنٹ میں کافی کھیپ آتی ہے۔ تم چکر لگاتے رہنا۔'' میں نے پہلا انڈا کھا کر دوسرے انڈے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ان کے مشورہ کا استقبال کیا اور وعدہ کیا کہ ان کے تجربات سے پوری طرح استفادہ کی کوشش کروں گا۔ اور انہیں ہر طرح باخبر رکھوں گا۔

میرے جواب سے ان کی فکر رسا اور سودائی طبیعت کو کچھ ڈھارس ملی اور فرمایا:

''میں حسین ہوں اور مونا خوبصورت ہے ہم دونوں کے لڑکا ہوگا۔ وہ بہت گبرو جوان ہوگا۔ پارٹنر تم بھی کسی حسین لڑکی سے شادی کرنا۔ تمہارے ہاں خوبصورت لڑکی ہوگی دونوں تعلیم کے لیے علی گڑھ آئیں گے۔ میرا لڑکا تمہاری لڑکی سے عشق کرے گا۔ پھر ہم ان کی شادی

کردیں گے۔اور ہم ایک دوسرے کے سمدھی ہو جائیں گے۔''

یہ تجویز پیش کر کے انہوں نے میری طرف اسی محبت بھری ملتجیانہ نظروں سے دیکھا جیسے میں اسی وقت ان کی تجویز قبول کر کے ان کا منہ میٹھا کرادوں گا۔اب مجھے سمجھ میں آیا کہ دو انڈے کا ناشتہ مجھ سے سمدھانے کا رشتہ قائم کرنے کے لئے کرایا تھا۔انہوں نے پہلے انڈے کے اختتام اور دوسرے انڈے کے آغاز سے پہلے عشق و محبت اولاد و احفاد، نسبت وشادی کے بہت سے مراحل طے کرادئے تھےلیکن میں ابھی عشق مجازی کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔انہوں نے زندگی کے سارے حقائق کو چند فقروں میں ادا کردیا۔گویا

منزلِ عشق بسے دور و درا زست ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

عشق کی منزل یوں تو بہت دور اور دراز ہےلیکن کبھی کبھی سو سال کا سفر ایک آہ میں بھی طے ہو جاتا ہے۔

مجھے تو انہوں نے آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ دی۔پھر دراصل معاملہ میری بیٹی کے مستقبل کا تھا۔اس لیے میں نے سنجیدہ ہو کر گفتگو کا آغاز کیا۔'' دیکھئے سعید صاحب! شادی بیاہ کا معاملہ کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں۔ یہ زندگی بھر کا ہوتا ہے۔ میں اپنی لڑکی کے مستقبل کا فیصلہ اس رواروی میں کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے اور میری بیگم صاحبہ کو لڑکے کے بارے میں تحقیق کرنی ہوگی کہ وہ آپ پر پڑا ہے یا بھابی صاحبہ پر۔اگر وہ بھابی صاحبہ پر پڑا ہے تو ہم غور کرسکیں گےلیکن اگر وہ آپ پر پڑا ہےتو میرا ابھی سے انکار ہے۔''

یہ بات سن کر سعید صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔غصہ میں کھڑے ہو کر فیصلہ کن انداز سے فرمایا۔''اگر آپ کو اپنی لڑکی دینے سے انکار ہےتو میں بھی اس ناشتہ کا بل دینے کو تیار نہیں۔'' یہ فرمایا اور غصہ میں مجھے برا بھلا کہتے ہوئے روانہ ہو گئے۔وہ مجھے اور میری خالی جیب کو ان نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ گئے۔کیفے ڈی

پھونس کے مالک منیجر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے آئے اور فرمایا: ''انڈے صاحب بہت متلون مزاج ہیں۔ کانپور مجیدی پریس کے بگڑے نواب ہیں۔ میں ان کے گھر والوں کو جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں میں ان سے یا ان کے گھر والوں سے وصول کرلوں گا۔ غرض جلتو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو اس کے بعد احمد سعید مدتوں کبیدہ خاطر رہ کر دور رہے میں مطمئن رہا کہ میری راتیں میرے قبضہ میں واپس آ گئیں۔

یونین کی بعض مصروفیات:

یونین میں ہر سال مہمان آتے تھے اور یونین کی شاندار پھولوں کی برسات اور تالیوں کی ناقابل فراموش یادوں کا سرمایہ لے کر لوٹتے تھے۔

اس سال یونین کے مہمانوں میں قابل ذکر کرشنا مینن (جناب وزیر خارجہ) مسٹر ریڈی (بعد میں صدر جمہوریہ ہوئے) اور یو این دھیبر (صدر کانگریس) تھے۔ یونین کے پلیٹ فارم سے استقبالیہ تقریر میں ہندوستانی مسلمانوں اور یونیورسٹی کے مسائل کو بہت زور وشور سے پیش کرتا تھا۔ دھیبر جی اور مسٹر ریڈی سے تعلق کافی عرصہ قائم رہا۔ مسٹر ریڈی جب ملاقات کرتے اس تقریر کے بارے میں ضرور مذاق کرتے گویا کہہ رہے ہوں۔ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' ان کا تعلق حیدر آباد سے تھا اور بقول ان کے میری اردو ان کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے اس زمانے میں ہندوستان کے طالب علموں میں یوتھ کانگریس اور ایس ایف کا بہت زور تھا۔ یوتھ کانگریس ہندوستان کی حکمران پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کا یوتھ ونگ تھی اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کمیونسٹ پارٹی کا نوجوان دستہ تھا۔ علی گڑھ یوتھ کانگریس کا وجود تقریباً غیر محسوس تھا لیکن ایس ایف کا بہت دھوم دھڑکا تھا۔ اس کے ورکرس میں بہت سے ذہین اور مستعد طالب علم تھے جس میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ تھیں۔ ان انقلابی خواتین نے مجاز کی خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا تھا:

ترے چہرے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل کو گر پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

یہ لوگ تن من دھن سے کمیونسٹ انقلاب کو برپا کرنے پر پورے عزم ویقین سے لگے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ ان کا قبلہ وکعبہ روس تھا بقول مجروحؔ سلطان پوری

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

لیکن اس روس نوازی کے بعد وہ لوگ ہندوستانی نیشنلسٹ (کم وبیش) تھے یعنی وہ پاکستان کے اور وہاں کی ہجرت کے حق میں نہیں تھے۔ وہ پکے اینٹی امریکن تھے بعد میں ان میں سے کچھ لوگوں نے پاکستان کی راہ بھی لی تھی اور امریکہ تو وہ درجنوں کے حساب سے آکر رس بس گئے ہیں۔ جس طرح یہاں جماعت اسلامی اور اخوان کے لوگ اسلامستان کا نظام اسلام قائم کرنے کے لیے آئے اسی طرح کمیونسٹ بھی یہاں شاید سوشلزم قائم کرنے کے لیے آئے ہوں گے۔ امریکہ میں آکر سب ہی مایا کے جال میں پھنس گئے۔

تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

یونین میں ایس ایف کا رول:

اسٹوڈنٹ یونین میں اس سال ایسے زیادہ موضوعات نہ تھے جن پر تصادم ہوتا اس لیے صرف کوی سمیلن کا مسئلہ ہی تھا اس میں بھی ہندو مسلم سے زیادہ کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ کا تصادم تھا۔ ہم اِدھر کے تھے نہ اُدھر کے لیکن ہم نے جس موقف کو اپنایا اس میں نہ مسلم جذباتیت تھی نہ کمیونسٹ مصلحت صرف معقولیت تھی کہ جو بات اظہر من الشمس ہے۔ اس کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اگر سرسید نے علماء کی سنجیدہ مخالفت کے باوجود انگریزی کی تعلیم کا پرچار کیا تو نئے ہندوستان میں قومی زبان سے دشمنی خودکشی کے مترادف تھی۔ کوی سمیلن کے مخالف اسے اسلامی مسئلہ صرف اس لیے بنائے ہوئے تھے کہ ان کی فکری منزل پاکستان

تھی جہاں وہ نہ صرف اردو کے مستقبل کو محفوظ سمجھتے تھے بلکہ ان کے منظر نامہ میں اردو دیوان غالب، امراؤ جان ادا، بیگم اختر اور نظامی قوالی سب اسلامی تشخص کا حصہ تھے۔ اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے پاکستان بنانا ناگزیر تھا۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کہ ہر تہذیب ایک خاص ہوا، مٹی، پانی اور ماحول سے بنتی ہے اور اس کے چھوٹنے سے بگڑ جاتی ہے۔

علی گڑھ کے باہر ایس ایف اینٹی گورنمنٹ ایجیٹیشن (agitation) میں سرگرم تھی۔ مسائل کیا تھے وہ یاد نہیں البتہ ایک نعرہ بہت مقبول تھا۔ ''یوپی میں ہیں تین چور گپتا منشی جگل کشور'' غرض چیف منسٹر سی بی گپتا، گورنر کے ایم منشی اور وزیر تعلیم جگل کشور تینوں چوروں کی فہرست میں تھے۔ علی گڑھ میں ایجیٹیشن کے لیے لکھنؤ سے سید ابن حسن اور زیدی آئے تھے اور چاہتے تھے کہ یونین میں جلسہ ہو اور یونیورسٹی میں اسٹرائک ہو۔ اور نعرے بازی ہو۔

نیر قدر (صدر) اور ہم جلسے کے لیے تو تیار ہو گئے لیکن اسٹرائک کے سخت خلاف تھے۔ ہمارا موقف اس سلسلہ میں واضح تھا کہ ہم یونیورسٹی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہونے دیں گے جس سے بد نظمی ہو۔ اس وقت میرا اپنا یہ یقین تھا کہ اگر یونیورسٹی آئندہ پچیس سال تعلیمی عمل میں گامزن رہتی ہے تو اس سے مسلمانوں کی نئی قیادت پیدا ہو جائے گی جو فکری طور پر مسلمان ہوگی اور عملاً ہندوستانی۔ اب اس وقت کو ۶۷ سال گذر چکے ہیں اور ابھی تک اس قیادت کا انتظار ہے۔

یونیورسٹی نے ہر طرح بہت ترقی کی ہے لیکن اس نے کوئی فکری اور عملی قیادت نہیں پیدا کی جو مسلمانوں کی روشن مستقبل کی طرف ہندوستان میں رہنمائی کر سکے۔ ہندوستان کا مسلمان بھی بحیثیت مسلمان کے اسی عالم اسلام کا حصہ جن کے پاس مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں۔ اب سے بہت پہلے خود مورخ اسلام شبلی نعمانی نے فرمایا تھا کہ: اور قومیں ترقی کے لیے آگے کی طرف بڑھتی ہیں لیکن ہم مسلمان پیچھے کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم عہد نبوی میں پہونچ جائیں یہی ہماری معراج ہے۔ یہی ہماری اصل ترقی ہے۔

شبلیؒ کا یہ بیان اس حد تک تو سو فیصد درست ہے کہ عہد نبوی سے بہتر کوئی دور انسانیت نے اخلاقی اعتبار سے نہیں دیکھا لیکن اس دور میں لوٹ کر جانے کی تمنا ایسی ہی ہے جو متمنی کو پوری طرح معلوم ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ کے بعد نہ کوئی رسول آئے گا نہ ان کے صحابہ کرامؓ کی طرح کی امت پیدا ہوگی۔ نہ کوئی نیا مصحف اترے گا۔ جس قدر بھی ہم رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی مثالی زندگی کا اتباع کریں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے تو قریب کر سکتا ہے۔ لیکن اس دور میں معاشرتی ترقی کا راستہ نہیں دکھا سکتا۔ مستقبل کے لیے ہمیں قرآن وسنت سے روشنی حاصل کر کے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مستقبل کو تعمیر کرنا ہوگا۔ اسی کو اجتہاد کہتے ہیں۔ اسی کی تلاش ہے۔ اسی کا فقدان ہے۔ ہم درس نظامی اور محفلِ میلاد سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

کامریڈ ابن حسن، انقلاب اور کھٹمل:

بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی ذکر کامریڈ ابن حسن کا تھا۔ ابن حسن اس دور کی کامریڈیت کے بہترین نمائندہ تھے۔ اس لئے ان کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتا ہوں۔ وہ جب اگیٹیشن برپا کرنے کے لیے لکھنؤ سے علی گڑھ آتے تو جانے کا نام نہ لیتے۔ انہیں تعلیم سے زیادہ کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے میں دلچسپی تھی۔ تعلیم وتعلم کمیونسٹ نوجوانوں کے لیے بورژوا ذہنیت کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں اکثر کامریڈوں کا یہی عقیدہ تھا کہ ”کمیونسٹ انقلاب، جس کی آمد یقینی ہے، وہ برپا ہونے کے بعد ہر فیلو ٹریلولر کو اس کے خون پسینے کی قربانی کے بقدر معاوضہ حصہ ملے گا۔“

خود ہمارے سابق سینیر پارٹنر اشتیاق محمد خان اسی فلسفہ پر گامزن رہ کر اپنا وقت کمیونسٹ لٹریچر بیچنے پر لگاتے اور باقی وقت کمیونسٹ شعراء کے نغمات کی دھنیں بنجو پر بناتے۔ انہوں نے بی اے کے امتحانات میں کوشش کر کے تھرڈ ڈویژن لا کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ پھر فل ٹائم کمیونسٹ ورکر بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ دلی کی سڑکوں پر سرخ پرچم اٹھا کر

ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔کامریڈ ابن حسن علی گڑھ کو ہیڈ کوارٹر بنا کر پورے علاقے کا دورہ کرتے تھے کبھی کبھی رات بے رات پسینہ میں شرابور اپنی کامیابیوں کی داستان لے کر تشریف لاتے۔وہ رات میرے لیے قیامت کی ہوتی۔

علی گڑھ کی مقدس اقدار میں اسپورٹس کے کپتانوں کے لیے با قاعدہ کمرے کی سہولتیں اور خصوصی فنڈس تھے لیکن یونین کے عہدہ داروں کے لیے کوئی سہولت نہ تھی۔ آفتاب ہوسٹل میں سنگل روم تھے لیکن چار پائیاں بازار سے ایسی ملتی تھیں کہ وہ بمشکل صحت مند آدمی کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں۔پھر بھی علی گڑھ میں ڈبلنگ بحسب ضرورت رائج تھی اور علی گڑھ کی مجبوری اور مہمان نوازی کا حصہ تھیں۔

میں ابن حسن سے شکایت کرتا کہ تمہارے پسینے سے کھٹملوں کی بو آرہی ہے تو وہ کہتے "مدح صحابہ کرتے رہو۔" ایسے موقع پر عرفان اللہ خان اور ظہیر قریشی کے یہاں مجھے پناہ لینی پڑتی۔ابن حسن کا قیام ایک بار ذرا طویل ہورہا تھا اور ظہیر کا معتدل مزاج میری مہمان داری سے مشتعل ہوتا جارہا تھا۔میں نے ہمت کر کے ابن حسن سے اس طویل قیام کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا واپسی کا کرایہ نہیں وہ فنڈ ریزنگ کی کوشش کررہے ہیں۔اس کار خیر میں میں نے شرکت کر کے ان کے ٹکٹ کا انتظام بمشکل کروادیا۔وہ روانہ ہو گئے لیکن چند دن بعد وہ پھر وارد ہو گئے۔

اس بار ان کا پسینہ ناقابل برداشت تھا۔میں نے ان سے سبب پوچھا تو کہا "کامریڈ پرکاش نے متھرا میں کام کی ضرورت پر مجھے وہاں فوری بھیج دیا تھا۔میں نے اپنا ایک جوڑا دے کر انہیں غسل پر آمادہ کیا۔صبح وہ اپنا لبادہ (کھدر کی بش شرٹ اور پتلون) میرے ذمہ ڈال کر میرے شیروانی زیب تن کر کے اپنے انقلابی مشن پر روانہ ہو گئے۔اور پھر واپس نہ آئے۔ مجھے ان کے چھوڑے ہوئے لباس فاخرہ کے پانے کی اتنی خوشی نہ تھی جس قدر اپنی واحد شیروانی کے جانے کا غم تھا۔مرتا کیا نہ کرتا میں نے ان کے کپڑے دھلوا کر رکھ

لیے اس زمانے میں میں فرنگی کپڑے کبھی کبھار پہنتا تھا۔کچھ عرصے بعد مجھے دہلی کا سفر درپیش تھا۔میں نے ابن احسن کے پینٹ اور بش شرٹ کو صندوق سے نکال کر ٹرائی کیا تو ایسا لگا جیسے یہ جوڑا میرے ہی لیے بنا تھا علی گڑھ میں میرا وزن سو پاؤنڈ تھا اس لیے اکثر صحتمند دوستوں کے کپڑے میرے جسم پر فٹ نہیں آتے تھے۔لیکن ابن حسن خود قد وقامت اور وزن اور ڈیل ڈول میں میرے قریب تھے۔

میں نے پینٹ اور بش شرٹ زیب تن کر کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا پھر آئینہ کو جسم کے مختلف حصوں کے روبرو کر کے خود کو دیکھا تو بہت اچھا لگا۔پھر میں دلی کے لیے روانہ ہوگیا۔علی گڑھ کے اسٹیشن پر میں دلی کی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آکر مجھے غازی جی کہہ کر ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔میں نے تعارف چاہا تو فرمایا وہ شری ابن حسن جی کے میتر ہیں وہ علی گڑھ میں اکثر ان کے گھر براجمان ہوتے ہیں۔میں نے پوچھا آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟انہوں نے فرمایا۔"شری ابن حسن جی آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔"

"لیکن آپ نے یہ کیسے پہچانا کہ میں ہی غازی ہوں؟"

"یہ سوٹ جو آپ نے پہن رکھا ہے وہ میرا ہے!"

یہ کہہ کر وہ دوست ہنس دیا اور مجھے بھی قہقہ کا دورہ سا پڑ گیا۔پھر میں نے سنبھل کر معذرت آمیز لہجے میں کہا:"یہ کپڑے ابن حسن میرے کمرے پر چھوڑ گئے تھے اور وہ میرا کرتا پاجامہ اور شیروانی پہن کر رخصت ہو گئے تھے۔"

"آپ کا کرتا پاجامہ اور شیروانی میرے پاس دھلا رکھا ہے!" وہ میرے روم پارٹنر رمیش کا کرتا پاجامہ پہن کر لکھنؤ چلے گئے۔"

میں نے عرض کیا:"اس وقت آپ کے کپڑے میں آپ کے حوالے نہیں کر سکتا نہ ہی اپنے کپڑے آپ سے وصول کر سکتا ہوں۔"

دوست نے ہاتھ جوڑ کر بڑی نمرتا سے کہا:"جو کپڑے آپ پہنے ہیں وہ بھی آپ کے

ہیں اور جو میرے پاس رکھے ہیں وہ بھی آپ کے ہیں۔'' ہم دونوں نے دلی سے واپسی کے بعد کپڑے تبدیل کر لیے اور اس دعاء پر رخصت ہوئے کہ یوپی میں امن قائم رہے اور شری ابن حسن جی لکھنؤ میں رہ کر انقلاب لانے کی کوشش جاری رکھیں۔ اور علی گڑھ کا رخ نہ کریں۔

یونین کی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہم نے بی۔اے۔سال اول کا امتحان دے دیا۔ اور ہمیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہماری فرسٹ کلاس آ گئی۔ گرمی کی تعطیلات ہم نے عرفان اللہ خاں کے گھر رامپور میں اور پھر ان کے ساتھ نینی تال میں گزاریں۔

علی گڑھ کا پانچواں سال بی۔اے فائنل
جولائی ۱۹۵۵ - مئی ۱۹۵۶ء
صدارتی الیکشن میں شکست - چین کا سفرنامہ مرم کی تیاری

میں موسم گرما کی تعطیلات ریاست رامپور اور نینی تال میں گزار کر علی گڑھ پہونچا۔ نیر قدر واصف علی مرزا صدر یونین ایم۔اے۔ پولیٹیکل سائنس کر کے واپس مٹیا برج چلے گئے تھے۔ یونین کیبنٹ نے مجھے ایکٹنگ صدر منتخب کرلیا۔

ایڈمیشن کی ہماہمی کے بعد یونین کی گھما گھمی شروع ہوگئی۔ جماعت اسلامی کے چند نفری گروپ میں نجات اللہ صدیقی، اشفاق احمد عرفان احمد خان اور عبدالحق انصاری کا اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ لوگ جماعت اسلامی کے بنیادی ممبر تھے۔ علی گڑھ میں پہلے داخلہ لے چکے تھے لیکن جماعت اسلامی نے علوم دین کی باقاعدہ تحصیل کے لیے رامپور کے صدر دفتر سے متصل ثانوی درسگاہ کھولی تھی جس میں علوم دین کا چار سالہ کورس مستند علماء کے ذریعہ پڑھایا جاتا تھا۔ یہ لوگ تحقیقی اور علمی مزاج رکھتے تھے اور یونیورسٹی کی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خود مجھ سے ان کا تعلق استوار تھا۔ ان سے میرا دینی اور علمی مزاج ملتا تھا اور اکثر موضوعات پر علمی گفتگو ہوتی تھی۔ یہ گفتگو نہ میں کمیونسٹوں سے کرسکتا تھا نہ اپنے علماءِ دین سے۔

اس بار میرے لیے یونین کا میدان تھا کوئی اور امیدوار بھی سامنے نہ تھا جو مقابلہ کرے۔ لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ بی اے فائنل کے اس سال میں تعلیم پر پوری توجہ کر کے علی گڑھ کو خیر آباد کہنا ہے۔ مجھے مسلسل مالی پریشانی سے بھی جھنجھلاہٹ تھی اور گھر کی صورت حال سے مسلسل تشویش تھی میں ابا جان کی خدمت اور عزیزان سلمہم کی تعلیم کے لیے اب خود اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ رہا تھا۔

ہر چند کہ ابا جان کے گھر سے میں ناکام و نامراد لوٹا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک بہن اور چار بھائیوں کی محبت کو اس طرح جزو زندگی بنادیا تھا کہ میں ہر لمحہ ان کے مستقبل کی فکر

میں رہتا تھا۔ ابا جان کی صحت اور مالی حالات دونوں ہی خراب تھے اور میری زندگی کی اولین خواہش تھی کہ ملازمت تلاش کر کے ابا جان کی خدمت اور عزیزان سلمہم کی تعلیمی معاونت تھی۔ میری یہ کوشش مسلسل تھی کہ گھر کے مالی حالات سنبھلیں اور میں اس کا حصہ بن کر والدین کے زیر سایہ زندگی گزاروں۔

قاری محمود حسن صاحب اور چین کی نوید:

صدارتی انتخاب کے لیے آہستہ آہستہ مجھ پر ہر طرف سے زور پڑنا شروع ہوا اور میں مسلسل انکار کرتا رہا۔ اسی درمیان میں قاری محمود صاحب رجسٹرار نے یاد فرمایا۔ محمود صاحب یونیورسٹی کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے صدر شعبہ تھے۔ وہ انگریزی حلق سے پڑھاتے تھے اس لیے علی گڑھ نے انہیں قاری کے خطاب سے نواز دیا۔ حالانکہ وہ داس کیپٹل کے آدمی تھے اور قرآن سے تعلق نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ رجسٹرار ہو گئے جو وائس چانسلر کے بعد یونیورسٹی کا اہم ترین عہدہ تھا۔ محمود صاحب نے اسے اس طرح نبھایا کہ وہ ذاکر صاحب پر چھا گئے۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ محمود صاحب کی طلبی میرے لئے خاصی تشویش کا سبب تھی۔ میں سمجھا کوئی یونین کا معاملہ تھا جس میں یونیورسٹی دخل اندازی کرنا چاہتی ہے۔

میں محمود صاحب کے دفتر حاضر ہوتو انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں فرمایا: ینگ مین آئی ہیوا ے گڈ نیوز فار یو (اے نو جوان تمہارے لئے میرے پاس خوش خبری ہے) میں نے خوش ہو کر سوال کیا؟ ''وہ کیا خوش خبری ہے؟''

محمود صاحب نے فرمایا: ''حکومت ہند طلباء اور اساتذہ کا خیر سگالی وفد چین بھیجنا چاہتی ہے۔ اس میں دس یونیورسٹیوں سے ایک استاد اور دو طالب علم یونیورسٹی کے انتخاب پر شریک ہوں گے۔ ذاکر صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم یونیورسٹی کی نمائندگی کرو تم یونین سے ایک اور طالب علم کو نامزد کرو گے۔ اساتذہ میں مسز ممتاز حیدر شریک ہوں گی۔ اگر تم تیار

ہوتو ہم مزید کارروائی کریں۔اس میں ذراسی قانونی دشواری بھی ہے۔''

میرے لیے جی ہاں قبول ہے کہنے کے علاوہ چارہ نہ تھا:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہر بانی

میں نے سوال کیا: وہ کیا قانونی دشواری ہے؟''

''دراصل حکومت کی ہدایات کے مطابق طالب علم کو پوسٹ گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔میں نے یہ مسئلہ وزارت خارجہ کے ساتھ اٹھایا ہے وہ انڈر گریجویٹ طالب علم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن ذاکر صاحب تمہارے نام پر مصر ہیں۔وہ پنڈت جواہر لال سے خود بات کریں گے۔''

اتنی بڑی خوش خبری سنا کر محمود صاحب نے قانونی ایٹم بم گرادیا اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے یہ دعوت قبول بھی کی اور قانونی دشواری دور ہونے تک صبر وتحمل کرنے کا یقین بھی دلایا۔چند دن بعد محمود صاحب نے مجھے بلا کر یہ خوش خبری سنادی کہ ذاکر صاحب کی تجویز پر میرا انتخاب خود پنڈت جی نے منظور کر کے وزارت خارجہ کو اطلاع دے دی۔

میں اس وقت پھر اسی سنڈروم میں مبتلا ہوگیا جس میں اس وقت ہوا تھا جب ابا جان نے ہائی اسکول کے بعد میری خواہش کے احترام میں مجھے علی گڑھ تعلیم کے لئے بھیجنے کا فیصلے کا خط لکھا تھا۔یعنی کھلونا کے چنومیاں کی طرح میرا قد بڑھنا شروع ہوگیا تھا۔چین اس وقت ہندوستان میں اور کیمونسٹ تحریک میں مقبول ترین ملک تھا۔ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ وردزبان تھا۔پنڈت جی اور چواین لائی پنچ شیل پر دستخط کر چکے تھے۔کیمونسٹ تو اس انقلاب کے منتظر تھے جو ہمالیہ کی بلندیوں سے براہ تبت ہندوستان پر نازل ہونے والا تھا۔ لیکن ہندوستانی قیادت چین کو غیر جانبدار تحریک کا حصہ بنا کر سویت یونین اور امریکہ دو سپر پاورس کے مقابلے ایک طاقت بنانا چاہتی تھی۔پاکستان سیٹو اور بغداد پیکٹ کا حصہ بن چکا

تھا، جدید امریکی اسلحہ کی سپلائی نے اسے ہندوستان کے لئے خطرہ بنا دیا تھا۔ ہندوستان کا سیاسی جھکاؤ اب روس، چین، یوگوسلاویہ، انڈونیشیا، گھانا کی قیادت کی طرف تھا۔ نہرو، چو این لائی، ٹیٹو، سوئیکارنو، انکرومہ غیر جانبدار تحریک کے سربراہ تھے۔

ترقی پسند صف اول کے شعراء میں کیفی اعظمی (غالباً) کی یہ نظم بہت مقبول تھی اور کمیونسٹ اسے چین کے انقلاب کی ہندوستان میں آمد کے استقبالیہ کے طور پر پڑھا کرتے تھے:

ہمالیہ پر کھڑا ہے ماؤ

اور ایشیا کو بلا رہا ہے

بلند جودہ کا ہاتھ

فتح وظفر کا

رستہ دکھا رہا ہے

چین کے وفد کے نمائندہ کی حیثیت سے چین کے سفر کی خبر یونیورسٹی میں ہلچل مچا گئی۔ ذاکر صاحب، محمود صاحب اور یونین کیبنیٹ کے باہم مشورے سے میں نے ایوب سید کو دوسرا نمائندہ نامزد کر دیا۔ ایوب سید براہ جامعہ علی گڑھ پہونچے تھے اور ذاکر صاحب جامعی طالب علموں کا باحسن وجوہ بہت خیال رکھتے تھے۔ ایوب بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور محمود صاحب سے بھی قریب تھے۔ یوں تو وہ یونین کیبنٹ کے نامزد ممبر تھے اس موقعہ پر انہوں نے مجھ سے بہت قریبی رشتے ایجاد کر لئے تھے۔ تعلیمی طور پر وہ کمزور تھے۔ سماجی تعلقات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے وفد کے انتخاب کے بعد زور شور سے سفر وسیلۂ ظفر کی تیاری شروع کر دی۔ ''علیگ'' نام کا ایک انگریزی پرچہ نکال کر جرنلسٹوں کی صف اول میں شامل ہو گئے۔ کمیونسٹ تحریک کے روح رواں بن گئے۔ بنڈونگ انڈونیشیا میں ہونے والے یوتھ کنونشن کے وہ خود ساختہ ہندوستانی لیڈر قرار دیے گئے۔ غرض ان کے جو چار چاند تھے انہوں نے فوراً انہیں آٹھ کر لئے۔

الیکشن پر میری پس وپیش:

اس وقت میری مقبولیت عام تھی۔ کمیونسٹ تحریک اس وقت ساری دنیا میں امپریلزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر رہی تھی۔ ایس ایف۔ نے میرے ساتھ مل کر جمہوری سکیولر متحدہ محاذ کا اعلان کردیا اور میرے صدارتی انتخاب کی جدوجہد شروع کردی۔ چین کے سفر کی نوید اور ایس ایف کی پرجوش تائید نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا لیکن اس سہاگے نے سونے کو سرخ رنگ دے دیا۔

ایس ایف کا ایک ڈیلگیشن کامریڈ ماجد کی سرپرستی میں مجھ سے ملا اور مجھ پر زور ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں ابان جان سے مشورہ کرتا ہوں اور ان کے حکم کا انتظار کروں گا۔ اس کے نام پر میں اس پریشر کو ٹالنا چاہ رہا تھا جو روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ابا جان سے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مشورہ طلب کیا۔ ابان جان کے خطوط کبھی کبھار آتے تھے اور وہ امیدوں سے بھر پور ہوتے۔ اس بار اس خط کا فوری جواب موصول ہوگیا ابا جان نے بہت ہمت افزائی کا خط لکھا جس میں اس دور کے ہندوستان اور مسلم یونیورسٹی کے حالات کے تناظر میں میری صدارت کی تائید کی میرے عذر اور پیش بندیوں کو حافظ شیرازی کے میں شعر سے رد کردیا۔

مغاں زدانۂ انگور آب می سازد
ستارہ می شکند آفتاب می سازد
پیر مغاں انگور کے دانوں کو نچوڑ کر شراب بناتا ہے
گویا وہ ستاروں کو توڑ کر آفتاب بناتا ہے

آخر میں تحریر تھا: ''تمہاری فکر کی علی گڑھ کے نوجوانوں کو ضرورت ہے تم اس فرض سے کوتاہی نہ کرو۔

اس تحریر میں سارے عذر ختم کردیئے اور میں نے ارادہ کر کے اعلان کردیا ہمارے

احباب کی مشینری حرکت میں آ گئی۔اس بار خواہی نخواہی ایس ایف کے ورکرس نے باقاعدہ میری سپورٹ کا اعلان کر کے الیکشن کیمپین کا آغاز کر دیا۔گویا مدعی سست گواہ چست۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی الیکشن کے اخراجات کا مسئلہ تھا ہمارے دوست احباب کے علاوہ ایس ایف کی فنڈ ریزنگ کی مہارت کام میں آ رہی تھی لیکن میں خود خواہی نخواہی ایس ایف کا کنڈیڈیٹ بھی بنتا جا رہا تھا۔یہ بات میرے عقیدے اور مزاج کے خلاف تھی لیکن الیکشن پھر الیکشن ہے اور ایس. ایف کو روکنا میرے بس کا نہ تھا۔نہ الیکشن کے (اخراجات کا) انتظام کی سکت مجھ میں تھی۔

یونین الیکشن، مبشر محمد خان اور یہ عاجز:

میری امیدواری کے اعلان کے فوراً بعد مبشر محمد خان نے اپنی امیدواری کا اعلان کر دیا۔مبشر محمد خان خورجہ کے گورے چٹے خوبرو نوجوان تھے ایم.اے. پولیٹکل سائنس کے فائنل ایر میں تھے۔کونونٹ کے تعلیم یافتہ تھے۔انگریزی فر فر بولتے تھے۔کسی مذہبی جماعت سے تعلق نہ تھا۔یونین میں ان کا خاص رول نہ رہا تھا۔ان کے اعلان کے ساتھ انہیں پوری اینٹی کمیونسٹ لابی مفت میں دستیاب ہوگئی۔ان کی چند خوبیاں مجھ سے انہیں ممتاز کرتی تھیں:

۱۔ زبان انگریزی پر عبور

۲۔ پوسٹ گریجویٹ اسٹیٹس

۳۔ ایس ایف کی مخالفت اور

۴۔ شخصیت کی وجاہت

میرے خلاف سب سے کامیاب حربہ یہ رہا کہ میں انڈر گریجویٹ تھا اور یونین کی مقدس روایات توڑ رہا تھا۔یہ بات پوری یونیورسٹی میں پھیل گئی کہ میں انڈر گریجویٹ ہوتے ہوئے علی گڑھ کی شاندار روایت توڑ رہا ہوں۔یہ بات نہ یونین کے قانون میں تھی اور نہ مستند روایت تھی لیکن اس وقت وہ علی گڑھ کی مستند روایت بن گئی۔علی گڑھ کی دوسری اہم

روایات (انٹروڈکشن، ٹوپی اوڑھ کر مشاعرہ میں کلام سنانا، الیکشن ہارنے والوں کا جنازہ پیٹنا) کا کوئی اخلاقی پہلو تو نہیں تھا مگر ان کا تقدس مسلم تھا سو اس بار مقدس روایت کو توڑنے کا جادو چل گیا۔ کئی ہمارے قریبی دوست ہمارا ساتھ اسی بنیاد پر چھوڑ گئے۔ الیکشن زبردست طریقہ سے ہوا اور مجھے الیکشن میں کچھ ووٹوں سے شکست ہوگئی۔

جنازہ پیٹنے کی مقدس روایت کا وقت آیا تو ہمارے کیمپ کے سینئرس نے خاص طور پر ایس ایف کے ورکرس نے کہا کہ: ''جنازے کا جنازہ تو بلبلیا کی جیت کے وقت نکل گیا تھا جب ہماری شفیع قریشی کیمپ میں ڈنڈوں سے آؤ بھگت ہوئی تھی۔'' بعض زیادہ گرم خون والے نوجوانوں نے ڈنڈوں کا ذخیرہ خفیہ طور پر جمع کر رکھا تھا۔ جو میرے علم میں نہ تھا اور اگر ہوتا تو میرے اختیار میں نہ ہوتا۔

واضح رہے کہ میں بلبلیا اور شفیع قریشی کے الیکشن میں شفیع قریشی کا خاص کنڈکٹر تھا اور اس منظر کا بھی شاہد تھا جس میں بلبلیا پارٹی کی جنازہ پیٹنے والی ٹیم کو ڈنڈوں سے پسپا کر دیا گیا تھا۔ میری نگاہ میں جنازہ پیٹنا تفریح تھی قابل قدر روایت نہیں تھی۔ پہلے الیکشن سینیر لڑاتے تھے اور ان کے لئے جنازہ پٹوانا بھی اتنی ہی بڑا اعزاز تھا جتنا جنازہ پیٹنا۔ اب علی گڑھ کا ماحول سیاسی ہو چکا تھا اور مقابلہ کمیونسٹ اور اسلامی فورسز میں ہونے لگا تھا۔ اب جنازہ سیاسی حربہ بن گیا تھا۔

میں نے اپنے کیمپ کی ڈنڈے بازی کی مخالفت کی مگر سینیرس اور ورکرس کے سامنے میری چل نہیں سکی۔ جب ڈنڈے چلے تو پروکٹوریل ڈیپارٹمنٹ نے مجھے ایس.ایم. ایسٹ کی چھت کے محفوظ مقام پر پہونچا دیا جہاں دیگر سینئر اساتذہ کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے اور اس کی مزمت کرر ہے تھے۔ میرا سر خود شرم سے جھکا ہوا تھا۔

الیکشن کے دوسرے دن بھی فضا مسموم تھی لیکن اس شکست سے میرے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں پہلے بھی الیکشن لڑنے کو تیار نہ تھا۔ اور مجبوراً امیدوار بن گیا تھا۔ جس طرح

الیکشن ہوا، میں اس سے خود غیر مطمئن تھا۔ دوسرے دن جا کر میں نے مبشر محمد خان کو مبارکباد دیدی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ وہ بھی فتح مندانہ کسرنفسی سے ملے۔ دوستوں میں عرفان اللہ خان میرے لئے یہ خوش خبری لائے کہ گرلس کالج میں میری اکثریت رہی۔ مبشر محمد خان کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس نہ تھی لیکن: دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا تھا۔

الیکشن کی مصروفیت کے ساتھ چین کے سفر کی تیاری بھی چلتی رہی۔ میرے پاس اپنی شیروانی نہ تھی جو وی.بی.فنڈ نے بنوادی۔ دو نئے جوڑے ایک جناح کیپ اور زادِ راہ کے لئے ۲۰۰ روپیہ فی کس مزید محمود صاحب اور ذاکر صاحب کی توجہ سے میسر آیا۔ جسے ایوب سید نے بہ امانت اپنے پاس رکھنا مناسب سمجھا۔ اس دور میں پاسپورٹ ملتا ہی نہیں تھا اور ملتا تھا تو بہت تگ و دو کے بعد۔ یہ معاملہ تو سرکاری تھا اس لئے ہم نے فارم بھر کر بھیج دیے۔ اس سلسلے میں ہم نے سوچا کہ چین کے نوجوانوں کے لئے مسلم یونیورسٹی اور ہندوستان کے طالب علموں کی طرف سے پیغام لیجائیں۔ اس بات کا ذکر تفصیل سے ہمارے مضمون ''ہمارے ذاکر صاحب'' میں آچکا ہے۔ مختصراً یہ کہ ذاکر صاحب نے سادہ سلیس بامحاورہ اردو میں ہندوستان کے نوجوانوں کی طرف سے پیغام محبت لکھ کردے دیا اور یونیورسٹی نے ترنگے جھنڈے کے باڈر کے ساتھ چکنے کاغذ پر پرنٹ کر کے ساتھ کردیا۔

بیماری، شہلا آپا، تیمارداری اور روانگی:

سفر سے چند روز قبل خلاف توقع ہم بیمار ہو گئے اور یونیورسٹی کے کلینک میں جو یونین کے عقب میں واقع تھا داخل ہو گئے بخار تیز تھا سر میں درد شدید، چین جانے کے خواب ہوا ہونے لگے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب (صدر چیف میڈیکل آفیسر) سے یوں تو یونین کے پلیٹ فارم سے چھیڑ خانی اور جنگ دونوں ہی ہوتی رہتی تھیں لیکن خود ان کی اور ان کے زیر سرپرستی اسٹاف کی کوششیں غیر معمولی تھیں۔ میرے لئے تسلی اور تشفی کا بڑا سرمایہ

بہن شہلا حیدر تھیں جو بعد میں شہلا رضا بن گئیں۔ جنہوں نے بڑی آپا بن کر اپنی پوری توجہ مجھ پر صرف کردی۔ روانگی سے دو دن پہلے ذرا طبیعت سنبھلی اور روانگی کے دن لرزیدہ قدموں سے ٹرین میں ایوب سید کے سہارے داخل ہو سکا۔ اسٹیشن پر بہت بڑا مجمع تھا جس میں ایس ایف اور ترقی پسندوں کی اکثریت تھی۔ ان کا ذوق وشوق ان مومنین صادقین کا تھا جو حجاج کو حج کے لئے رخصت کرتے تھے۔ چند احباب (ظفر امام عرفان اللہ خان) دلی تک آئے اور ایرپورٹ پر خدا حافظ کہا۔

ہم پٹودی ہاؤس میں ٹھہرے جس کا معیار جامع مسجد کے سرائے خانوں سے کسی درجہ کم تھا۔ جاتے ہوئے بھی وہاں بعض طلباء کی گھڑیاں اور سامان چوری ہوا اور آنے کے بعد بھی۔ ہماری روانگی اتوار کو تھی سنیچر کو ہمیں پاسپورٹ ملے۔ بے پناہ خوشی کے ساتھ پاسپورٹ کو دیکھا تو ہمارے پاسپورٹ پر ایوب سید صاحب کی تصویر ہے اور انہوں نے اپنا پاسپورٹ کھولا تو اس پر میری تصویر تھی۔ یہ بات ہم فوری طور پر ارباب حل وعقد کے علم میں لائے تو وہ خود حیران رہ گئے۔ سب نے اجتماعی مشورہ دیا کہ میں ایوب بن کر ان کے پاسپورٹ پر سفر کروں اور وہ عابداللہ غازی بن کر میرے پاسپورٹ پر۔ مسئلہ یہ تھا کہ دوسرے دن اتوار تھا اور پاسپورٹ آفس بند تھا دوسرا راستہ یہ تھا کہ ہم سفر نہ کریں۔ یہ بات کہ ایم. پانیکر صاحب اور سوامی آئر (لیڈر آف ڈیلیگیشن) تک پہونچی تو انہوں نے کچھ تگ ودو کی اور کہا اب تو جو ہوگا صبح کو ہوگا۔

ہماری تو نیند ہی غائب تھی۔ صبح کے انتظار میں کئی بار اندھیری رات میں صبح کی کرنیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے کرتے رات گذر گئی۔ ناشتہ کے بعد ہم سب ایرپورٹ روانہ ہو گئے۔ ایرپورٹ پر پاسپورٹ آفس کے کسی آفیسر نے مع عملہ کے ہمارا استقبال کیا، دوسرا پاسپورٹ بننے کے لئے نئی کاپیاں موجود نہ تھیں انہوں نے بڑی کوشش سے چپکی ہوئی تصویریں نکالیں۔ ایک دوسرے کے پاسپورٹس پر چسپاں کیں۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تصاویر

اور پاسپورٹ بنانے والے آفیسر کے دستخط اس طرح تھے کہ وہ تصویر سے شروع ہو کر پاسپورٹ کے صفحہ پر ختم ہوتے تھے۔اتفاق سے وہ آفیسر موجود نہ تھے۔ان کے دستخطوں کو نظرانداز کر کے نئے آفیسر نے دستخط کیئے۔اب دونوں پاسپورٹ جعلی لگ رہے تھے۔لیکن ہندوستان سے روانگی اور چین کے استقبال میں کسی نے پاسپورٹ کی شکلیں ڈھنگ سے نہیں دیکھیں۔روانگی کے وقت حکومت کے بہت سے آفیسر خدا حافظ کہنے کے لیے تھے اور چین میں ہم ہندوستان کے معزز مہمان تھے۔

پانیکر صاحب نے روانگی سے قبل ہندوستان چین تاریخ ماضی اور مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہم لوگ ہندوستان کے اصلی سفیر ہیں اور ہمارے وہاں کے معاملات پر دونوں ملکوں کے مستقبل کی تاریخ کا تعین ہوگا۔ان کی تقریر نے ہمارا قد بہت بلند کردیا۔پھر ہمارے لیڈر سی. پی. راما سوامی آئر نے بڑی مرصع، مقفع مسجع انگریزی میں ولولہ انگیز تقریر کی اور ہمیں سمجھایا کہ پانیکر صاحب نے جو ہم کو سفیر ہندوستان کہا ہے اس کا کیا مفہوم ہے۔سی. پی. سوامی آئر ہندوستان کے مایۂ ناز ایڈمنسٹریٹر تھے۔ان کا تجربہ اور مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، انہوں نے ہم نوجوانوں کی قیادت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔پانیکر صاحب اور آئر صاحب کی تقریر میں ہمارے لئے نصیحت ہی نہیں تھی بلکہ ہندوستانی ہونے کے ناطے خوداعتمادی کا بھی پیغام تھا۔

ہمارا جہاز جب ہندوستان کی زمین سے اڑا تو ہم میں سے اکثر کو گھر کی یاد آنے لگی۔یہ جہاز ہمیں ہانگ کانگ لے گیا جو اس وقت انگریزوں کی کالونی تھی۔یہ ٹیکس فری ایریا تھا۔وہاں دکانیں ہر طرح کے سامان سے کھچا کھچ بھری تھیں۔سیاحوں کی رہنمائی اور رہزنی کے لیے ہر گلی میں گائیڈ ٹہل رہے تھے۔ممتاز آپا نے ہم، دونوں پر کڑی نظر رکھی۔ہم دونوں نے بازار گشتی کا ارادہ کیا تو ممتاز آپا نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گی۔وہاں بازار میں ہر طرح کے مال کے ساتھ جنسی مال کی بھی بہتات تھی۔

چین میں پہلا قدم:

ہم بذریعہ ٹرین چین کی سرحد تک گئے اور وہاں سے ٹرین بدل کر کینٹن پہونچے جہاں اسٹیشن پر پیکنگ یونیورسٹی کے میزبان طلباء اور اساتذہ منتظر تھے۔وہاں سے ہم ہوٹل پہنچے جو یقیناً فائیو اسٹار تھا اور ہمارا پہلا تجربہ تھا۔

ہمارا سامان لابی میں رکھا تھا ہمیں اپنے کمرے کی چابی مل چکی تھی۔کچھ پورٹرس سامان باری باری لے جارہے تھے۔ہماری میزبان دولڑکیاں سپروائز کررہی تھیں۔انہوں نے ہم سے ہمارے سامان کی نشاندہی کرائی پھر وہ دونوں میرا اور ایوب سید کا سامان لے کر دوڑ گئیں۔ہم دونوں شرمندہ شرمندہ ان دونوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہ ہم خود ان سے سامان لے لیں۔مگر وہ سامان اٹھانے کے باوجود اس دوڑ میں جیت گئیں۔یہ پہلا تجربہ تھا بعد میں معلوم ہوا وہاں ہر شخص ہر کام کرتا ہے۔مزدوری کا کام اساتذہ، طلباء عورت مرد میں مشترکہ تھا، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں یہاں ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور نہ تھا۔بعد میں ہم نے دیکھا کہ رات میں کام سے فارغ ہوکر طلباء اساتذہ اور عام ورکرس مل کر بیٹھتے ہیں اور چین کے قومی ترانے گاتے رہیں یا کوئی کھیل کھیلتے۔

صبح کینٹین گھومنے کے لئے بڑی تیاری سے نکلے۔ہندوستانی لڑکیوں نے خوبصورت ساریاں زیب تن کررکھی تھیں اور مناسب زیورات سے سجی بنی تھیں۔چینی لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی لباس تھا۔نیلے رنگ کی شرٹ اور پتلون لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرے ہر طرح کے زیورات سے عاری تھے۔ہمارے نوجوان بھی تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے۔چین میں لباس کے بارے میں یہ تجربہ ہر شہر میں ہوا۔کچھ دن بعد تو ہمیں اپنے فاخرہ لباسوں کو پہن کر چینی نوجوانوں کے سامنے سے شرم آنے لگی تھی۔

کینٹین سے ہم بذریعہ ہوائی جہاز پیکنگ پہونچے جہاں استقبال کے لئے بہت سے پیکنگ یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسر موجود تھے۔وہاں ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر

ازبک نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ازبک چوکور ٹوپی اوڑھے ہوئے اپنے قومی اسلامی لباس میں موجود ہیں۔ میں فوراً ان کے پاس پہونچ گیا اور السلام علیکم کہا۔ اس کے بعد ہماری اور ان کی گفتگو اشاروں کنایوں میں شروع ہوگئی۔ لیکن جو پیغام ہم پہونچانا چاہتے تھے وہ پہونچ گیا اور جو پیغام وہ ہمیں دینا چاہتے تھے ہمیں مل گیا۔

پیکنگ کا قیام:

پیکنگ میں قیام تقریباً دس روز رہا۔ وہاں پر بہت شاندار ہوٹل میں قیام تھا۔ کمرہ میں ہر روز دو پیکٹ سگریٹ اور دو بوتلیں بیر کی ملتی تھیں۔ لانڈری، جوتا پالش، حجامت غرض ساری ضروریات زندگی فری تھیں۔ کھانے کی دو میزیں ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین ہر طرح کے چینی کھانوں سے سجائی بنائی جاتی تھیں کم از کم دس بارہ طرح کے کھانے ہوتے۔ میں ویجیٹرین ٹیبل پر تھا اور ایوب نان ویجیٹیرین ٹیبل پر۔ ایوب چین کی پیکنگ ڈک کو مجھے دکھا دکھا کر مسکرا مسکرا کر کھاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی میزوں کے کھانے والے پہلے ہی دن سے اس کھانے سے اکتا گئے تھے اور جتنا وقت گذر رہا تھا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ میزبانوں نے ہر طرح کے شہرہ آفاق کھانے سجا دیے تھے لیکن ہندوستانی مسالوں کے ذائقہ شناس کو نہ کھانے میں ذائقہ تھا نہ اس کی خوشبو میں اشتہا۔

بالآخر ایک دن سب نے اعلان جنگ کر دیا۔ چینیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور باورچی خانہ لڑکیوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں میدہ تیل، آلو، سیاہ مرچ اور نمک ملے انہوں نے بے مسالہ کی آلو کی ورقیاں بنائیں اور میدہ کی پوریاں۔ اس دن سارا ڈیلیگیشن شاکاہاری میز پر جمع تھا۔ چینی حیران تھے کہ دونوں میزوں پر چینی شہرہ آفاق باورچیوں کی کوششوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔

ایک دن میں نے دیکھا کوئی مسلمان ہوٹل میں آرام سے گوشت خوری کر رہا ہے میں نے اپنا تعارف کرا کے ان کا تعارف چاہا۔ وہ پاکستان کے چینی سفیر سلطان محمد خان

تھے۔گوشت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ پیکنگ میں گوشت ذبیحہ ہوتا ہے اور صرف مسلمان ہی کو ذبیحہ کی اجازت ہے انہوں نے یقین سے کہا: ''آپ گوشت کھایئے میری ضمانت ہے۔'' ان کی ضمانت پر ہم نے عالمی شہرت یافتہ پیکنگ ڈک کھائی وہ اتنی ہی بے مزہ لگی جتنا وتجیٹیرین کھانا تھا۔ دراصل ہر کھانے کے لئے کام و دہن کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ساری زندگی پردیس میں گزار کر ہر طرح کے کھانوں کے تجربے ہو گئے اور اب گاہے بہ گاہے چینی کھانے کی خواہش خود سے ہوتی ہے۔تین سال قبل جب ہم دوبارہ چین گئے تو وہاں خوب چینی کھانے کھائے در ایک دن بھی ہندوستانی کھانوں کی یاد نہیں آئی۔

سلطان صاحب کی محبت شفقت میں بدل گئی تھی چند دن بعد وہ اپنے گھر میں جا بسے اور جب ہم اطلاع کرتے ان کی گاڑی ہمیں آ کر لے جاتی۔ان کی بیگم صاحبہ بہت شفقت سے مزے مزے کے کھانے کھلا دیتیں۔ان کی بیٹی لیلیٰ بھی شریک محفل رہیں۔ سلطان صاحب کو یقین تھا کہ ایوب اور میں تعلیم ختم کر کے پاکستان جائیں گے۔ایک دن گفتگو میں یہ راز کھلا کہ ہم دونوں ہندوستان میں رہنے کا اٹل فیصلہ کر چکے ہیں انہیں حیران کر گیا۔ یہ فیصلہ سن کر انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا مایوس کن نقشہ کھینچ کر پاکستان میں مسلمانوں کے روشن مستقبل کا پیغام دیا اور بہت سے عمل کے میدانوں کی نشاندہی کی۔لیکن جب انہوں نے ہمارے خیالات سنے تو انہوں نے ہمارے جذبات کی قدر کی اور ان کی محبت میں فرق نہیں آیا۔

صبح سے دوپہر تک چین کی آئیڈیولوجی تعمیر و ترقی پر تعلیمی تعارفی لیکچرس ہوتے تھے۔سارے لیکچرس چینی میں ہوتے ہر جملہ کے بعد انگریزی میں ترجمہ ہوتا۔کبھی کبھی کھانے کا بریک ہوتا اور اس کے بعد پھر لیکچر شروع ہو جاتا۔لیکچر کے بعد سوال و جواب ہوتے۔سر سی۔ پی۔ آر موقع نکال کر شکریہ کی تقریر میں ہندوستان کے ماضی حال اور مستقبل کے پلانوں کا ذکر اس خوبصورتی سے کرتے کہ چینیوں کی تقریر کا سارا اثر زائل ہو جاتا۔

ہندی چینی بھائی بھائی:

اکتوبر کے دن ہم چین کی آزادی کے جشن کو دیکھنے کے لئے گئے۔محل کی گیلری میں ماؤزی تنگ اور ساری چینی کیمونسٹ قیادت کھڑی تھی اور سامنے سے منظم گروہ طرح طرح کے کھیل تماشے کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ ہمارا اسٹینڈ گیلری سے متصل تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل گیا اور گیلری کے نیچے پہونچنے کی کوشش کی۔ پولیس نے مجھے روکا لیکن چیرمین ماؤزی تنگ نے انہیں اشارہ سے روک دیا اور میں ان کے بہت قریب پہونچ گیا۔ چیرمین ماؤ اور ان کی کیبنٹ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی رہی اور میں سرخرو ہوکر واپس اپنے اسٹینڈ میں آگیا۔اس جشن کا منظر مدتوں نظروں میں بسا رہا۔اتنا بڑا انسانوں کا منظم گروہ نہ پہلے دیکھا نہ کبھی بعد میں۔

پیکنگ میں گریٹ ہال میں جشن آزادی کے موقع پر چاؤاین لائی، جودے، سنگ چنگ لنگ اور دوسرے چینی لیڈروں سے مصافحے کیئے۔اور انہیں نزدیک سے دیکھا۔بعض لیڈروں سے انفرادی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔جن میں خاص ملاتاقات سنگ چنگ لنگ بیگم سن یاٹ سین سے تھی، جو چین کی نائب صدر رہیں۔وہ چیانگ کائی شیک کی سالی تھیں۔مختلف کلچرل پروگراموں میں ہمارے وفد کے نوجوانوں نے شرکت کی اور زبردست واہ واہ ہوئی۔ ہماری کاریں جدھر سے گزرتیں ادھر بھیڑ لگ جاتی۔مختلف محفلوں کا مقبول گانا تھا۔

"ہندی چینی بھائی بھائی"

جس کا چینی ترجمہ آن پنگ یو ہاوان سولے Unchange you hawans way کا وزن اور طرز بھی ہندوستانی گانے کے وزن پر تھا اور اکثر محفلوں کی اکثریت اس سے واقف تھی۔جب یہ گانا شروع ہوتا تو تقریباً سارا مجمع اس میں شریک ہو جاتا۔

پیکنگ سے ہمارا سفر ٹرین کے ذریعہ تھا جو صرف ہمارے لیے چل رہی تھی۔اس میں دس اساتذہ بیس طلبا ایک لیڈر اور ان کی نواسی سکریٹری سیتا کل ۳۲ ہندوستانیوں کی

خدمت اور معاونت کے لیے اتنا ہی بڑا چینی اساتذہ طلبا اور ملازمین کا عملہ تھا۔ٹرین میں بھی چینی مل کر انقلابی گانے گاتے اور مختلف مزامیر بجاتے تھے۔ان کے مقبول گیت خود چیرین ماؤ سی تنگ کے ترانے ہوتے تھے۔ان میں سب سے مقبول گانا تھا''مشرق سرخ ہو گئی۔''

ہندوستان کی سفارت میں ہماری کئی دعوتیں ہوئی۔سفیر صاحب کا نام تو میں بھول گیا۔لیکن ایک فرسٹ سکریٹری پران چپے کی یاد میری کالی جناح کیپ کے حوالے سے آج تک ہے۔انہیں میری جناح کیپ پسند آئی تو میں نے اپنے سر سے اتار کران کے سر پر رکھ دی۔انہوں نے اسے میرے سر پر رکھتے ہوئے کہا میں واپسی کے وقت ہانگ کانگ آ کر لے لوں گا۔میں اسے مزاق سمجھا۔مگر وہ ہانگ کانگ پہونچ گئے اور مجھ سے ٹوپی وصول کر لی۔یہ بات ۱۹۸۰ میں بیس سال پرانی ہو چکی تھی جب کوریا کے مختصر قیام میں معلوم ہوا کہ پران چپے صاحب وہاں ہندوستان کے سفیر ہیں۔میرا قیام مختصر تھا فون کیا تو ٹوپی کے حوالے سے پہچان گئے۔بہت تپاک سے گفتگو کی مگر میں ملاقات کو نہ جا سکا۔

مکڈن:مسلمانوں سے ملاقات:

ہم نے کینٹن شنگھائی مکڈن نانکنگ انسان فوشان ہانگ چاؤیا سات شہر گھومے۔وہاں کے ترقیاتی منصوبوں کو دیکھا اور ان کے بارے میں طویل لیکچرس سنے۔ہر لیکچر کے بعد سر آئر اپنی تقریر میں ہندوستان کا سر بلند کرتے رہے۔مکڈن کا ایک واقعہ بہت یادگار رہا۔

مکڈن میں سنا تھا مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ہماری کاروں کا کارواں کسی محلے سے گزر رہا تھا کہ ہم نے ایک دکان پر عربی میں طعام اسلام کا سائن بورڈ دیکھا ہم نے بصد اصرار کار رکوا دیا اور اتر کر دکان میں گھس گئے۔میرے ساتھ ایوب سید بھی تھے۔ہمارے میزبان ہماری گاڑی اور ہمارے ہندی کے ترجمان مسٹر پرکاش کو چھوڑ کر ہوٹل روانہ ہو گئے۔انہوں نے سوچا تھا کہ ہم تھوڑی دیر دکان دیکھ کر ہوٹل پہونچ جائیں گے لیکن ہمیں

پہلی دفعہ آزادی مل گئی۔ پرکاش جی کا چینی نام یادنہیں ہم لوگوں نے اپنی آسانی کے لئے انہیں پرکاش نام دے دیا تھا۔وہ ہمارے ہندی کے ترجمان تھے مگران کی شدھ ہندی کا تعلق کچھ آکاش وانڑی والی زبان سے تھا جس کو سمجھنا جنوبی ہندوستان والوں کے لیے ناممکن تھا اور شمالی ہندوستان والوں کے لیے مشکل۔ بہر حال انہیں سے کام چلانا تھا۔ ہمیں دوکان کے مالک کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس محلہ میں جامع مسجد ہے اور پرائمری اسکول بھی ہے۔ پرائمری اسکول میں تقریباً چار ہزار طلباء تھے۔ میں نے خواہش کی کہ ہم دونوں جگہ ملاقات کے لیے جائیں۔اب مسٹر پرکاش تذبذب میں تھے کہ یہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ ادھرہم اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

ہمارا پہلا وزٹ مسجد کے لیے تھا۔ہم وہاں پہونچے تو امام صاحب ہمارے منتظر تھے۔انہوں نے بہت تپاک سے استقبال کیا۔کانفرنس روم میں چیرمین ماؤ سی تنگ کی تصویر آویزاں تھی اور دوسری تصویر میں امن کی فاختائیں اڑرہی تھیں۔ امام صاحب نے پرانی چیانگ کائی شیک کے مظالم کی داستان سنائی اور جدید کمیونسٹ حکومت کی فراخ دلی اور عدل گستری کی تعریف کی۔ پوری تقریر لگی بندھی تھی۔مسجد میں چند عمر رسیدہ لوگ تھے۔ کچھ بڑے بوڑھے حمام کے احاطے میں بیٹھ کر آگ تاپ رہے تھے۔

یہاں سے ہم پرائمری اسکول کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لگتا تھا کہ نہ صرف اسکول کو بلکہ پورے محلّہ کو بھی ہماری آمد کی خبر ہو چکی۔ ہم اسکول کے احاطے میں داخل ہوئے تو دیکھا اساتذہ بچوں کے پیچھے بھاگ کر انہیں کلاسوں میں بٹھانا چاہ رہے ہیں لیکن بچے ہندوستانی مہمانوں کا استقبال کھلے عام صحن اسکول میں کرنا چاہتے تھے۔ ہماری درخواست پر اساتذہ نے بچوں کو میدان میں جمع کردیا اور ہم نے تقریر شروع کی۔ پرکاش صاحب ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ بچے ہر بات پر خوش ہوکر تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے تھے۔

اسکول سے فارغ ہوکر واپس کارتک پہونچنا تھا لیکن وہ راستہ پر جوش لوگوں نے

استقبال کی وجہ سے چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔راستہ میں امام صاحب کا بھی گھر تھا۔انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے وہاں ٹھہرایا اور اپنی بیگم اور بچوں سے ملاقات کرائی۔عربی کا قرآن دکھایا جس کی وہ روزانہ تلاوت کرتے تھے۔امام صاحب کا اسلامی نام یوسف تھا اور ان کی بیگم کا مریم تھا۔چین میں مسلمان دو نام رکھتے ہیں ایک چینی دوسرا اسلامی۔عام طور پر سماجی زندگی میں وہ چینی ناموں سے پہچانے جاتے ہیں اور مسلم اجتماعات میں اسلام ناموں سے۔

محلے میں پہلے ہی سے ہندوستانی مسلمانوں کی آمد کی خبر پھیل چکی تھی۔اسکول سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی بچوں نے استادوں کی کوششوں کے باوجود گلیوں کی راہ لی سڑک پر ہمارا چلنا محال ہوگیا۔بہت سی خواتین ہمیں دیکھ کر رو رہی تھیں۔بچے اور بڑے ہم سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔سب خوش تھے لیکن پرکاش کے چہرے پر خوف اور وحشت تھی۔ چینی حکومت کے احکامات کے تناظر میں یہ سب کچھ آؤٹ آف آرڈر تھا۔اور پرکاش کو واپسی پر اپنی خیر منانی تھی۔امام صاحب کے گھر سے کار تک کا سفر بمشکل طے ہوا اور کار میں بدقت بیٹھنے کے بعد کار کا اس ہجوم سے نکلنا کارے دارد تھا۔ان سب مراحل کو طے کرنے میں دقت تو لگا لیکن ایک ایسا تجربہ ہوا جو پوری سیاحت پر بھاری تھا۔وہ تجربہ اسلامی رشتے کی مقناطیسیت کا تھا۔ان لوگوں سے نہ جان نہ پہچان نہ ہم میں ہی کوئی شان مگر یہ کون سا جذبہ تھا جس نے ہزارہا لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔وہ کیسی محبت تھی جس نے قلب کے جذبات کو آنسوؤں میں ڈھال دیا۔یہ مناظر ہم نے قومی رہنماؤں اور مذہبی علماؤں اور فلم اسٹاروں کے بارے میں اس وقت سنے تھے اور ٹیلی ویژن کی آمد کے بعد مسلسل دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم اس تجربے سے زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار گذرے اور اس کا نقش آج تک قائم ہے۔

چینی تحفے اور ہندوستانی طغرے طعنے:

چین میں جو کچھ دیکھا وہ آج بھی یادیں تازہ ہیں۔ہندوستانی اور چینی ہمسفروں کے چہرے اور کچھ نام تک ابھی تک ذہن کے دریچوں میں دستک دیرہے ہیں۔روانگی سے

قبل ہمارے میزبانوں نے چاہا کہ ہم کو کچھ تحفے دیں۔اس مقصد کے لیے انہوں نے طالب علموں کو ڈھائی سو ین (Yen) فی کس رقم عطا کی کہ ہم خود اپنی پسند سے سامان خرید کریں۔انہوں نے کچھ دکانوں کا بھی انتخاب کیا تھا۔وہ لوگ ہمیں بازاروں میں لے جانے والے تھے۔ہمیں تو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ ہماری جیب بالکل خالی تھی۔جو دو سو روپے فی کس یونیورسٹی نے دیے تھے وہ بھی ایوب سید کی جیب کو گرم کر رہے تھے۔اور انہیں اپنی جیب میں منتقل کرنے کی کوئی آسان شکل نہیں نظر آ رہی تھی۔جس محفل نے سی پی آئیر صاحب نے اس کیش تحفہ کا اعلان کیا وہاں کچھ خود دار قوم پرست بھی تھے جنہیں اس چینی مہمان نوازی میں ہندوستان اور ہندوستانیت کی توہین نظر آئی۔انہوں نے زبردست احتجاج کیا۔سر سی پی آئر نے بہت سمجھایا کہ جو خاطر تواضع مدارات ونوازشیں انھوں نے کی ہیں وہ ہمیں سسرال میں بھی میسر نہیں آتیں اور اگر ہماری دعوت پر چینیوں نے اپنا وفد بھیجا تو ہم اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے لئے نہ کرسکیں گے۔اس چینی پیش کش کو رد کرنے سے اس وفد کے مقاصدِ خیر سگالی متاثر ہوں گے۔اس مسئلہ پر بڑی زبردست بحث ہوئی آخر یہ طے پایا کہ جو لوگ اس پیش کش کو قبول کرنا چاہیں وہ قبول کریں اور جو رد کرنا چاہیں وہ رد کردیں۔قبول کرنے والوں کے ہاتھ اٹھے تو شاید سب سے پہلا ہاتھ میرا تھا۔اکثریت قبولیت کے حق میں تھی۔

ان ۲۵۰ ییَن کی برکت سے ہم نے چینی مصنوعات اور نوادرات کی خریداری کی جس میں دو خوبصورت اسکرول دو اسٹون کارونگ اور کپڑے میں بُنی ہوئی چینی لیڈر شپ کی تصویریں اور چین کی سینریاں تھیں۔کچھ چینی کی بنی ہوئی چڑیاں اور امن کے کبوتر خریدے۔ اسکرول اور اسٹون کارونگ ذاکر صاحب کے ذریعہ یونیورسٹی کو پیش کردیں۔اس زمانے میں یونیورسٹی میں چھوٹا سا میوزیم تھا۔اب پتہ نہیں وہ میوزیم ہے کہ نہیں اور یہ بھی پتہ نہیں ہمارے وہ تحائف کیا ہوئے۔امن کے کبوتر ہم نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ان یونیورسٹی کے وزٹ پر (۱۹۵٦) پر پیش کیے تھے۔وہ علی گڑھ کے قیام میں ان چڑیوں سے کھیلتے رہے۔

چین کو خدا حافظ:

واپسی میں ہمیں پھر فلائٹ کے لیے ہانگ کانگ آنا تھا۔نومین لینڈ پر ہم اور چینی مہمان رخصت ہو رہے تھے تو دونوں ڈیلی گیٹس بڑے اور چھوٹے، خواتین وحضرات کچھ آنسو بہا رہے تھے کچھ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اس ایک ماہ کے سفر نے باہمی محبت ومودت کا ایسا رشتہ قائم کر دیا تھا کہ جسے بجز اشک باری کے کسی طرح کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس محبت کے جذبات صرف ذاتی نہیں تھے بلکہ اس کے پیچھے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات اور یگانگت کے لیے مستقبل کی امیدیں تھیں۔

نومین لینڈ سے واپس میں پٹودی ہاؤس تک کوئی نہیں ہنسا اور پٹودی ہاؤس سے دوسری صبح بچھڑتے وقت دوبارہ ہماری زبان آنسوؤں کی لڑیاں بن گئی تھی۔چین سے واپس آنے کے بعد برسوں مختلف موقعوں پر ہم ملتے رہے۔تامبرم سینی ٹوریم مدراس کے قیام میں سہاسنی دلیش پانڈے (بمبئی یونیورسٹی) اور چندر شیکھر (بنارس) سے مجھے دیکھنے آئے تھے۔ بمبئی وزٹس پر میں سہاسنی سے چوپاٹی کے گھر ملنے جاتا تو ان کا پورا گھر خوشیوں سے بھر جاتا۔ اور ان کی والدہ اپنے ہاتھ سے کھانے پکا کر کھلاتیں۔درحقیقت انسان کی اصل زبان محبت کی زبان ہے جو اسے بولتے ہیں وہی اس کی لذت سے آشنا ہیں اور اس کی قدر جانتے ہیں۔

علی گڑھ واپسی پر زبردست استقبال ہوا مگر وہ یک طرفہ تھا۔ایس ایف استقبال میں آگے آگے تھی۔یونین میں بھی ہماری اور ایوب سید کی تقاریر ہوئیں۔دہلی کے باتصویر مجلہ آئینہ کے ایڈیٹر ظ۔انصاری صاحب نے مجھ سے چین کے سفر کے تاثرات پر مضمون لکھوایا اس کو باتصویر شائع کیا اور اس کا معاوضہ ۱۵روپیہ بھی پیش کیا۔اس معاوضہ نے میرے بہت سے مسائل کو حل کیا۔

اسلام پھر خطرے میں:

واپس آکر یونین کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔مبشر احمد خاں کی کابینہ ذمہ داریاں سنبھال چکی تھی۔ یونین کی سیاست بدستور تھی۔ ہمارے عزیز دوست ظفر امام

(بہاری) سیکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ یونین میں چند ہی مسائل اختلافی تھے۔ مبشر صاحب کی کیبنٹ نے ایک پارلیمنٹری ڈبیٹ رکھا جس میں ہر پارٹی کے خاص نمائندوں کو دعوت فکر دی گئی تھی موضوع تھا ''ہندوستان میں سیکولرزم کا نفاذ اس کی سماجی اقدار کے خلاف ہے'' پارلیمنٹ کے کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے نے جس کا تعلق کیرالا سے تھا جوش میں آکر یہ کہہ دیا ''سیکولر ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے ناموں کو مذاہب سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔'' یہ ان کا آئیڈیولوجک اسٹینڈ تھا۔ لیکن یونین میں گرما گرمی پیدا ہوگئی۔ یونین کے باہر ایس ایف، کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹی سب اس کی زد میں آگئے۔

ایس ایف کے لوگوں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر دینی حمیت کے جذبات نے ان کے ہر عذر کو رد کردیا۔ پھر یونین کا جلسہ ہوا۔ دھواں دھار تقاریر ہوئیں۔ کمیونسٹ نمائندہ اور کمیونسٹ پارٹی دونوں کی زبردست مذمت ہوئی۔ ابن فرید صاحب کی تقریر جذبات سے پر تھی انہوں نے واضح الفاظ میں حکومت کو بتلادیا: ''اگر حکومت نے مسلم یونیورسٹی کا نام بدلنے کی کوشش کی تو ہم اس یونیورسٹی کے اینٹ اور پتھروں کو بھی واپس کردیں گے۔ اسلام سے اس یونیورسٹی کا وجود بنا ہے۔'' میں نے اس مجمع کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی لیکن میں نے اپنا سر بچاتے ہوئے اُس غلطی کا ارتکاب نہیں کیا جس کے پاداش میں ہماری فرسٹ ایر میں رضی الدین صدیقی کو یونین میں دھکے کھانے پڑے تھے۔

پروفیسر مظفر علی۔ میرا حقہ پانی بند:

ایک دن میں کلاس سے کمرے پر واپس آیا تو وہاں ہمارے محترم پرووسٹ پروفیسر مظفر علی (ریڈر شعبۂ جغرافیہ) کا محبت نامہ ملا جس میں تحریر تھا کہ اسی دن سے میرا فری کھانا بند کردیا گیا۔ میں نے اسی وقت اس پر یہ قرآنی آیت (وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ) یعنی ''اللہ جس کو چاہے بغیر حساب کتاب کے رزق عطا کرتا ہے'' لکھ کر حامد ویٹر کے ذریعہ پرووسٹ آفس بھجوادی۔ دوسرے دن مظفر صاحب کی طرف سے پیشی طلب کرلی گئی۔

اس موقع پر الطاف صاحب (کلارک آفتاب ہال) کو بھی طلب کرلیا جنہوں نے اپنے تقوے اور عربی سے شدھ بدھ کی بدولت پرووسٹ صاحب کو اس آیت کا ترجمہ کر کے سنا دیا تھا۔

مظفر صاحب گویا ہوئے۔

''غازی میاں آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے؟''

''جی نہیں۔آپ نے طلب کیا میں حاضر ہو گیا۔''

''آپ نے میرے خط کے جواب میں یہ کیا لکھا ہے؟''انہوں نے میرا نوٹ دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ میں نے نہیں لکھا۔جو قرآن میں لکھا تھا اسی کو میں نے آپ کی نذر کر دیا۔''

''تم یہ کھانا مفت کیوں لیتے ہو؟''

''شاید مسعود صاحب (وارڈن) کو میرے حالات کا علم تھا سو انہوں نے جاری کرا دیا تھا۔''

''کھانا بند رہا تو تم کیا کرو گے؟''

''مجھے اپنی فکر نہیں بلکہ اپنے ایک ساتھی کی فکر ہے جو میرے ساتھ اس کھانے میں شریک ہیں۔''

''ایک کھانے میں تم دونوں کا پیٹ بھر جاتا ہے؟''

''ان کا تو مجھے معلوم نہیں میرا ضرور بھر جاتا ہے۔''

''تمہارے گھر سے کتنا خرچ آتا ہے؟''

''میرا کوئی گھر نہیں اور کہیں سے میرا کوئی خرچ نہیں آتا۔''

تھوڑی دیر اوٹ پٹانگے سوالات کے جوابات پا کر وہ مسکرائے پھر انہوں نے الطاف صاحب سے فرمایا:''غازی میاں کا کھانا واپس جاری کرادو۔پھر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا:''جب گھر سے خرچ نہیں آتا تو پھر الیکشن کیوں لڑتے ہو۔''

''میں الیکشن نہیں لڑتا میرے دوست لڑاتے ہیں۔ وہی چندہ کر کے الیکشن کا خرچ پورا کرتے ہیں۔''

دراصل مظفر علی صاحب جغرافیہ کے بہت مقبول پروفیسر تھے۔ ہر چند وہ عملاً مذہبی آدمی نہیں تھے مگر قلباً وہ اساتذہ کے اسلامی بلاک سے وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ علی گڑھ کے الیکشن میں ہمیشہ نمائندے متمول گھرانوں کے ہوتے تھے اور وہی عام طور پر یونین کی سیاست میں سرگرم ہوتے تھے۔ اس لیے مظفر علی صاحب کا یہ تاثر کہ میں الیکشن بھی لڑتا ہوں اور مفت خوری بھی کرتا ہوں قابل فہم تھا۔ ہم سیکریٹری شپ کے الیکشن میں چندہ کی بدعت کا آغاز کرا چکے تھے۔ صدارت کے الیکشن میں ہمیں کنڈیڈیٹ بنانے والوں نے پوری ذمہ داری لے لی تھی۔ ایس ایف کی سپورٹ، جنازہ کے وقت لاٹھی، ڈنڈا، چین کا سفر اور اس کے تاثر پر تقاریر نے ہمیں بہت سے ثقہ مسلمانوں کی نگاہ میں کمیونسٹ بنا دیا تھا۔ مظفر صاحب نے بھی کھانا بند کرنے کو کار خیر سمجھا ہوگا۔

کھانا بند ہونے کی خبر میں نے کھانا شریک بھائی عبدالحفیظ میاں کو دے دی تھی اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا متبادل انتظام کرا دوں گا۔ کھانا جاری ہونے کی خبر بھی میں نے عبدالحفیظ میاں کو دے دی۔ اب بات زبان پر آ گئی تو قلم سے بیان بھی کر دوں۔ حفیظ میاں این آرسی (نان ریزیڈنٹ) طالب علم تھے اور شہر میں رہتے تھے۔ ایک دن وہ پروفیسر المامون الدمشقی (پروفیسر عربک) کا خط لے کر میرے پاس تشریف لائے۔ اس خط میں ان کے حالات کے پیش نظر ان کی امداد کی سفارش تھی۔ المامون الدمشقی کا تعلق شام سے تھا۔ وہ شعبہ عربک اسٹڈیز میں عربی پڑھاتے تھے۔ میں ان کا عربی کی تعلیم میں شاگرد تھا۔ جس دن عبدالحفیظ خط لائے شاید وہ کئی دن سے بھوکے تھے۔ ان پر نظر پڑی تو خود میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے سوال کیا کہ آپ نے دوپہر کا کھانا کھایا تو جواب میں ان کے آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں نے جواب دیا۔

حسن اتفاق کہ اس دن میری جیب میں پانچ روپے تھے۔ میں انہیں شمشاد بلڈنگ لے گیا اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ اس زمانے میں ۸؍آنے میں بہترین کھانا شمشاد بلڈنگ میں میسر آجاتا تھا۔ حفیظ میاں کے ذاتی حالات کو سن کر اپنے حالات پر رشک آنے لگا۔ وہ شہر میں رہتے تھے اور ایف اے کے فائنل ایر میں تھے۔ میں نے انہیں دعوت دے دی کہ وہ میرے ساتھ دونوں وقت شریک طعام ہو جائیں۔ لیکن حفیظ میاں ایک ہی وقت میرے ساتھ کھانا کھا سکتے تھے۔ رات میں شہر سے آنا مشکل تھا۔

میرے لیے کھانے کی دشواری نہ تھی۔ علی گڑھ کی روایت کے مطابق میں جس کمرہ میں بھی داخل ہوتا کھانا مل جاتا تھا۔ مل بیٹھ کر کھانا پینا کپڑے اور جیب شیر کرنا، علی گڑھ کی مقدس روایات تھی۔ حفیظ میاں نے انٹر پاس کر کے ہمت ہار دی اور نوکری کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک دن میرے پاس آکر کہا۔ میڈیکل ڈسپنسری میں لیب اسسٹنٹ کی جگہ پر آپ میری سفارش کر دیں۔ ہندوستان میں کوئی کام بغیر سفارش نہیں ہوتا۔ ہاں! مگر میں کیا میری سفارش کیا؟ میں ان کو لے کر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوا اور حسن اتفاق سے انہیں ملازمت مل گئی جس نے ان کے فیملی کے بنیادی مسائل کو حل کر دیا۔ لیکن تعلیم ختم ہو گئی۔

دلّی انٹرنیشنل نمائش اور کرخنداری میزبانی:

دسمبر ۱۹۵۹ میں غالباً ایک ہفتہ کی چھٹی تھی۔ جب کچھ دوستوں نے طے کیا کہ دہلی چل کر انٹرنیشنل انڈسٹریل نمائش دیکھی جائے۔ اس نمائش میں ساری دنیا کے ممالک نے شرکت کی تھی پہلی بار امریکہ اور سویت یونین نے ٹیلی ویژن کا ہندوستان میں تعارف کرایا تھا۔ جیبوں کو ٹٹولا تو مشکل سے ٹکٹ کا خرچہ پورا ہوتا تھا۔ شوق نمائش نے سردی اور بے سروسامانی کو نظر انداز کرتے ہوئے رخت سفر باندھ لیا۔ خوش قسمتی سے ہم سب کے دوست شاہ عبد القیوم (دہلوی) دہلی اپنے گھر پہونچ چکے تھے۔ ہم لوگوں میں ہمارے علاوہ آصف

علی، نیر قدر، ایوب سید، ظفر امام عرفان اللہ خان تھے۔

دہلی پہونچ کر جامع مسجد کی گلی گڑھیا میں پہونچ کر شاہ صاحب کا دروازہ کھٹکھٹادیا۔انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ پرنس نیر قدر نے کہا: ''برخوردار! ان معزز مہمانوں کو سردی اور بھوک دونوں لگ رہی ہے اس لیے فوری رہائش اور طعام کا انتظام کرو۔'' شاہ صاحب سکتے میں آگئے۔ پھر بیدار ہوکر معذرت کرنے لگے کہ ایسے اچانک آمد کا اس قدر جلدی کیسے انتظام ہوسکتا ہے؟ مگر مرتا کیا نہ کرتا وہ ہمیں لے کر اپنے برادر بزرگ کی دکان پر جو بلی ماران گلی ہڈی والی میں واقع تھی پہونچ گئے۔ان کے بھائی نے بہت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔کھانا بازار سے منگا کر کھلایا پھر معلوم کیا قیام گاہ کہاں ہے۔ایوب سید نے کہا آپ کے گھر یا دکان پر۔ وہ علیگیرین تو نہ تھے لیکن یا تو وہ بہت شریف آدمی تھے یا علیگیرینس کو بھگت چکے تھے۔انہوں نے قہقہہ لگا کر فرمایا: ''یہ ہوئی علی گڑھ والی بات فوراً محلے کے گھروں سے لحاف کمبل جمع کر کے فرش خاکی پر ایک بوسیدہ قالین کو روئی کے گدے سے مدبز کر کے رہائش کا انتظام کردیا۔صبح پوری ترکاری کا ناشتہ کرا کے دلی گردی کے لیے رخصت کردیا۔تین دن یہی معمول رہا۔

خوب انڈسٹریل نمائش گھومے، جامع مسجد کی حلیم شریف اور بریانی، جس سے ایک آنہ فی کس میں پیٹ بھر جاتا تھا، کھا کر گزر کرلیا۔ایک شام حلیم سے فارغ ہوکر چائے پینے کی ٹھانی تو نیو جواہر ہوٹل پہونچ گئے۔ یہ بھول گئے ہم علی گڑھ کی شمشاد بلڈنگ میں نہیں ہیں دلی کی جامع مسجد کے علاقے کے کرخنداروں کے علاقے میں ہیں۔ایوب سید نے بڑی شان سے چائے کا آرڈر دیا۔ بیرے نے پوچھا اور کیا چاہیے؟ ایوب سید نے تمکنت سے کہا ''جو آرڈر ہم دے رہے ہیں پہلے وہ لاؤ'' دراصل جو پہلا آرڈر تھا وہی آخری آرڈر بھی تھا۔

بیرا پیر پٹختا ہوا مڑ مڑ کر ہمیں دیکھتا ہوا چلا گیا۔ چائے پیش کر کے بیرے نے چپکے

سے کہا کہ ابھی کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور کسٹمر آنے والے ہیں جلدی کیجئے۔ پرنس نے شاہانہ انداز سے اس کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا: ''کیا ہم کسٹمر نہیں؟ جاؤ اپنا کام کرو!۔''

چائے پر علی گڑھ کے چٹکلے شروع ہوئے اور قہقہوں سے ہوٹل ہلنے لگا۔ کسٹمر واقعی آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک بار قہقہہ ذرا زیادہ ہی بالجہر ہو گیا کہ جامع مسجد کے میناروں تک آواز پہونچ گئی۔ تب آکر بیرے نے پھر مودبانہ کہا کہ: ''یہاں قہقہہ لگانا اور سیاسی گفتگو کرنا منع ہے اپنے سامنے لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہے ہوئے کو لکھا ہوا دکھا کر مستند کر دیا۔ ایوب سید نے اسے دھتکارتے ہوئے کہا: ''کبھی تم نے کسی اچھے ہوٹل میں کام کیا ہے؟'' ایوب کا اشارہ ان ہوٹلوں کی طرف تھا جن میں ہم دونوں نے چین کے سفر میں قیام کیا تھا۔

وہ اپنی عزت گنوا کر رخصت ہو گیا تو منیجر صاحب آ گئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ فرماتے ایوب اور پرنس نے بیرے کی بدتمیزی کی مزمت کرتے ہوئے بہت لمبا اور جذباتی اسٹیٹمنٹ دے دیا۔ منیجر صاحب نے سن کر فرمایا: ''بیرے نے جو کچھ کہا ہے وہ ہوٹل ہذا کی پالیسی ہے جو ہم نے تعلیم یافتہ اصحاب کے لیے تحریر کروا کر ٹانگ دی ہے۔'' انہوں نے اس کی طرف اس طرح اشارہ اس طرح کیا کہ جیسے کہتے ہوں تم جاہلوں کو کیسے پڑھواؤں! پھر اسے محلہ جامع مسجد کی زبان میں کہا: ''اب آپ جلدی سے چائے پی کر کے پھوٹ لیں۔'' اس کی بے ہودہ زبان نے ایوب سید کے جذبۂ خودداری کو مہمیز لگا دی۔ ان کے چچا سعید احمد صاحب ممبر پارلیمنٹ تھے۔ انہوں نے منیجر کو صاف بتلا دیا کہ ہم چین میں فائی اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں ہم نے پارلیمنٹ ہاؤس کے کیفے ٹیریا میں چائے پی ہے، وہاں کسی نے بھی ایسی بدتمیزی نہیں کی۔

ابھی گفتگو جاری تھی تو ایک بہت زیادہ صحت مند شخص ململ کے کرتے اور نیلی تہبند باندھے ہاتھ میں لال رومال لیے تشریف لائے اور پوچھا: ''کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے

جواب میں پرنس اور ایوب نے دھواں دھار تقریر کردی اور پرنس نے مٹیا برج اور کلکتہ کے ہوٹلوں کے حوالے سے اور ایوب سید نے چین اور ہانگ کانگ کے واسطوں سے واضح کردیا کہ ہم ایسے ویسے نہیں جیسے ویسے تم سمجھ رہے ہو۔ابھی گفتگو جاری تھی تو ایک اُن سے بھی زیادہ صحتمند اور چکن کا جھلمل کرتا زیب تن کیے، پاجامہ کھلے پائچوں کا اور اس میں سے سبز رنگ کا کمر بند کرتہ کے پیچھے رِم جھم کرتا ہوا اور کرتے کے پلو سے نیچے اس کا پھندنا لہراتا ہوا اس نے آکر کرخنداری زبان میں جو بات کی تو ہم سب کو طیش آ گیا۔اب علی گڑھ کی عزت کا معاملہ تھا۔

میں اور شاہ عبدالقیوم اس میدان کارزار کے دفاعی دستوں میں تھے یعنی سب سے پیچھے تھے۔اس درمیان میں ہم دونوں کو چند بزرگوں نے سڑک پر اشارے سے بلایا اور فرمایا۔ یہ دوموٹے تازے لوگ اس ہوٹل کے مالک ہیں ابھی قتل کے مقدمے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔قریشی برادری سے تعلق ہے۔چھرّے بازی میں مشہور ہیں۔''میاں! اپنی عزت کی پرواہ نہ کرو بس اپنی جان بچاؤ اور بھاگو۔اللہ خیر کرے۔''

باہر بھیڑ لگ چکی تھی۔ بڑے میاں کی وارننگ کی داد سب نے اس طرح دی جیسے ہم مرحومین میں داخل ہو چکے ہوں۔ہم نے یہ پیغام اندر پہونچ کر بزبان انگریزی ہراول دستہ تک پہونچایا۔اس وقت ایوب سید نے غصہ سے میز پر مکہ مار کے کہہ دیا تھا:''تم نے کیا سمجھا ہے ہم تمہارے ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔''اور دونوں صحت مند لوگوں نے صمیم قلب سے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے فرمایا:''تو ہاتھ لگا کے دیکھ تو باہر ہوگا تیرا ہاتھ اندر ہوگا۔''عین اس نازک لمحہ میں پرنس کو ہمارا پیغام مل گیا اور انہوں نے کمالِ فراست سے یونین کے تجربات کو بروقت استعمال کرتے ہوئے فرمایا:''پوائنٹ آف آرڈر! آپ جیسی گفتگو کررہے ہیں یہ غیر پارلیمنٹری ہے ہم اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔اس لیے ہم اور ہمارے ساتھی واک آؤٹ کررہے ہیں۔''سب موقع کی نزاکت کو سمجھ چکے تھے اس لیے

انہوں نے پرنس کے پوائنٹ آف آرڈر کو امداد غیبی سمجھتے ہوئے واک آؤٹ کردیا۔ پیچھے سے آواز آئی: ''پیسے تو دیتے جاؤ نواب زادو!'' پرنس نے مڑ کر پانچ روپیہ کا نوٹ میز پر پٹخ دیا اور فرمایا: ''چینج بھی تم رکھ لو۔'' انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی شاہی فیاضی کی تاریخ کو دہرا دیا۔ ہم تیزی سے نکلے اور ہمیں کہنے کے لیے بہت سی کرخنداری گالیاں خدا حافظ کہنے کے لیے دروازے تک آئیں۔

ہم ہوٹل سے باہر واپس آئے تو وہاں مجمع نے اعلان شکر کیا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ''یہ سب علی گڑھ کی شیروانی کی برکت تھی ورنہ یہاں۔

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں'' والا معاملہ پیش تھا۔ ہم مجمع سے مبارکباد بھی وصول کر رہے تھے اور نصیحتیں بھی قبول کر رہے تھے۔ سب سے بڑی نصیحت یہ تھی ہم فوراً علی گڑھ روانہ ہو جائیں۔ اگر نہ جا سکیں تو اس محلے سے نکل جائیں اور واپس نہ آئیں۔ ہم لوگ سرپٹ ہڈی والی گلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور بار بار پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے رہے۔ غرض

دھمکی میں مر گیا کہ جو باب نبرد تھا
عشق نبرد ہمیشہ طلب گار مرد تھا

ہم نے نمائش میں جو کچھ دیکھا وہ اس دور میں نیا تھا۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن سویت یونین اور امریکہ نے اپنے پویلین کے باہر مانیٹر لگوا رکھے تھے۔ فرق یہ تھا کہ امریکن اسکرین پر مہمان آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور سویت پویلین نے کیمرہ نصب کر دیا تھا۔ جب آپ پویلین میں گھس کر کیمرہ کے سامنے سے گذرتے تو اپنی تصویر مانیٹر پر نظر آتی۔ یہ منظر بہت مختصر تھا اس لیے جو اپنے منظر نامے سے متاثر ہو کر پھر سے دیکھنا چاہتے تھے وہ پھر لائن میں لگ جاتے۔ امریکن تماشہ دیکھنے والے چند لوگ ہوتے اور سویت یونین کے ٹی وی نے ع تماشہ خود نہ بن جانا تماشا دیکھنے والے، مصرع کو متحرک کر دیا

تھا اور وہاں خود نمائی خود بینی بن گئی تھی اور بقول جگر ؎ یہ خوشی گاہ گاہ ہوتی ہے۔ سو ہم لوگ بھی چند بار اس بالی وڈ کے تجربے سے گذرے۔ فرق یہ تھا کامریڈس ایوب سید اور ظفر امام نے طواف کی نیت کر رکھی تھی اور یہ کام کار ثواب سمجھ کر کیا اور باقی لوگوں نے سستی اور مفت شہرت کی خاطر بالی وڈ کے ہیرو بن کر خود نمائی کی۔ دونوں سُپر پاورس کے ٹی وی شوز میں سرمایا داری اور سوشلزم کا فرق واضح تھا۔

امریکن ایڈ اور سینے کے داغ:

تعلیمی سال کے خاتمے سے چند ماہ پیشتر امریکہ کی ایک خصوصی توجہ سے ہم مستفید ہوئے۔ یونیورسٹی میں ایک ٹرک کی لیب میں ایکسرے مشین کے ذریعے تمام طلباء کا ایکسرے ہونا تھا۔ میڈیکل آفیسر صاحب نے اس تقریب سعید کے لیے ہمارا خصوصی انتخاب کیا اس وقت تک کسی نے ہمارے سینے کے زخموں کو نہیں دیکھا تھا۔ چند منٹ ایکسرے کے مرحلے میں لگے لیکن یہ امریکن سازش تھی یا حفیظ الرحمٰن صاحب کی مصلحت یا ذاکر صاحب کی شفقت ایکسرے نے دائیں پھیپڑے کے ایک سفید داغ کو واضح کر دیا۔ حفیظ الرحمٰن صاحب نے بلا کر فرمایا: ''تمہارے ایکسرے میں دائیں پھیپڑے پر جو داغ ہے وہ مجھے اور ذاکر صاحب دونوں کو متفکر کر رہا ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو ذاکر صاحب سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا اس داغ کی تحقیق ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ داغ ہمیں داغ دے جائے۔''

میں نے پوچھا: آپ کا یا ذاکر صاحب کا کیا مشورہ ہے؟''

حفیظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا: ''مدراس کے ایک پر فضا شہر تا مبرم میں ایک سینی ٹوریم ہے۔ اس میں ورلڈ یونیورسٹی کی طرف سے طلباء کا خصوصی وارڈ ہے۔ ذاکر صاحب جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، ورلڈ یونیورسٹی سروس کے چیرمین ہیں۔ وہ چاہتے ہیں تم وہاں جا کر اپنا چیک اپ کرالو۔ تمام انتظام وہ خود کریں گے۔''

حفیظ صاحب کی تشخیص اور پیشکش سے مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ٹی بی کے معاملے میں مجھے تیقن تھا کہ مجھے نہیں ہے اور سینی ٹوریم اور پرفضا ماحول کو سوچ کر چین کی تازہ ترین یادیں ایک دم دل ودماغ پر چھا گئیں۔چین کے سفر میں ہم نے چین کے شہر ہانگ چاؤ کے سینی ٹوریم میں جو کچھ دیکھا وہ دنیا میں جنت کا نمونہ لگتا تھا۔ارضِ کشمیر کی طرح ہانگ چاؤ شہر کو اہل چین جنت ارضی کہتے تھے یعنی:

اگر فردوس برروئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

ہانگ چاؤ شہر کے غیر معمولی پر بہار حصے میں پہاڑیوں کے دامن اور پانی کے کنارے وہ سینی ٹوریم تھا جو صحت مندوں کو بھی بیمار ہوکر آنے کی دعوت دیتا تھا۔وہاں کا بیمار بھی صحت مندوں کے لیے قابل رشک تھا۔اس سینی ٹوریم میں انڈور اور آؤٹ ڈور کھیل کی سہولتیں تھی۔مختلف میوزیکل انسٹرومنٹ پر لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی دھن بجارہے تھے۔کچھ لڑکے لڑکیاں بورڈ گیم کھیلنے میں مشغول تھے۔بڑی شاندار لائبریری بہتر فرنیچر اور خاموشی سے استفادہ کرنے والے نوجوان۔جب ہم لائبریری میں داخل ہوئے تو معمولی ہلچل ہوئی پھر سب کتاب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ایک چینی لڑکی جو کتاب میں ایسی محو تھی کہ اس نے سر اٹھا کر بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔کلکتہ یونیورسٹی کے زندہ دل اور شریک طالب علم شنکر سے نہ رہا گیا اس نے نی ہاؤ (ہیلو) قریب جا کر کہا اس نے سر اٹھایا تو ایسا لگا کہ اسے کوہِ قاف سے کوئی جن ابھی اٹھا کر لایا ہے۔اس نے سر اٹھایا، مسکرائی، پھر ہاتھ سے سب کو خوش آمدید کا اشارہ کیا اور اپنے مطالعہ میں مصروف ہوگئی۔وہ منظر نگاہوں میں پھر گیا اور مجاز کے اس شعر کی یاد تازہ ہوگئی۔

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤگے بیمار ہوکر

مجھے حفیظ صاحب نے خوابوں کی دنیا سے پھر حقیقت کی دنیا میں آنے کے لیے آواز دی۔

''تو اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟''

''جو آپ اور ذاکر صاحب طے کریں۔ میں قبول کرلوں گا۔''

''تو میں ذاکر صاحب سے بتلادوں گا کیا آپ چیک اپ کو جانے کے لیے تیار ہیں۔''

''بہتر ضرور'' میں پھر چین کی یادوں میں گم ہوگیا۔

''مگر اس میں وقت لگے گا۔ ایسی جلدی بھی نہیں آپ امتحان سے فارغ ہوجائیں۔''

''بہت بہتر۔ میں بھی چاہتا ہوں میں امتحان دے دوں۔''

حفیظ صاحب سے ہمارے تعلقات میں کشیدگی رہتی تھی۔ دراصل یونین کی سیاست میں یونیورسٹی کلینک اور ڈائننگ روم کا کھانے پر تنقید بہت اہم تھی۔ اس سال ایم اے اردو کے ہونہار طالب علم شکیل صاحب کا انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد ان کے والد بہار سے علی گڑھ پہونچے۔ ہم نے ان کا بے قرار ہونا اور تڑپنا دیکھا تھا۔ مچھلی بھی زمین پر آکر اتنے بل نہیں کھاتی جس قدر ان کے والد اور بھائی کھا رہے تھے۔ ہم نے یونین میں شکیل صاحب کا تعزیتی جلسہ کرکے میڈیکل سہولت، ڈاکٹر حضرات اور حفیظ صاحب پر خوب تنقید کی تھی۔

اس جلسے میں ذاکر صاحب بھی تھے جنہوں نے اپنی تقریر میں میری دلآویز تقریر کے بعد فرمایا: ''میں ڈاکٹروں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ مریضوں کو یونین کے عہدیداروں کے مشورے سے دوا دیا کریں۔'' پھر انہوں نے قضا و قدر کے مسئلہ سے اس بات کو ہمیں اور ان کے والد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے بہت سے واقعات جمع تھے جس میں ہم یونین کے پلیٹ فارم سے میڈیکل کے شعبے کی شکایات کرتے تھے۔ میں یہ سمجھنے میں شاید حق بجانب تھا کہ حفیظ صاحب ہمیں علی گڑھ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اس وقت لیکن ہم نے خوش دلی سے ان کے مشورہ کو قبول کرلیا۔ اور سر میں چین کے سینی ٹوریم کا نقشہ لئے ہوئے ہم رخصت ہوئے۔

ہم سے اس گفتگو کے بعد حفیظ صاحب نے اور کرم فرمایا: ''ہمارے پاس امریکہ کی جانب سے تحفہ میں دودھ اور گھی کے ڈبے آئے ہیں میں چاہتا ہوں آپ ان کو لے کر استعمال کریں۔'' میں نے حلوائی کے دکان پر نانا جی کی فاتحہ کے اکسیر والے نسخہ کو قبول کرلیا۔ ہم پی ایل فورایٹی (PL80) کے تحت امریکن اناج پہلے سے کھارہے تھے۔ گھی اور دودھ کے پاؤڈر کے ڈبوں نے اس کے ذائقوں کی دوبالا کردیا۔ ہمارے فری کھانے میں دو وقت کا کھانا تھا اب اس میں گھی اور دودھ کا اضافہ ہوگیا۔ ہمارے لیے صبح کا ناشتہ اور شام کی چائے حاصل کرنا علی گڑھ کے قیام میں عقدہ مشکل تھا۔ دودھ نے چائے کے اہم جزو کو مہیا کردیا دودھ اور شکر کا مسئلہ تھا سو ہم نے مفت چائے خوری کرنے والوں سے کہا اپنی چائے اور شکر لاؤ خود بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔ ہم نے سوچا تھا ہماری ڈائننگ روم کی بے سواد دال میں خالص جلوہ نمائی کر کے اسے حلق سے اترنے کے لائق بنادے گا۔

ہمیں یاد آیا کہ کیسے ہمارے نانا جان (سید شاہ محمد میاں) نے ہمارے لیے بچپن میں گائے پالی تھی جس کا دودھ مکھن اور گھی کا وافر حصہ ہماری صحت پر خرچ ہوتا تھا مگر ہمارا حال تھا: ؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ہر چند ہمارے کھانے میں کھچڑی مکھن اور گھی کی چار چاند لگتے تب بھی ہمارے معدے کی ناقدری سے ہماری صحت کمزور تر ہو رہی تھی۔ اب گھی کے ٹین کو کھول کر جو سونگھا تو اس میں تلوں کے تیل کی سی خوشبو آئی۔ یہ سوچا کہ یہ گھی امریکن ہے اور اصلی ہے ہم نے اس کا استعمال صحت مندی کے لیے جاری رکھا لیکن ہماری صحت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔

شب میں کمرے کی یکسوئی میں بیٹھ کر سوچا اور اس زندگی کے سفر کی یاد کی جب ڈھائی سال کی عمر میں والدہ داغ مفارقت دے گئیں تھیں پھر ابا جان کی دوسری شادی نانے ابا کی والہانہ محبت پھر ان کی دوسری شادی، پھوپی جان انقلابی باپ کی بیٹی چھ سال کی عمر میں اپنے شفیق باپ کے سائے سے محروم ہوگئیں۔ اور ۱۹۳۵ء کے کوئٹہ کے زلزلہ میں اپنے

پیارے شوہر جمیل صاحب سے محروم ہو گئیں۔ میرا اپنا بے تکا بے ڈھنگا تعلیمی سفر، گھر گھر کی روٹی در در کی ٹھوکریں پھر علی گڑھ کا آغوشِ رحمت اور اب ٹی بی اور زندگی کا نیا رخ۔ آہستہ آہستہ دل کو سکون آتا چلا گیا۔ سینی ٹوریم کے قیام و آرام کا تصور اس قدر خوش آئند تھا کہ میں تامبرم کے پُر فضا ماحول میں ایک کشادہ لائبریری میں چینی گڑیا کے روبرو نگاہوں کی کتاب پر نظر جمائے خود کو مطالعہ میں غرق محسوس کرتا تھا۔ اب اضطراب اشتیاق میں بدل رہا تھا اور اس کا سبب علی گڑھ کے ماحول سے میری بے اطمینانی تھی۔ اس وقت یہ وہم وگمان کہاں تھا کہ علی گڑھ کی بدولت آٹھ سال بعد لائبریری سے اٹھ کر وہ گڑیا ہمارے ظلمت کدے کو روشن کرے گی۔ لیکن وہ سینی ٹوریم کا نہیں علی گڑھ کا ثمرہ ہے۔

دراصل سیکریٹری شپ کے بعد صدارتی انتخاب میرے اپنے ذاتی فیصلے کی بنیاد پر نہیں تھا۔ میں سیکریٹری شپ سے فارغ ہو کر کچھ دن آرام اور مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے میرا اس طرح مکمل ایس ایف کے ساتھ الیکشن کے نتیجہ میں وابستہ ہو جانا میرے احوال، مزاج اور نصب العین کے خلاف تھا۔ میں نہ کمیونسٹ تھا نہ فیلوٹریولر۔ داس کیپٹل کے بنیادی نکات کو میں کامریڈ ماجد (اکنامسٹ) سے پڑھ کر مسترد کر چکا تھا۔

میں بنیادی طور پر مسلم نیشنلسٹ تھا اور سمجھتا تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے پورے مواقع ہیں بشرطیکہ وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو ان کا اہل بنائیں۔

میرے دادا انقلابی ہی نہیں تھے بلکہ مفکر بھی تھے۔ ان کی فکری اساس قرآن وسنت تھی انہوں نے ''حکومت الہیہ'' ''انواع الدول'' اور ''بیعت نابیعت'' کتابچے تحریر فرمائے۔ والد صاحب نے چار سو صفحات پر مشتمل کتاب ''اسلام کا نظامِ حکومت'' لکھی۔ میں بھی اپنے بزرگوں کی طرح اس تضاد کا شکار تھا کہ فکر اسلامی ہے اور تحریک سیکولر

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں باختن

میرے اسلام سے کمیونسٹوں کو سروکار تھا نہ مسلم لیگ ذہن والے لوگوں کو میرا اسلام قبول تھا۔ان کے پاس جذبات کی فراوانی تھی لیکن فکر کی پختگی نہ تھی۔کمیونسٹوں کے پاس سوشلزم اور سکیولرازم پر یقین تھا لیکن امت مسلمہ کے مسائل سے دلچسپی تھی نہ کانگریسی حکومت سے۔میرے ان کے تعاون کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔میں اب اس سیاست کے دنگل سے ہٹ کر خود کو ڈھونڈنا چاہتا تھا اور سینی ٹوریم سے بہتر کوئی جگہ ایسے مفکرانہ کام کے لیے ہوسکتی ہے؟۔

امتحان کی تیاری اور کامیابی:

میں نے اب یکسوئی سے بی اے فائنل کے امتحانات کی تیاری کی ظفر امام، حامد انصاری، شہزاد سے مدد لی اور یونین سے کچھ یکسوئی اختیار کی۔پولیٹکل سائنس کے سمینار (لائبریری) میں بھی کچھ شامیں گزارنے لگا۔ایک شام میں چٹرجی، بنرجی ٹائپ نوٹس نکال کر پڑھ رہا تھا کہ شیخ رشید صاحب صدرِ شعبۂ تاریخ تشریف لے آئے اور میرے برابر آ کر بیٹھ گئے پھر سوال کر دیا کہ کیا مطالعہ کر رہے ہو۔اب ان کو کیسے بتاتا کہ شارٹ کٹ لگا کر امتحان پاس کرنے کا ڈول ڈال رہا ہوں۔میں نے مودبانہ بتایا کہ ورلڈ کانسٹی ٹیوشن کے پرچے کی تیاری کر رہا ہوں۔میں نے ان کی نظروں سے امتحان فاسٹ ٹریک والے نوٹوں کو چھپانا چاہا، انہوں نے دیکھ تو لیا لیکن انجان بن گئے اور پھر میری رہنمائی شروع کر دی۔خود اٹھ کر منرو اور لنکیز کی اس کتابوں کو الماری سے نکال کر لے آئے اور بتانا شروع کر دیا کہ کون سی کتاب میں کس موضوع پر کون سا باب ہے جو پڑھنا چاہیے۔میں شرمندہ حیران پریشان ہونق بنا ان سے استفادہ تو کیا کرتا شرم سے چور چور ہو رہا تھا۔پھر اٹھ کر جانے لگے تو جاتے جاتے کہہ دیا کہ جب بھی ضرورت ہو تو ڈیپارٹمنٹ میں مل لینا یا گھر آ جانا۔

یہ تھے شیخ رشید صاحب صدرِ شعبۂ تاریخ جو ہمیں پولیٹکل سائنس ورلڈ کانسٹیچوشن کا سبق پڑھا گئے۔ہم لوگ اپنے اساتذہ کا احترام بھی کرتے تھے اور خوف بھی کھاتے تھے۔یہ

محض خانہ پری نہیں تھیں دلی جذبات تھے اوران اساتذہ کا علمی تبحر تھا۔ یہ بات تو یہاں ختم ہوگئی لیکن شیخ رشید سے ایک تعلق کی بنیاد ڈال گئی۔ میں مئی ۱۹۵۸ء میں پہلی بار پاکستان گیا تو لاہور میں رک کران سے ملاقات کے لیے پنجاب یونیورسٹی پہونچا اوران کے سبق میں بیٹھ گیا۔انہوں نے دیکھا مسکرائے اورانہوں نے سبق جاری رکھا۔سبق ختم ہونے کے بعد ملاقات کی تو فرمایا:''تم نظر نہیں آتے کلاسیں بہت مس کررہے ہو۔''میں نے عرض کیا کہ کلاس تو آپ کے علی گڑھ میں بھی میں نے اٹینڈ نہیں کیے۔'' تب سنبھلے اور فرمایا اوخوہ تم تو عابداللہ غازی ہو پھر گھر بلایا اور فرمایا:''تم اپنے دادا محمد میاں منصور انصاری کی زندگی اور تحریک پر کام کرو۔وہ تاریخ کا اہم اور گمنام ورق ہے۔ مجھے ان کی نصیحت کے بعد تحریک شیخ الہند میں دلچسپی پیدا ہوئی۔تعلیم اور شادی کے بعد ۱۹۶۳ میں میں لندن تعلیم کے لیے چلا گیا پھر شیخ رشید صاحب جب بھی لندن تشریف لاتے تھے اوراپنے شاگرد زیدی صاحب کے یہاں ٹھہرتے تھے اور مجھے پہونچتے ہی بلوالیتے تھے۔میں بھی اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان کی خدمت میں گزارتا۔سو یہ تھا علی گڑھ کا کردار اور رشتہ۔

امتحان آیا تو باقی پرچے تو آسانی سے گذرجاتے لیکن دینیات کے پرچے کو کرنے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آگیا۔ ہمارے زمانے میں راجستھان کے قطب علی ڈسکس تھرو یوپی کے چیمپین تھے وہ دینیات کے پرچے میں میرے برابر کے ڈیسک پر بیٹھے تھے۔سوال تھا:''غزوہ بدر پراپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟وہ نہ غزوہ کے معنی جانتے تھے نہ میدان بدر سے واقف تھے۔مجھ سے پوچھا:''غازی غزوہ کیا ہوتا ہے؟''ایسے موقع پر ممتحن بھی پیٹھ موڑ کر کنڈیڈیٹ کو سہولت فراہم کردیتا تھا۔میں نے جوابا کہا:''جنگ۔''انہوں نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا اور مستعدی سے لکھنا شروع کردیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اگزامنر کی پیٹھ مڑی تو پوچھا:''جیت اپنی تھی نا؟''میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔انہوں نے انگلی کے اشارے سے فتحمندی کا اعلان کیا اس طرح چند سوالوں کے جواب وہ مجھ سے

حاصل کرتے رہے۔

امتحان ختم ہوا تو انہوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ امتحان زبردست ہوئے۔اب میں نے پوچھا کہ: ''تم نے کیا لکھا؟'' فرمایا: ''غزوۂ بدر ہندوؤں اور مسلمانوں کی وہ جنگ ہے جو پانی پت کے میدان میں لڑی گئی۔'' پھر انہوں نے مسلمان مجاہدین کے نقشے بقول ان کے ماہنامہ ''دین دنیا'' کے ٹائٹل پیج سے مستعار لئے تھے۔یعنی گھوڑے پر تلوار پر کشتوں کے پشتے لگانے والا مجاہد۔انہوں نے حضرت فاطمہؓ کے جہیز کے جواب میں سر سے پا تک ہر زیور کا نام لکھ دیا تھا۔میں نے ان سے پوچھا: ''تمہیں یہ تفصیلات کہاں سے ملیں؟'' تو فرمایا: '' میری اماں ہمیشہ اپنے جہیز کا ذکر کرتی تھیں۔میں نے سوچا یہی سنتِ نبوی ہوگی۔'' ناپاک کنویں کی صفائی میں انہوں نے پچاس ڈول سے شروع کیا اور اگر چوہا گر کر مر جائے تو ایسی صورت میں انہوں نے دوسرا کنواں کھدوانے کا مشورہ دیا تھا۔رزلٹ آنے کے بعد انہوں نے اپنے شکریے کے خط میں دینیات کے مضمون میں پاس ہونے کی اطلاع دی تھی۔

علیگڑھ۔ چھٹا سال
جولائی ۱۹۵۵ء۔ جون ۱۹۵۶ء
تعطیلات موسم گرما اور تامبرم سینی ٹوریم

بمبئی آمد:

امتحان کے بعد میں نے بمبئی کے لئے رخت سفر باندھا۔ وہاں ٹھہر کر مجھے تامبرم سینی ٹوریم کے داخلے کے خط کا انتظار کرنا تھا۔ اس بار میں یہ مصمم ارادہ کر کے جا رہا تھا کہ بمبئی جا کر نوکری کروں گا اور گھر کے مالی اور عزیزان سلمہم کے تعلیمی مسائل کو حل کروں گا۔ میں مزید تعلیم کے خیال کو دل سے نکال چکا تھا اور تامبرم سینی ٹوریم سے چیک اپ کے بعد واپسی علی گڑھ نہیں بمبئی ہونی تھی۔

میں والد صاحب کو اپنے ارادوں سے باخبر کر چکا تھا۔ اسی بلڈنگ کے تیسری منزل پر میری کزن صفیہ بیگم اور ان کے شوہر مجیب الحق اپنے بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کا گھر میری پناہ گاہ بن گیا۔ ان کے گھر سے متصل ہی ایک بہت چھوٹا سا کمرہ تھا، انہوں نے اس میں اپنے کام کے لیے مشینیں لگا رکھی تھیں۔ وہ پلاسٹک کے شیٹ کو کاٹ کر پتلون کے لیے بیلٹ بناتے تھے۔ اس کام میں کیمکل کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ دن میں یہ کمرہ مجیب بھائی کی ورکشاپ تھا رات میں پلاسٹک کے تھان اور کیمکل کے ڈبوں کے درمیان مشینوں کے جلو میں میری استراحت گاہ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اتنے تامبرم سے خبر آئے میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرلوں۔ یوں بھی ملازمت ملنا ممکن نہ تھا اور ابا جان بھی تعاون کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ ابا جان کا جمہوریت روزنامے سے اب سکڑ کر ویکلی ہو گیا تھا۔ اس کی اشاعت بھی بس یونہی سی تھی۔۔ چند اشتہار اسے زندہ رکھ رہے تھے، وہ بھی ابا جان کی مروت میں مل جاتے تھے۔ طارق میاں جن کی عمر اس وقت ۱۴-۱۵ سال تھی وہ بھی ابا جان کے ساتھ تعلیم کے ساتھ اخبار کی ادارت اور انتظامیہ میں لگے ہوئے تھے۔ یہی مختصر سا

دو چھوٹے چھوٹے کمروں کا گھر ہفت روزہ جمہوریت کا دفتر تھا۔ درمیان میں پردہ ڈال کر کاتب کتابت کرتے، دوسری طرف امی گھرستی چلاتیں۔ یہیں کاغذ کا اسٹاک رکھا جاتا۔ یہیں سے اخبار میل ہوتا۔ یہیں سے اس کا مینجمنٹ تھا۔

حکیم مرزا حیدر بیگ اور جگر مرادآبادی:

اس میں شک نہیں کہ یہ امی کا سلیقہ تھا جس نے اس کمرہ نما کو صاف ستھرا گھر بنا رکھا تھا۔ زیادہ وقت تو میرا مجیب بھائی کے گھر اور ان کی ورکشاپ میں گذرتا اور کچھ تھوڑی بہت جمہوریت کے کام میں مدد کرتا۔ باقی وقت فرید انجم سلمانی بجنوری کے حجامت خانے، شمس کنول (بجنوری) سے ملاقاتوں اور نفیس بجنوری کی صحبتوں میں گزرتا۔ ایک خاص بیٹھک حکیم مرزا حیدر بیگ کا مطب (نزد کرافورڈ مارکیٹ) تھا۔ انہوں نے میرا معالجہ شروع کر دیا تھا۔ ابا جان نے ان سے ملاقات کر کے نبض دکھائی۔ انہوں نے فرمایا: اسے ٹی بی ہر گز نہیں لیکن جن امراض کی تشخیص انہوں نے کی تھی اس کا علاج مفت شروع کر دیا۔ ان کے مطب نے بھی سیر کے واسطے تھوڑی سے فضا کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

حکیم صاحب نسلاً مغل تو تھے ہی مگر وہ مغل اعظم تھے۔ رنگ گورا چٹا، قد میانہ، غصہ ناک پر۔ ذرا ذرا بات پر ان کا سفید رنگ سرخ ہو جاتا تھا۔ ایک بار ابا جان پر بگڑ گئے۔ انہوں نے مصورِ غم راشد الخیری کا کوئی مضمون آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے لڑکوں کی شہادت کے بارے میں شائع کر دیا تھا۔ جس میں ۱۸۵۷ کے دل گداز خونی واقعات کا ذکر تھا۔ مضمون میں مغل بادشاہ کے آنسو اور ان کی خواتین کا بین ڈرامائی انداز میں تحریر تھا۔ مرزا صاحب کو اس میں مغلوں کی توہین نظر آئی کہ ایسے بڑے صدمے پر بھی ان کی آنکھوں میں آنسو کیسے آسکتے ہیں۔ اصل ڈانٹ مجھ پر پڑی۔ مگر اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا ان کا غصہ بھی ان کی محبت کا حصہ تھا۔ جس دن زیادہ ڈانٹ پڑتی اس دن خمیرہ اور مربہ بھی دل کی تقویت کے لیے ملتا۔ ان کے ہاں اکثر شعراء اور ادیب شکیل بدایونی، کمال امروہوی جگر مرادآبادی

وغیرہ تشریف لاتے اور حکیم صاحب خمیروں اور کشتوں سے ان کی خاطر تواضع کرتے۔

اتفاق سے جگر صاحب ان ہی دنوں میں تشریف لے آئے۔ قیام ہمیشہ کی طرح حکیم صاحب کے پاس تھا۔ جگر صاحب سے میری پہلی ملاقات جس طرح ہوئی وہ واقعہ میں بجنور کے قیام کے ذکر میں لکھ چکا ہوں۔ اس دفعہ جگر صاحب کے ساتھ چند روزہ تعلق زندگی کا حاصل تھا۔ مجھے جگر صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا تو ہمیشہ سے اعتراف تھا ان ملاقاتوں نے ان کے کردار کی دوسری عظمتوں سے بھی متعارف کرایا۔ ان کی خودداری، فیاضی، وضعداری اور پاسداری کے بہت سے پہلو سامنے آئے اور خود میرے لئے زندگی کے سبق بن گئے۔

تامبرم روانگی:

خدا خدا کرکے تامبرم سینی ٹوریم سے خط آ گیا۔ میرے خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ میں تامبرم کے قیام کو ویکیشن سمجھ رہا تھا اور بہت ذوق وشوق سے اس کی تیاری کر رہا تھا۔ میں چین کے سینی ٹوریم میں ہاتھی کے دانتوں کو دیکھ چکا تھا اور ہندوستان میں بھی اسی کی توقع کر رہا تھا۔ ابا جان نے سب انتظام کرا دیا۔ بمبئی کے قاضی مرگھے صاحب نے مدراس کے کسی حکیم مدنی کے نام تعارفی خط دے دیا۔ سفر بہت خوش گوار تھا۔ شمال کے میدانوں کے مقابلے میں جنوب کے سرسبز وشاداب جنگلات سے اور سرنگوں سے ٹرین گذرتی تھی۔ آہستہ آہستہ صورتیں کھانے، زبانیں، لباس اور خوبو بدلنے شروع ہوئی۔ لگتا تھا ہم ہندوستان میں نہیں بین الاقوامی سفر کر رہے ہیں۔ مدراس شمالی ہندوستان والوں کے لیے پردیس تھا۔ یہاں نہ اردو تھی نہ ہندی۔ جو لکھا تھا وہ پڑھا نہیں جا سکتا تھا جو بولتے تھے وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رنگ گہرا تھا، کھانا کھٹا تھا اور لباس ڈھیلا ڈھا۔ میں رکشا لے کر مدنی صاحب کے گھر جا دھمکا۔ انہیں قاضی مرگھے صاحب کا خط دیا۔ انہوں نے شفقت سے ٹھہرایا دوسرے روز کسی صاحب کی معیت میں ہم بذریعہ ٹرین تامبرم پہونچے۔ سینی ٹوریم پہونچ کر ورلڈ

یونیورسٹی کا وارڈ تلاش کیا۔ دیکھ کر سارے سہانے خواب پریشان ہو گئے۔ وہ صاحب مجھے چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ اب میں تھا اور سینی ٹوریم کا یہ ڈی لکس وارڈ جو باقی وارڈس کے مقابلے میں اگر جنت تھا تو چین کے سینی ٹوریم کے مقابلے میں جہنم سے بدتر۔

مجھے پہونچتے ہی پرانے مریضوں نے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ مرض کی نوعیت کیا ہے؟ سینے سے کیسی آوازیں آتی ہیں؟ پہلے کہاں کہاں علاج کرایا؟ کون کون سی دوائیں کھائیں؟ میں اچانک ٹی بی کا مستند مریض بن گیا۔ مگر میں اپنے کو صحت مند ثابت کرنے میں لگا تھا، جسے کوئی ماننے کو تیار نہ تھا۔ یہ وارڈ ملٹری بیریک کی طرح تھا جس میں دورویہ بارہ بستر لگے تھے۔ ہر بستر کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری بنیادی ضروریات کے لیے تھی۔ کھانے میں دوسا، اِڈلی، سامبر، اپما۔ وہ کھانا جو نہ پہلے کبھی کھایا نہ ان کا نام سنا اور نہ انہیں کھانے کی خواہش ہوتی۔ چائے دسترخوان سے، ناشتہ سے، ہوٹل تک سے غائب۔ پینے میں کافی جو ہمارے لیے ناکافی تھی۔ ایک دن ہو دو دن ہو مگر یہ تو روز کا معمول تھا۔ کھانے کے نام سے ابکائیاں آنے لگیں۔

دوپہر میں وارڈ خوب گرم رہتا پنکھا نہ بجلی کا تھا، نہ ہاتھ کا۔ رات میں مچھروں سے مقابلہ تھا۔ اکثر پلنگ کے کھٹمل گدگدی کرنے نکل آتے۔ وارڈ میں کام کے لیے چار لڑکے تھے جن کی تنخواہ ۱۶/روپیہ فی کس تھی۔ مریضوں کے بچے ہوئے کھانوں پر پہلا حق ان کا حق تھا جو بچتا اس کے لیے دوسرے امیدوار انتظار کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان فقراء اور بلی کتوں میں جھڑپ ہو جاتی۔ کبھی فقراء جیت جاتے کبھی بلی کتے بازی لے جاتے۔

ابھی تشخیص اور علاج میں دیر تھی۔ سینی ٹوریم کے چیف ڈائرکٹر روس کسی مشن پر تشریف لے گئے تھے اور شاید واپسی کا ٹکٹ لے کر نہیں گئے تھے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر عبدالحمید صاحب خود سے فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہمارے وارڈ کے میل نرس احمد صاحب بہت ہمدرد، خوش مزاج تھے مگر میرا علاج، اگر ضروری تھا، تو محض خوش مزاجی سے نہیں ہو سکتا تھا۔

چند دن بعد معلوم ہوا کہ وارڈ میں بھی سیاست ہے۔جنوبی ہندوستان کے لوگ شمالی ہندوستان والوں کو غیر ملکی سمجھتے ہیں۔مدراس کے لوگ آندھرا اور کرناٹک کے لوگوں کو نہیں چاہتے۔ایک زبان والے دوسری زبان والوں کو پسند نہیں کرتے۔ایک اہم مسئلہ ریڈیو پروقت کی تقسیم کا تھا۔ہر زبان کو نصف گھنٹہ ملتا تھا۔ہندی کے قومی درجے کو کوئی نہیں مانتا تھا۔جنوب والے اسے شمالی ''کولونیلزم'' گردانتے تھے۔ہم نے اردو کے نام پر نصف گھنٹہ مانگا وہ دینے کے لیے تیار تھے لیکن صرف پاکستان ریڈیو پر سننے کے لیے۔سارے ہندوستان کے سارے ریڈیو اسٹیشن اور سری لنکا ہندی سے منسوب تھے اس لیے ان پر ہمارا اردو پروگرام نہیں سنا جاسکتا تھا۔پاکستان کی اجازت تھی لیکن شارٹ ویو پر سننا مشکل تھا۔ جمعہ کی قوالی موہمی کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ کے باوجود وجد آفرین تھی۔

تین علیگیرین اور گھر کا کھانا:

مجھے چند دن ماحول کو سمجھنے میں لگے پھر شمالی جنوبی مشرقی مغربی ہندوستان کو سمجھنے کے لیے علیگیرین ازم کام آ گیا۔اس عرصہ میں ایک اور علیگیرین اور سہارنپور کے ہم وطن راؤ صاحب تشریف لے آئے۔ان کی آمد سے اپنی زبان و بیان لطیفہ اور جملہ بازی کے کچھ لطف پھر سے ملنے لگے۔علی گڑھ میں سرسید کا مجرب نسخہ جو بھی تھا اس کے استعمال سے علیگرین اس کے رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔کچھ اور دن گذرے تو آفتاب زیدی صاحب تشریف لے آئے۔اب بہت خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین، والا معاملہ ہو گیا۔

ایک دن ایک اور مسلمان بھائی رشید نامی ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آ گئے۔وہ پرانے مریض تھے۔انہوں نے سینی ٹوریم کے قریب اپنی کٹیا بنالی تھی جس میں وہ اپنی والدہ اور یتیم بھانجی کے ساتھ رہتے تھے۔ان کا علاج جاری تھا دوا سینی ٹوریم سے مل جاتی تھی۔ گذر اوقات کے لیے کچھ خدمت گذاری سے کام چلا لیتے تھے۔ہم نے ان سے کھانے کی شکایت کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ اور بھانجی شمالی ہندوستانی کھانا بنانا جانتی ہیں اور

ان کے پاس مسالہ جات بھی ہیں۔ہم تینوں نے فوراًان کی خدمات حاصل کرلیں۔کھانے کا مسئلہ حل ہونے سے اورتین علیگرینس کے اجتماع سے گھر کا ساماحول لگنے لگا۔

عبدالغنی صاحب اور بجیری ریسٹورنٹ:

ایک بار اچانک ابا جان کے ساتھ منیریؔ صاحب بمبئی سے مزاج پرسی کے لیے آپہونچے۔ان کے عزیز عبدالغنی صاحب مقیم مدراس ان کے ساتھ تھے۔منیری صاحب کا تعلق بھٹکل سے تھا۔ وہ ابا جان کے دوست تھے اور بمبئی کے مسلمانوں کی معزز شخصیت تھے۔مجلس خدام النبی اور صابوصدیق مسافر خانے سے وابستہ تھے۔والد صاحب کے ساتھ مل کر البلاغ رسالہ نکالتے تھے۔بھٹکل کے مسلمان دینی معاملات اور تجارت دونوں میں ممتاز ہیں۔یہ آج کل نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق وسطی یوروپ اورامریکہ میں بھی تجارت کے رشتہ سے کامیاب ہیں۔ مدراس میں ۱۰۰ آرمنین اسٹریٹ میں عبدالغنی صاحب اور دوسرے بھٹکلی تاجروں کا مرکز تھا۔ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم تشخص کا نشان ''مولانا لنگی'' کے مالکان اسی گھر میں مقیم تھے۔منیری صاحب ہم تینوں کو مدراس لائے عبدالغنی صاحب سے متعارف کراکر ہمارا ٹھیکہ ان کو دے دیا۔اور بجیری ہوٹل میں سمندر کے کنارے کھانا کھلایا۔اس کھانے کا ذائقہ میں آج تک نہیں بھولا۔آج بھی خواہش ہے کہ کبھی مدراس جاکر بجیری ہوٹل کا کھانا کھائیں۔لیکن اس کے ذائقہ کا ہم صحیح لطف اٹھانے کے لئے پہلے وارڈ کا کھانا کھاناضروری تھا۔

ابا جان سے بہت سی باتیں ہوئیں اکثر ناگفتہ بہ ہیں انہوں نے بمبئی واپسی کی کم علی گڑھ ،لندن، اور امریکہ کی زیادہ گفتگو کی۔ ابا جان ہمیشہ رجائیت اور حوصلے کی بات کرتے تھے ان کے پاس نصیحت اور دعا کے علاوہ کوئی حل نہ تھا۔مجبوریاں تھیں جنہیں میں سمجھنے کے لیے تیارنہیں تھا۔ابا جان نے مدت سے خانگی مجبوریوں اور سسرال کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ابا جان اور منیری صاحب تو چلے گئے لیکن ہمارے لیے عبدالغنی

صاحب کی رفاقت چھوڑ گئے۔عبدالغنی صاحب کا تامبرم آنا اور ہمیں مدراس بلانا معمول بن گیا۔ان کے دم سے سینی ٹوریم کی یکسانیت میں رنگ ونور تھا۔مدراس کی سنہری بیچ پر بجیری ہوٹل کا کھانا معمول میں داخل ہوگیا تھا۔تامبرم چھوڑنے کے بعد عبدالغنی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔فون پر دو اک دفعہ علیک سلیک ہوئی مگر ان کی یادیں آج بھی تازہ ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گی۔اب وہ بھی مرحومین کی صف میں داخل ہو چکے ہیں۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُون

مایوسی میں خوش گواریاں:

مایوسی کی فضا میں ایک اور خوش گوار تجربہ اچانک ہوا۔سہاسنی ویش پانڈے اور چندر شیکھر کی اچانک آمد نے جیسے بجھتے چراغ میں تیل ڈال دیا۔یہ دونوں چین جانے والے خیر سگالی وفد کے ممبر تھے۔ایک ماہ کے چین کے سفر نے ہمیں ایک فیملی بنا دیا تھا۔ سہاسنی بمبئی یونیورسٹی سے تھیں اور چندر شیکھر (بنارس سے) یہ دونوں کسی وفد میں مدراس آئے تھے۔میرے بارے میں انہیں کیسے خبر ہوئی یہ نہیں معلوم مگر مجھے انہوں نے ڈھونڈ نکالا۔ٹی بی وارڈ میں مجھے دیکھ کر سہاسنی بھیا بھیا کر کے رونے لگی۔جو وقت ان کے ساتھ گذرا وہ بہت روح افزا تھا۔ہم لوگ ایک ماہ چین کے سفر میں ساتھ رہے تھے اور ہندوستان کے بیس طالب علموں اور ۱۴ اساتذہ میں رشتے ناطے ایک گھرانے کے سے قائم ہو گئے تھے۔گویا: ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

راؤ صاحب اور آفتاب زیدی صاحب کی وجہ سے ماحول گوارا بن گیا تھا۔راؤ صاحب مرنجامرنج آدمی تھے۔زیدی صاحب ہمارے سینئر تھے۔بہت اصول کے پابند اور انتہائی زود رنج تھے۔خاص طور پر وہ جب ہمارے ساتھ چیس کھیلتے تو ہماری تھوڑی بہت دھاندلی ان کو برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔اور پھر چند دن کے لیے کشیدگی ہو جاتی۔پھر ہم چیس کھیلنے کے بہانے انہیں منا لیتے اور پھر ہم کوئی اور شوشہ چھوڑ دیتے۔زیدی صاحب اور

راؤ صاحب دونوں غیر معمولی دوست تھے۔راؤ صاحب سے دواک بار سہارنپور کی کچہری میں ملاقات ہوئی آفتاب صاحب سے جامعہ ہمدرد میں ملاقاتیں ہوجاتی ہیں جہاں وہ ہمارے میزبان ہوتے ہیں۔میں ان سے بہت احتیاط سے ملتا ہوں۔اور کوشش کرتا ہوں مدراس تامبرم سینی ٹوریم کی کوئی یاد ان کے پرانے زخموں کو تازہ نہ کردے۔وہ سید حامد صاحب کے نفیس صاحب کی طرح دست راست ہیں۔حامد صاحب کا اپنا اخلاق بے مثال ہے۔انہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں ہاتھوں سے نواز رکھا ہے۔اور آفتاب صاحب کا تعاون اس کا حصہ ہے۔ان دونوں کی محبت اور ہمدردی نے میرے لئے اکثر ملٹی وٹامن کا کام کیا۔

وارڈ سے رہائی:

ایک دن بالآخر سپرنٹنڈنٹ صاحب روس سے آگئے۔ہمیں سرسری طور پر دیکھا اور کچھ دوا اور کچھ بی پی تجویز کردیا۔بی پی کے ذریعہ ہمارے دائیں پھیپھڑے میں جہاں ایک سفید داغ تھا اس کو ہوا ڈال کر سکیڑا جاتا تھا۔اس عمل میں خاصی تکلیف ہوتی تھی۔رفتہ رفتہ ہم بھی خود کو مریض سمجھنے لگے۔یہاں تک ایک دن جاکر مسلمانوں کے قبرستان میں اپنے لیے قبر کی مبارک جگہ بھی منتخب کرلی۔سینی ٹوریم میں موت عام بھی تھی اور آسان بھی تھی۔یہاں بیماری اور موت روزمرہ تھی۔ہمارا وارڈ عام وارڈس کے مقابلے میں ڈیلکس تو تھا ہی اس کا کھانا بھی اور وارڈس کے مقابلے میں اعلیٰ کوالٹی کا تھا جس کی قیمت سنا تھا۔دو آنے تھی۔عام کھانا جنرل وارڈ کے لیے پانچ پیسے کا تھا۔دوسرے وارڈ بھی ہمارے وارڈ کے مقابلے میں ایسے تھے جیسے برہمن کے سامنے اچھوت۔

ہماری طبیعت جب سے علاج شروع ہوا تھا پہلے سے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔پھر خراب تر ہونے لگی۔غرض: مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔وہاں کوئی شنوائی نہیں تھی۔ایک دن راؤنڈ پر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب آئے۔میں نے وہ ایکسرے جو علی گڑھ میں امریکن مشینوں نے لیا تھا زبردستی ان صاحب کو دکھلانے کی کوشش کی۔انہوں نے بہت غصے سے

اسے ہاتھ میں پکڑا پھر دوسرا تازہ xray دیکھا پھر دونوں کا موازنہ کیا۔

پھر فرمایا:''تمہارا تو یہ نشان پرانا ہے۔ ہوسکتا ہے پیدائش، یا یہ بچپن کے کسی سینہ کے مرض کی وجہ سے ہو۔ تین ماہ کے علاج سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تم کوٹی بی نہ ہو۔ وہ نیا اور پرانا ایکسرے بھی مزید مطالعہ کے لیے لے گئے۔

چند دن بعد انہوں نے یاد فرمایا:''ارے تم تو بہت بڑا آدمی ہے تم ذاکر صاحب کا آدمی ہے۔ تم ان کا مہمان ہے انہوں نے بہت اچھا خط تمہارے بارے میں لکھا ہے۔ ہم نے آج فائل کھولا تو پتہ چلا۔'' ذاکر صاحب نے تم کو ہندوستان کا فیوچر لکھا ہے۔'' ذاکر صاحب کے نام اور توجہ نے یہاں بھی کام کر دیا۔ اب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے فرمایا: ہمارے خیال میں تم کوٹی بی نہیں ہے۔ کیا تم کو بچپن میں ٹی بی یا ٹائیفائڈ، نمونیہ ہوا تھا۔'' میں نے کہا!''جی ہاں! ٹائیفائڈ بھی ہوا تھا اور میری والدہ کا انتقال پلیوریسی میں ہوا۔''

''تو پھر یہ سفید داغ یا ٹائیفائڈ کا ہے یا آپ کی مدر کی طرف سے آپ کو تحفہ میں ملا ہے۔'' اب آپ اپنی مرضی سے جاسکتے ہیں آپ ذاکر صاحب کا مہمان ہے ہم آپ کو ڈسچارج نہیں کر سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائے جس کے لئے انہیں بہت کوشش کرنی پڑی تھی۔

میں نے فوراً ہی ڈسچارج کرنے کی درخواست داخل کر دی اور کرایہ کے انتظام کے لیے چند دنوں کی مہلت چاہی۔

انہوں نے کہا'' آپ خود اپنی مرضی سے جا رہے ہیں۔ ہم نے کب آپ سے کہا جاؤ۔ آپ جب تک چاہیں رہیں۔''

قاری محمود صاحب اور سفر خرچ:

میں شکریہ ادا کر کے وارڈ میں آ گیا۔ اور سوچنے لگا یہاں سے بمبئی تک کے سفر کے لیے اخراجات کہاں سے آئیں گے۔ اور بمبئی پہونچ کر مجھے کن حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ میرا بمبئی جا کر ابا جان کی مدد کرنے کا فیصلہ اٹل تھا۔ عمر بھر کے تجربات کے بعد بھی یہ

فیصلہ: ایں خیال ومحال است وجنون تھا۔لیکن یہ خیال کہ میری قربانی سے ابا جان کو آرام ملے گا اور عزیزاں سلمہم کی تعلیم ہو جائے گی۔ مجھے علی گڑھ کے بجائے بمبئی جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری خدمت امی کا دل بھی جیت لے اور ہم سب مل کر محبت سے والدین کے زیر سایہ زندگی گزار سکیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے قاری محمود حسین (رجسٹرار) صاحب کو خط لکھ کر اپنی ریلیز کی خبر دی اور درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو بمبئی کے کرائے کا انتظام ہو جائے جو تیس روپیہ تھا۔ ایک ہفتہ میں محمود صاحب کا تار آیا اور یہ خوش خبری لایا کہ 150 روپیہ بذریعہ تار ذاکر صاحب وائس چانسلر فنڈ سے بھیج رہے ہیں۔ اس درمیان میں میری ریلیز کی یہ خبر جب وارڈ کے مریضوں کو ملی تو وہ بہت بے چین ہو گئے۔ کچھ تو رخصت کے وقت رو دئے۔ میری ڈائری میں انہوں نے بہت جذباتی بیان لکھے تھے۔ میں نے وارڈ کے ماہوار نیوز لیٹر کا سالنامہ نکالا تھا جس میں سب وارڈ کے مریضوں کے مضامین تھے۔اس کام نے ایڈمنسٹریشن اور مریضوں میں میرا اہم مقام بنا دیا تھا۔

بمبئی واپسی:

میں بمبئی میں جس ماحول میں پہونچا وہ ٹی بی کے مریض کے شایان شان تھا۔ میں نے خود اپنا گلاس اور پلیٹ الگ کر لی تھی۔ گھر پر کم سے کم قیام رکھا۔ ابا جان نے وزیر بلڈنگ کے دوسرے فلور پر ملا چٹنی والے کے یہاں قیام اور سونے کا انتظام کرا دیا تھا۔ ملا جی کے ایک لڑکا تھا جسے وہ انگلستان میں تعلیم دلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کا بزنس چٹنی بنانا تھا جو ایک طرح کی مٹھائی تھی۔ ہمارے علاوہ بھی ان کے ہاں ہماری طرح کے بے گھر بے در لوگ اور مدارس کے سفیر آ کر ٹھہرتے تھے۔ کوئی چیز کمرے میں محفوظ نہ تھی۔ میں نے اپنا علی گڑھ کا تقریری کا سیفی گولڈ میڈل یہیں گنوایا۔ کھٹملوں کی وہ بہتات تھی کہ جس کا شمار ناممکن تھا زیادہ لوگ جو یہاں ٹھہرتے تھے وہ اس قدر تھک کر لیٹتے تھے کہ انہیں نہ کھٹملوں کی گستاخی

جگا سکتی تھی نہ ربڑ کے گردزدہ چپلوں کے بدبو۔

اس درمیان میں کسی تقریب میں طارق میاں، خالدی اور ابا جان کا دیو بند کا سفر درپیش آ گیا۔ میں جمہوریت اخبار میں تھوڑی بہت مدد کرتا تھا۔ اب وہ ذمہ داری سو فیصدی میرے سر پر تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ چھتری میسر نہ تھی، برساتی کا رواج نہ تھا کا غذ عنقا تھا۔ ایڈورٹائزمنٹ نایاب تھے۔ منصوری صاحب پرنٹر پہلے پچھلا حساب صاف کرانا چاہتے تھے۔ اخبار چھپنے کے بعد اس کو تیار کر کے میل کرنے کا مرحلہ سخت تھا الزامات طعن، تشنیع طارق میاں اور خالدی کی روشن مثالوں کا تذکرہ طبیعت کو مکدر اور کام کو دشوار تر کر رہا تھا۔ بار بار چار منزل اترنا اور چڑھنا دن بھر بھاگ دوڑ بارش کے طوفانوں سے پیہم گزرنا۔ اس جہد مسلسل سے کم از کم یہ ثابت ہو گیا کہ مجھے ٹی بی نہیں۔ ابا جان کے آنے کے بعد خود ان سے اجنبیت مزید بڑھ گئی۔ جو بات نثر میں نہ کہہ سکا وہ غزلوں میں لکھ دی ابا جان کی نظر سے گذری تو ان کی دل شکنی ہوئی۔

ہم نے جس کی خوشیوں پر خود کو کر دیا قرباں
وہ بھی ہو گئے ویراں میری اس تباہی سے

اسی زمانے میں شمس کنول (جو بعد میں بہنوئی بنے) ان سے ربط وضبط بڑھ گیا۔ ان کا کہنا تھا بغاوت کر دو، میرا موقف تھا میں کسی طرح اس اجنبی ماحول کو اپنے اخلاص کا یقین دلاؤں اور سب کے دل جیت لوں اور ابا جان اور عزیزان سلمہم کی مدد کر سکوں۔

علی گڑھ میں ساتواں سال
جولائی ۱۹۵۷۔ مئی ۱۹۵۸
آصف علی کی صدارت

افغانستان سے دعوت:

بمبئی میں چچا میاں کا مبارکباد کا خط آیا یہ وزارت تعلیم میں میری ملازمت کی خوش خبری لایا ہے۔ ابا جان اور پورے خاندان کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں چاہتا ہوں افغانستان کی زمین و جائداد کا فیصلہ ہو جائے اس لیے میں ابا جان کی طرف سے پاور آف اٹارنی لے کر آؤں۔ پاسپورٹ، عدالتی کاغذات تیار کرائے۔ اب اواخر جون آپہونچا تھا۔ کابل میں اسکول کھلنے کا وقت قریب تھا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ جو مسئلہ میں بمبئی میں رہ کر حل نہ کر سکا وہ افغانستان جانے سے بدرجہ اتم حل ہو جائے گا۔ لیکن افغانستان کا سفر، میری مالی تگ و دو اور ذہنی پریشانیوں کا حل معلوم ہوتا تھا۔ پانچ سال کی عمر کے سفر افغانستان کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔ مجھے کسی گھر کی تلاش تھی جسے اپنا کہہ سکوں اور اس خاندان کی تلاش تھی جس کا میں اہم حصہ ہوں۔

روانگی کا سامان تو بندھ رہا تھا لیکن سفر خرچ کے لیے پیسہ کہاں سے آئے؟ ابا جان کے تو صبح و شام ہی قرض پر چل رہے تھے۔ میں نے ایک خط خلیل چچا کو جونپور لکھ کر قرض حسنہ کی فرمائش کی۔ خلیل چچا جونپور کے تعلق داروں میں تھے۔ ان کی شاندار ڈیوڑھی پرانی کوتوالی کے سامنے تھی۔ وہ ہمارے پھوپا معزالدین (مقیم حیدرآباد) کے کزن تھے۔ علی گڑھ میں خلیل چچا سے تعلق پیدا ہوا اور بڑھتا چلا گیا اور ہمارا مقام بھی ان کے گھر میں اولاد کا تھا۔ ان کو درخواست منظور ہونے کی پوری توقع تھی۔ مجھے پچاس روپیہ کی ضرورت تھی انہوں نے دو سو پچاس بھیج دیے جس میں بمبئی سے کابل تک کا کرایہ بخوبی ہو سکتا تھا۔ میں اوائل جولائی میں دلی پہونچا اور افغانستان سفارت میں وزارت تعلیم کی تقرری کے کاغذات پیش

کئے۔انہوں نے بہت تپاک سے استقبال کیا۔پھر میرا فائل نکال کر ویزا کی کارروائی شروع کی۔مجھ سے میرے کاغذات طلب کیے پھر پوچھا: ''آپ کے پاس بی ٹی یا بی ایڈ کی ڈگری ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''میں نے بی اے انگلش فرسٹ کلاس پاس کیا ہے۔'' کونسل جنرل نے فرمایا: ''ملازمت کے لیے بی ٹی یا بی ایڈ شرط ہے۔'' چند لمحوں میں اڑا اڑا دھم سارے خیالی قلعے زمین پر آ گئے۔اب 'نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن' کا مضمون تھا۔اور حالیہ تجربے کی بنیاد پر بمبئی کا راستہ بھی مسدود تھا، دیو بند یا انبہٹہ جا کر کیا کروں گا؟

افغانستان کی نوکری کا انکار میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔بمبئی کی کشتی میں جلا آیا تھا اور اگر نہ بھی جلاتا تو ابا جان کے گھر کے سمندر کے طوفان میں میں اسکو کھیناا اب میرے لئے ممکن نہ تھا۔انبہٹہ کا گھر اباجی کی دوسری شادی کے بعد سے اجنبی تھا ان کے انتقال کے بعد میرے ذہن پر اس کا رہا سہا دروازہ بھی بند ہو گیا تھا۔دیو بند میں پھوپی جان کی ذہنی کیفیت اور پھوپا جان کی مالی حالت اس محبت کی پناہ گاہ میں جانے میں مانع تھی۔غرض سامنے کوئی راستہ تھا نہ انتہا تھی۔میں نے عین عالم مایوسی میں ایک بہت پر امید خواب دیکھا اور ایک روشن خیال دماغ میں پیدا ہوا جس نے والہانہ طور پر روشن مستقبل کی طرف غیر ارادی طور پر میرے قدم اٹھوا دئے۔

علی گڑھ۔پھر آ گئے وہیں پہ جہاں سے چلے تھے ہم:

جولائی کا مہینہ تھا۔مسلم یونیورسٹی کے نئے سیشن کا آغاز تھا۔ارادہ تعلیم جاری رکھنے کا نہ تھا بس دوستوں سے تجدید ملاقات کا تھا۔جیب میں افغانستان کے سفر خرچ سے بچے ہوئے کچھ پیسے بھی تھے۔ٹکٹ خرید کر علی گڑھ روانہ ہو گیا۔اور علی گڑھ اسٹیشن سے سیدھا آفتاب ہوسٹل پہونچا جہاں عرفان اللہ خان، سید ظفر امام، حامد انصاری بہاء الدین سید عمر دلیش راج سنگھ سید آصف علی، شاہ عبدالقیوم نے اور بہت سے دوسرے احباب نے والہانہ استقبال کیا۔اس وقت ہال کے پرووسٹ مظفر علی صاحب تھے اور آفتاب کے ہوسٹل وارڈن

ہمارے مربی واستاد انگلش ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر مسعود الحسن صاحب تھے۔جب ہم نے سب لوگوں کو بتایا ہمارا قیام عارضی ہے اور چند دن ملاقات کے بعد دہلی جا کر نوکری تلاش کرنی ہے تو کم وبیش ہر خورد وکلاں نے ہمارے ارادے کو مزاق میں اڑا دیا۔مختلف ہالوں (بورڈنگوں) سے فری رہائش کی آفر آنے لگے۔خصوصاً نور الحسن صاحب (شعبۂ تاریخ) نے وی ایم ہال کی پیشکش باصرار کی۔ادھر مسعود الحسن صاحب نے جنھیں پتہ نہیں کس طرح ہمارے حالات کا علم تھا حکماً فرمایا کہ ہم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ہمارے لئے فری فوڈ کا انتظام کرا دیا اور ہوسٹل میں قیام کا بھی۔یوں بھی ہم آفتاب ہال والے تھے اور ہمارے سارے دوست یہیں آباد تھے۔

عرفان اللہ خان نے ہمارے داخلے کا ٹھیکہ اپنے سر لے لیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے صدارتی امیدوار ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔داخلے اور الیکشن کے لئے بہاء الدین سید عمر (سوڈانی) نے اپنی قیمتی گھڑی پیش کر دی۔دوستوں میں جسکی جیب میں جو کچھ تھا وہ خالی کرنے لگا۔استادوں میں جو استاد جتنی شفقت بکھیر سکتا تھا اس نے بکھیر دی۔واہ رے سرسید ! واہ رے علی گڑھ! سبحان اللہ، ماشاء اللہ

واہ رے سرسید اور واہ رے علی گڑھ!

ہم جا کر سید بشیر حسین زیدی، نئے وائس چانسلر سے ملے اور عرفان نے ان سے ہمارا تعارف کرانا چاہا تو انہوں نے ہم سے ہمارا تعارف خود کرا دیا۔ذاکر صاحب جن طلباء کے لئے خصوصی توجہ کی سفارش کر کے علی گڑھ تشریف لے گئے تھے انمیں سرفہرست میرا نام تھا۔ پھر یوسف حسین خان (پرووائس چانسلر برادر خورد ڈاکٹر ذاکر حسین خان) سے شرف نیاز حاصل ہوا تو فرمایا: "ذاکر صاحب نے فرمایا تھا وہ تمہاری جیب خرچ کے لئے بیس روپیہ ماہوار دیتے تھے۔وہ تمہارے ایم اے کی تعلیم کے لئے یہ رقم جمع کرانا چاہتے تھے لیکن میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی تھی اور وہ میں تمہارے یونیورسٹی کے حساب میں جمع کرتا رہوں گا۔" آپ کا علی گڑھ سے تین

نسلوں کا رشتہ ہے۔آپ یہاں پہونچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔آفتاب ہوسٹل آپ کا گھر ہے۔''

ذاکر صاحب تشریف لے جاچکے تھے۔بشیر حسین زیدی صاحب نے زمام کار سنبھال لی تھی۔نورالدین صاحب (پی وی سی) رخصت ہو چکے تھے۔یوسف حسین خان صاحب پرووائس چانسلر تھے دونوں سے میرا تعارف نہ تھا۔سوچا ان دونوں سے ملاقات کرلوں۔مرید صاحب سکریٹری وائس چانسلر سے اچھی ملاقات تھی۔وہ بہت تپاک سے ملے اور فوراً ہی ملاقات کا انتظام کردیا۔مرید صاحب نے زیدی صاحب سے تعارف کرایا تو وہ استقبال کے لیے دروازے تک تشریف لائے پھر معانقہ کیا اور فرمایا:''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ذاکر صاحب جاتے وقت ہدایت کی تھی کہ جب عابداللہ غازی سینی ٹوریم سے واپس آئے تو اس کی خصوصی معاونت کرنا۔''انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایڈمیشن اور تعلیمی اخراجات میں پوری معاونت کریں گے۔

زیدی صاحب سے مل کر سامنے یوسف حسین خان سے ملاقات کے لیے حاضری دی۔وہاں بھی پرتپاک خیر مقدم ہوا اور فرمایا:''ذاکر صاحب نے مجھے تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دی ہیں۔وہ تمہارے حساب میں اپنے پاس سے ۲۰ روپیہ جمع کراتے تھے۔میں اس کو جاری رکھوں گا۔''

بہاءالدین سید عمر (سوڈانی) نے اپنے ہاتھ کی گھڑی نیلام کر کے پیسے داخلہ فنڈ میں دیدیے۔پوری کیمپس پر میں جہاں بھی جارہا تھا وہاں غیر معمولی استقبال ہورہا تھا۔وہ لوگ جنہوں نے ۱۹۵۵ کے الیکشن میں میرے خلاف ووٹ دیا تھا وہ دیکھتے ہی الیکشن میں سپورٹ کی یقین دہانی کرانے لگے۔اس ماحول سے اب بچ کر نکلنا ممکن نہ تھا۔ایسا لگتا تھا افغانستان کے بہانے روح علی گڑھ نے مجھے کھینچ بلایا تھا۔اور بلا کر واپسی کے راستوں کو مسدود کردیا۔

میں نے ایم اے کے پہلے سال میں داخلہ لے لیا۔آفتاب ہوسٹل میں محترمسعود الحسن کے زیر سایہ رہائش اختیار کرلی۔مصطفیٰ شیروانی صاحب نے بھی عرفان اللہ خاں کی اور

آبادمیاں شیروانی کی سفارش پر ۲۰/روپیہ ماہوار کا وظیفہ دے دیا۔میں نے داخلے کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ اب علی گڑھ ہو یا ہندوستانی سیاست دونوں کے دروازے اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند ہیں۔میرے اوپر الیکشن کا پریشر اس بار ہر سمت سے بڑھ رہا تھا۔

میری اس مقبولیت کے پیچھے چند اسباب تھے۔

۱۔ میرے الیکشن میں ''اسلام خطرہ میں ہے'' کے ساتھ ایک نیا حربہ استعمال ہوا تھا: ''غازی انڈر گریجویٹ ہیں اور وہ علی گڑھ کی مقدس روایت توڑ رہا ہے۔اس لیے جن اصول پرستوں نے پچھلے بار ساتھ چھوڑا تھا انہوں نے آئندہ سال ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ بھی کرلیا تھا۔

۲۔ اتنے سیاسی ہنگاموں کے باوجود میری فرسٹ کلاس نے یونیورسٹی میں نیک مثال قائم کردی۔علی گڑھ کی ایک اور مقدس روایت یہ تھی کہ یونین کے عہدیدار ہمیشہ ڈراپ کرتے تھے۔

۳۔ میں ۵۷-۱۹۵۶ کے سیشن میں تا مبرم میں تھا۔مبشر صاحب کے دور میں علی گڑھ میں بھارتیہ ودیا بھون کی ایک کتاب ریلجس لیڈرس کے خلاف ایجی ٹیشن ہوا،اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر توہین انداز کے طریقہ سے تھا۔یہ کتاب سلمان رشدی کی کتاب (Satenic Verses) شیطانی آیات کی طرح یوں تو کافی عرصہ سے بازار میں موجود تھی،کچھ لوگوں نے اسے اتفاقاً دریافت کرلیا اور سیاسی وجوہ سے ایجی ٹیشن شروع کرادیا۔علی گڑھ میں ایجی ٹیشن کے ساتھ یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ علی گڑھ کے طلباء نے گیتا کو جلایا اور اس کی توہین کی ہے۔اس افواہ سے پورے یوپی اور ہندوستان کے بہت سے علاقے متاثر ہوئے۔مسلمانوں اور یونیورسٹی کو بہت نقصان پہونچا۔مبشر محمد خان اور ان کے اصدقاء پاکستان روانہ ہوگئے۔وہ اس مجاہدانہ کام کو پاکستان میں کیش کرانا چاہتے تھے۔اب بہت سے ہمارے دوست اپنے مبشر محمد خان کی کامیابی میں معاون ہونے کی وجہ سے شرمسار تھے اور مجھ سے مل کر اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

۴۔ رامپور سے جماعت اسلامی کا ایک خاص تربیت یافتہ گروپ ثانوی درس گاہ کی دینی تعلیم کی تکمیل کر کے (نجات اللہ صدیقی، اشفاق احمد صاحب، عرفان احمد خان، عبدالحق انصاری) علی گڑھ میں تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ان سے میری ملاقاتیں رامپور میں ہو چکی تھی۔ وہ مجھے دعوت اسلامی بھی پیش کر چکے تھے۔ میں ان کی فکر کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہی نہیں تھا ان کا ہم خیال بھی تھا۔اگر چہ میری رائے میں جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کا ہندوستان کے حالات میں مسلمانوں کے مسائل کا حل نہ تھا۔ بہر حال اس گروپ کے بھی باثر طلباء نے یقین دہانی کرائی کہ وہ لوگ میرے الیکشن میں کسی امیدوار کو کھڑا نہیں کریں گے۔ دراصل یہ گروپ اکیڈمک تھا اور یونین سے بس اس کا دور کا واسطہ تھا۔

غرض ہم پر علی گڑھ کے علم، احباب کی محبت ، اور بزرگوں کی شفقت کے دروازے اس طرح سے کھل رہے تھے کہ ہمیں اپنے اوپر خود پیار آنے لگا۔ کہاں ہمیں بمبئی، دیوبند، انبہٹہ اور دہلی میں مایوسوں نے گھیرا تھا اور کہاں علی گڑھ نے ہمارے لئے امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے!

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

ہم نے ایم اے (پولیٹیکل سائنس) میں داخلہ لے لیا جہاں ہمارے ساتھیوں میں حامد انصاری اور سید شہزاد احمد بھی تھے،دونوں پڑھاکو تھے، حامد انصاری پورے سال پڑھتے تھے اور امتحان سے دو ہفتہ پہلے درسی کتابیں طاق میں رکھ دیتے اور صرف کرکٹ کی کتابیں پڑھتے تھے۔شہزاد پورے سال نظم و ضبط سے پڑھتے اور امتحان کے دنوں میں گھڑی رکھ کر جوابوں کی پریکٹس کرتے ،ہم پورے سال سیاست کی عملی پریکٹس کرتے اور امتحان کی راتوں میں دوستوں کے یا بھنڈاری اور مہاجن کے مختصر نوٹس پڑھتے۔ امتحان کی رات ہمارے لئے قسمت کے فیصلے کی ہوتی اور ہم امپورٹنٹ کا انتخاب کر کے اس کی رات بھر تکرار کرتے۔

میں نے ایم۔اے کے ساتھ ہی بیچلر آف تھیالوجی میں داخلہ لے لیا تھا جس سے ہمیں ۱۵ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مل گیا۔وہاں ہمارے خصوصی کلاس فیلو قاری رضوان اللہ تھے جن کے اور ہمارے حالات میں یکسانیت تھی۔لیکن فکر میں تفاوت تھا۔وہاں بھی ان کی سال بھر کی محنت ہمارے کام آ گئی اور ہم ان سے زیادہ نمبر لے کر فرسٹ کلاس پاس ہو گئے۔

ہر چند کے ہمارے ساتھی اور بعض اساتذہ متوقع تھے کہ ہم یونین کے الیکشن میں شریک ہوں گے،لیکن میں نہ خود کو مشقت میں ڈالنا چاہتا تھا اور نہ احباب کی محبت کا مزید امتحان لینا چاہتا تھا۔اس لئے میں الیکشن نہ لڑنے کا فیصلے میں دوستوں کے سخت اصرار کے باوجود ثابت قدم رہا۔میرے دوست سید آصف علی نے اس سلسلے میں میری خاص مدد کر دی کہ میرے پاس اپنے صدارتی الیکشن کے مشورے کے لئے آئے اور مجھ سے چیف کنڈکٹر بننے کا وعدہ لیکر رخصت ہو گئے۔اب ہمارے سب ساتھی ہم سے مایوس ہوئے اور ہمارے اصرار پر آصف علی کے الیکشن میں لگ گئے۔

اک خواب سا دیکھا تھا:

الیکشن کے بعد ایک ایسا خوش گوار واقعہ پیش آیا جس نے ہم پر مستقبل کے امکانات کو واضح کر دیا۔اکتوبر کے مہینہ میں اس کالج میں اقوام متحدہ کا ''تفریحی سیشن'' ہونا قرار پایا اور محترمہ ممتاز آپا (حیدر) نے ارباب حل وعقد سے یہ منظور کرا لیا کہ یونیورسٹی کے منتخب نوجوان اس میں شریک ہو سکیں۔دراصل ممتاز آپا نہ صرف گرلس کالج کے دروازوں کو نوجوانوں پر کھولنا چاہتی تھیں بلکہ اپنی لڑکیوں پر بھی مستقبل کے دروازے کھول رہی تھیں۔

ممتاز آپا سے قریبی تعلق کی وجہ سے ہماری شرکت تو یقینی تھی۔ممتاز آپا نے کچھ اساتذہ کے اور کچھ ہمارے مشورے سے نوجوانوں کی فہرست بنالی جس میں یونین کے اور اسپورٹس کلب کے عہدے دار شامل تھے۔اقوام متحدہ کے ممالک کے نمائندگی تو لڑکیوں کو کرنی تھی لیکن انہیں مردانہ کردار ادا کرنے تھے۔ان لڑکیوں کو میک اپ کے ذریعہ مرد

بنانے کا کام اہم تھا۔اس کام کے لئے علی گڑھ میں کسی کا ملنا ناممکن تھا مگر ہمارے آفتاب ہوسٹل کے ساتھیوں میں حکیم محبوب عالم اس فن کے چھپے ماہر نکلے ان کے انتخاب پر ان کے اکثر دوستوں نے خار کھایا اور اس کارگزاری کے بعد جب وہ آفتاب ہوسٹل واپس ہوئے تو ان کے متبرک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا تھا اور بوسے دیئے گئے۔

اس کے علاوہ مختلف بورڈنگوں سے سوٹ اور کپڑے مختلف سائزوں کے جمع ہوئے تا کہ اقوام متحدہ کے ڈیلیگیٹ وہ جامے زیب تن کرسکیں۔جن لوگوں کا سائز میچ کر گیا تھا ان کی قسمت پر بھی رشک کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ہم ان محروموں میں تھے جن کا خود گزارہ احباب کے کپڑوں پر تھا۔اور اقوام متحدہ کا کوئی ڈیلیگیٹ شیروانی نہ پہنتا تھا۔اس لئے اس سعادت سے میں تو کیا عرفان اللہ خاں اور ظہیر قریشی (جن کی شیروانیوں میں ہمارا سیاسی روپ نکھرتا تھا) بھی متاسف اور محروم رہے۔

صبح سے ہی مدعو طلباء کی گرلس کالج کے پروگرام میں شرکت کی تیاری جاری تھی۔ ہم نے اپنا چوڑی دار پاجامہ اور عرفان اللہ خان کی شیروانی زیب تن کی۔خوش قسمتی سے ان کے پاس کئی شیروانیاں تھیں۔عام طور پر طالب علموں کے پاس ایک ہی شیروانی تھی اور مجھ جیسے دھان پان کے کئے ہر کسی کی شیروانی میں فٹ ہونا بھی ممکن نہ تھا۔مجھے ممتاز آپا کی وساطت سے اور یونین کی رعایت سے اسٹاف کے ساتھ آگے نشست میسر آگئی۔اقوام متحدہ کے سامنے اس دن اس دور کا ہی نہیں ہر دور کا اہم ترین مسئلہ تھا جس پر فیصلہ ہونا تھا۔

"دنیا کے قیام امن اور ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا کا نظامِ حکومت خواتین کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔"

بعض منتخب ممالک نے اس موضوع پر خیالات کا اظہار کیا زیادہ بھاری پلڑہ قرارداد کے حق والوں کا تھا۔ہر چند کہ ایک دل آویز اور جامہ زیب خاتون نے بڑی مدلل انداز سے اس قرارداد کے خلاف تقریر کی۔یہ خاتون پاکستان کی نمائندہ بنیں اور پاکستان کی اقوام

متحدہ میں نمائندہ بنکر رعنا لیاقت علی کا کامیاب کردار ادا کر رہی تھیں۔ اتنے مرد نما ڈیلیگیٹس میں ایک خاتون وہ بھی شربتی رنگ غرارے میں ملبوس اور کانوں میں لمبی بندے آویزاں کئے اور نصف سر کو دوپٹے سے ڈھکے اس اسلامی ملک کی نمائندگی کر رہی تھیں جس کے اکثر افراد ان کے پیش کئے جانے والے خیالات سے یقیناً متفق تھے۔ کوئی ہو نہ ہو ہم تو صورت دیکھ کر ہی متفق ہو گئے تھے۔ اور ان کے روایتی خیالات نے دل جیت لیا۔

جسارت بے بضاعت:

جب ووٹنگ ہوئی تو قرار داد بھاری اکثریت سے پاس ہوگئی۔ مہمانوں اور فنکاروں کے لئے علی گڑھ کی روایتی چائے تھی اور ہم ان چند نوجوانوں میں سے تھے جو خوش قسمتی سے چائے پر مدعو تھے۔ ہماری اور ادا کارہ لڑکیوں کے درمیان اساتذہ کی دیوار حائل تھی۔ پھر بھی طبعیت بے چین تھیں کہ بھلا اس قدر اچھی تقریر اور اعلیٰ خیالات کی داد کیسے نہ دی جائے؟ عرفان اللہ خان کی ایک کزن ان لڑکیوں میں شامل تھیں انہوں نے راہ ہموار کر دی کی اور ہم اساتذہ کی مزاج پرسی کرتے کرتے اس میقات کو کراس کر کے حریم ناز تک پہونچ گئے۔ جن لڑکیوں سے ہمارا تعارف یونین کے راستہ سے تھا ان کے قرار داد سے پاس ہونے کی ہم شکایت کرنے لگے تو یکبارگی چاروں طرف سے ہم پر حملہ ہو گیا۔ ہم نے اپنی موقف کے دفاع کے لئے اس صاحبزادی سے مدد مانگی جو سب سے غیر متعلق رہ کر یہ تماشہ تجاہل عارفانہ سے دیکھ رہی تھی۔ ہم نے ان کی خدمت میں مودبانہ عرض کیا: ''پہلے تو ہم تمام مردوں کی طرف سے آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس قدر مدلل وکالت شگفتہ انداز میں مردوں کے موقف کی فرمائی۔''

ابھی ہمارا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اس خاموش سراپا تصویر نے قسم توڑ دی اور پر زور لہجے میں کہا: ''ہم نے جو کچھ کہا وہ ہم سے کہلایا گیا ہمارے خیالات وہی ہیں جو اس تجویز کے ہیں۔'' اس کے بعد میں اور عرفان اس ہجوم میں گھرے ہوئے تمام مردوں کی عالمی

برادری کے حقوق کا دفاع کرتے رہے اور مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہوتے رہے پھر ایک آواز آئی: ''مس ٹامس آرہی ہیں!''

مس ٹامس اور مس ردرا دونوں مریم کی بیٹیاں تھیں جو ان فرزندانِ توحید کی بیٹیوں کی حفظ عصمت پر مامور تھیں۔اور اپنا فرض پوری طرح نبھاتی تھیں۔مس ٹامس کی آمد کا سن کر لڑکیاں تو خوابوں کی پریوں کی طرح غائب ہوگئیں اور مس ٹامس نے ہم کو پکڑ لیا۔ ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ہم سے اس وقت کوئی معقول جواب نہ بن پڑا اس لئے جلتو جلال تو پڑھ کر ہم نے عرض کیا: ''ہم راستہ بھول گئے۔''

مس ٹامس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ راستہ ہے۔ آپ دونوں فوری طور پر میری نگاہ سے دور ہو جایئے ورنہ مجھے آپ کے پرووسٹ کو رپورٹ کرنی پڑے گی۔ہم نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرض کیا: ''ہمیں ممتاز آپا نے گھر پر بلایا ہے ان کے ساتھ چائے پی کر ہم رخصت ہوں گے۔''

مس ٹامس پر ہمارے دروغ مصلحت آمیز کا خاص اثر نہیں ہوا انہوں نے کہا: ''آپ یہاں سے براہ راست نہیں بلکہ کالج سے باہر نکل کر عبداللہ لاج کے دروازے سے داخل ہوں۔اور یہاں سے فوری روانہ ہو جائیں۔'' ہم روانہ ہو گئے اور احاطے سے باہر نکلتے وقت پلٹ کر دیکھا ان کی جہاں دیدہ مرد گزیدہ آنکھیں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں!

اس چھوٹے سے واقعہ نے ہماری زندگی اور گرلس کالج میں چھوٹا موٹا حشر برپا کردیا، یوں تو ہم اپنے بارے میں کہہ سکتے ہیں: مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔لیکن یہ تجربہ مختلف تھا اور دل میں ایک خلش چھوڑ گیا تھا۔لیکن ہم اس فکر سے بہت دور تھے جسے شادی کہتے ہیں۔اول تو مالی حالات، پھر تا مبرم سینی ٹوریم کی تاریخ، ہم تیار ہوں بھی تو بھلا کون سوچ سمجھ کر ہماری طرف قدم اٹھائے گا۔ہمارے لیے تو اپنے گھر کا دروازہ بھی تنگ تھا اور اب تو وہ تو تقریباً بند ہو گیا تھا۔غرض ایسا خیال دل کو خوش رکھنے کو بھی اگر اچھا ہو تو حقیقت

پر مبنی نہیں تھا۔ پھر یہ علم ہوا کہ ان صاحبزادی کی نسبت پاکستان میں طے ہو چکی ہے اور یہ اس ملک کے پاسپورٹ پر ہندوستان میں تعلیم پا رہی ہیں۔ اس خیال کو دماغ سے لاکھ نکالا لیکن اسکے تسلسل نے ہر چیز سے دل اچاٹ کر دیا۔

طوافِ کوئے صباحت:

حسن اتفاق سے گرلس کالج کی آرٹ کی نمائش میں ہمیں پھر چند لمحے میسر آ گئے اور اس غزالی برق پا کو روک کر بعد سلام و تسلیمات عرض کیا: آپ کا پاکستان میں قیام کہاں ہے''؟

''پاکستان میں میرا قیام کیوں ہوگا؟ میرا وطن فتح پور ہے۔''

''اچھا تو تعلیم کے بعد آپ وہاں مستقل گھر بنانے والی ہیں؟''

''میرے ارادوں کی آپ کو کیسے خبر ہوگئی؟''

''میں نے معتبر ذرائع سے سنا ہے۔''

''لیکن میرا ایسا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔''

میری گفتگو چند لائینوں سے آگے نہیں بڑھی تھی کہ ممتاز آپا نے طلب کر لیا اور مسکرا کر فرمایا: ''بہت اچھی لڑکی ہے۔''

میں نے کہا: ''ابھی دلی بہت دور ہے!''

ممتاز آپا خاموش مسکراہٹ کے بعد دوسرے مہمانوں سے مشغول گفتگو ہو گئیں۔

اس سال جنوری کی نمائش میں ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ بارہ دری کے چکر لگا رہے تھے، کہ سعیدہ رضا (صدر گرلس کالج اسٹوڈنٹس یونین) نے ہم سے امداد کی درخواست کی: '' کچھ خراب لڑکے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔'' ہم نے پلٹ کر دیکھا تو شہر کے چند لڑکے تھے جو ہمیں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گویا

''دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا''

وہ مقابلے پر آجاتے تو ہم خود پسپائی کا راستہ اختیار کر لیتے۔ ہمارے جذبۂ

خدمت خلق کو اب نیا میدان ہاتھ آ گیا۔ کالج کی ایک درجن لڑکیوں نے ہم کو اپنی امان میں لے لیا۔ انکی درخواست پر ہم نے انہیں مزمل گیٹ تک رکشا کرانے کی ذمہ داری لی لیکن خوش قسمتی سے وہاں کوئی رکشا نہ تھا اور ہم نے اپنی حفاظت میں کالج تک پہونچانے کی پیشکش کر دی جو بغیر پس و پیش کے قبول کر لی گئی۔ فاصلہ کافی بڑا تھا لیکن چاندنی رات اور ہمسفروں کی صفات نے اسے منٹوں میں بدل دیا۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد:

افسوس کہ اس ہجوم میں وہ شخصیت نہ تھی جسکی ہمیں تلاش تھی۔ پھر بھی اس کے ذکر کے بغیر بات نہیں بن رہی تھی۔

''وہ لڑکی جو اچھی تقریر کرتی ہے کیا نام ہے اس کا؟'' ہم نے سوال کر دیا۔

''تسلیمہ، ہاں مگر آپ بھی تو بہت اچھی تقریر کرتے ہیں۔''

''وہ آج تشریف نہیں لائیں؟''

''ہم نے بہت چاہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلیں مگر وہ کسی شخص سے خوف کھاتی ہیں۔''

''وہ آدمی بڑا خطرناک ہوگا؟ مگر خوف کیسا؟''

''وہ ڈرتی ہیں وہ ان کو پکڑ کر بات نہ کرنے لگے۔''

''ارے یہ تو اچھی بات ہے، اس میں کیا برائی ہے۔ بہر حال آپ ان کو میرا اسلام پہونچا دیں اور یہ کہہ دیں وہ انسانوں سے خوف نہ کھایا کریں۔''

اب ہم نے تو اپنی طرف سے سیدھی سادی بات کہی تھی۔ کالج پہونچ کر ان محترمہ کو سوتے جگا کر ان سے نہ معلوم کیا کیا کہا گیا کہ انہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ہمیں چند دن بعد کسی غیر مانوس لڑکی کا خط ملا جسمیں ہمیں صورت حال سے آگاہ کر کے نصیحت کی تھی کہ ہم اپنے طرز عمل کی معافی مانگ لیں۔''

اگر انسان غلطی کرے تو معافی مانگنا چاہیئے لیکن ''دل بدست آور کہ حج اکبر است'' کے

مصداق ہم نے معذرت نامہ لکھ کرانہیں محترمہ کوارسال کردیا۔ کچھ دن بعد وہ غیر مانوس لڑکی ہماری منہ بولی بہن بن گئیں اوراس رشتہ کو بھی انہوں نے آخر تک نبھایا ہے۔اب پتہ نہیں انہوں نے اپنی دوست کی دوستی نبھا کرانہیں ایک قصوروار کے سپرد کرادیایااس معذرت خواہ کے عذر سے متاثر ہوکرایک بھائی کی محبت کا حق ادا کیا۔اس لڑکی کا نام عارفہ جعفری ہے جس کے والدین اور بھائیوں اوراعزاء نے میری زندگی کے خلاء کواپنی محبتوں سے بھرااور پہلی جسارت (اکتوبر۱۹۵۷) کے چھ سال بعد اپنی مسلسل کوششوں سے ۱۷رمئی ۱۹۶۳ کو ہمیشہ کے لئے ملادیا۔ان چھ سالوں میں بہت کچھ ہوا۔اس کو میں نے اپنی نظم کے ایک شعر میں اس طرح کہا ہے:

''بہت ہلکے ہلکے بہت دھیرے دھیرے اٹھے غیریت کے حجاب
جھجکتے جھجکتے لرزتے لرزتے غرض مانتے مانتے بات مانی
میرے پاس آکر حیا سے لجا کر ذرا مسکرا کر نگاہیں جھکا دیں
وہ اس کی ادائے خموشی کا عالم کو منہ چوم لے بڑھ کر جادو بیانی

کسی بہانے سے!

اگلے سال گرلس کالج کی جبلی تھی اور کالج نے بہت بڑا جشن منظم کیا تھا،اس جشن میں اساتذہ اور منتخب طلباء کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔دیکھتے دیکھتے کالج کا پنڈال یونیورسٹی کے طالب علموں سے بھر گیا،معلوم ہوا کہ اساتذہ کے صاحبزادگان والد صاحب کا دعوت نامہ لے کرآ گئے اور بعد میں والد صاحب اپنی استادی کے زور پر اندرآ گئے۔پھراندر والے طلباء نے اپنے دعوت نامے جمع کر کے ایک نمائندہ کو باہر بھیج دیا وہ ان دعوت ناموں کو ریسائیکل کر کے دوسری کھیپ اندر لے آئے۔اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس پروگرام کا ایک خاص حصہ لڑکیوں کا ڈبیٹ تھا جس کا موضوع بھی حقوق نسواں ہی تھا۔ممتاز آپا نے مجھے جج بنایا تھا لیکن پھر خود ہی انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر

برخواست کردیا: ''مجھے معلوم ہے تم کس کو انعام دے دو گے؟''

ڈبیٹ کے اختتام پر گرلس کالج یونین کی سیکریٹری تسنیمہ خاتون نے اعلان کیا: ''یہاں پر اسٹوڈنٹس یونین کے عہدے داران تشریف رکھتے ہیں، ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔''

اس بات پر ہماری صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمارے صدر آصف علی نے ہم سب کو اپنا فیصلہ سنا دیا: ''یہ یونین کے عہدیداران کی توہین ہے کہ انہیں بغیر پہلے سے اطلاع کے اس طرح تقریر کی دعوت دی جائے۔''

میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ یوں بھی میرا حسن زن تھا کہ جس سیکریٹری نے دعوت عام دی ہے شاید اسکے ذہن میں کوئی خاص آدمی ہو۔ اس لئے میں نے تالیوں کی گونج میں یونین اور یونیورسٹی کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا اور آصف علی کا غصہ مول لیا۔ لیکن اپنے اس اقدام کے لئے میرے پاس ایک عذر شرعی بھی تھا: میں یونین کا عہدیدار نہ تھا۔ اور اس جرأت سے میرا مقصد دل جوئی تھا جو کار ثواب ہے۔

۔ آصف علی کا الیکشن:

میرے لیے میدان صاف تھا مجھ پر پریشر بڑھ رہا تھا، مجھ سے سید آصف علی نے مشورہ کیا کہ اگر میں الیکشن لڑنے کا ارادہ نہیں کر رہا ہوں تو وہ صدارتی انتخاب میں امیدوار بننا چاہتے ہیں اور میرے تعاون کے خواستگار ہیں۔ میں نے نہ صرف ان کی تائید کی بلکہ ان کا چیف کنڈکٹر ہو کر ان کی کیمپین شروع کر دی۔ میرے اس عمل سے میرے احباب کو بہت مایوسی ہوئی۔ لیکن میں یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے اگر دستِ غیب سے علی گڑھ میں تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملا ہے تو میں اس کا پورا فائدہ اٹھاؤں۔

آصف علی سے فرسٹ ایر سے میری دوستی تھی۔ ان کے ساتھ بہت سے نیشنل ڈبیٹس میں شرکت کی تھی اور ٹرافیز جیتی تھیں۔ وہ اچھے مقرر تھے۔ احمد سعید انڈا کے بھانجے

تھے۔ کانپور سے تعلق تھا ان سے تعلقات بڑھے تو تعطیلات کے کچھ دن ان کے والدین کے گھر بھی گزارے تھے۔ ان کے والد گرامی امجد علی صاحب اور والدہ صاحبہ بہت شفقت ومحبت دکھاتے تھے۔ میں جب ۱۹۶۳ میں لندن پہونچا تو ان کے چھوٹے بھائی شرف علی نے اور ان کی اطالوی بیوی نے مجھ سے وہی معاملہ کیا جو وہ اپنے بڑے بھائی آصف علی سے کرتے۔ بہرحال آصف علی کی کیمپین دیکھتے دیکھتے شروع ہوگئی۔ اب معاملہ احمد سعید کے بھانجے کا تھا سو کمیونسٹ اینٹی کمیونسٹ کی تقسیم ختم ہوگئی بع

تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

آصف علی کے مقابلے میں جعفر مہدی تاباںؔ تھے۔ وہ شاعر مزاج آدمی تھے۔ یونین سے زیادہ سروکار نہ تھا۔ البتہ انہوں نے محرم کی چھٹی کم ہوجانے پر گاندھی جی کے اصول پر فاقہ کشی کی تھی۔ اہل تشیع کے لیے یہ معاملہ ان کے مذہبی حقوق میں دخل اندازی کے مترادف تھا۔ اہل سنت کے لیے سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی کا تھا۔ غرض اس معاملے پر کہ محرم کی تعطیلات فراغت سے ہوں شیعہ سنی اتفاق تھا۔ بھوک ہڑتال میں جب تاباںؔ صاحب کی جان کو خطرہ محسوس ہونے لگا تو یونین نے ہنگر اسٹرائیک کے مقاصد کی تائید میں زبردست جلسہ کیا جس میں خود ذاکر صاحب آکر شریک ہوگئے۔ تقریر میں احمد سعید نے جملہ بولا تھا جو زبان زد ہوگیا۔

''افسوس ہے کہ آج اس جامعہ میں ذاکر حسین ذکر حسین کو منع کرتا ہے۔''

ذاکر صاحب نے اس کا دوبدو جواب دیا۔ ''ذکر حسین کو ذاکر حسین منع کرنے کی جرأت کیسے کرسکتا ہے۔ ذکر حسین تو ہر روز ہونا چاہیے اس کے لیے کسی چھٹی کی ضرورت نہیں۔ چھٹی منانے سے زیادہ تعلیم پانے میں ذکرِ حسین کی روح ہے۔'' پھر ذاکر صاحب نے امام حسین کی زندگی اور مشن پر مدلل تقریر کی۔ وہاں سے وہ یونین ایڈمنسٹریشن کی بلڈنگ میں آکر تاباں میاں سے ملے۔ ان کی ہمت کی داد دی۔ ان کے جذبہ کی قدر کی پھر انہوں

نے کوئی وعدہ کیا یا جھاڑ پھونک کی تاباں صاحب نے نارنجی کے جوس پر روزہ افطار کرلیا۔

تاباں صاحب کا یہ عمل ان کو سیاسی میدان میں لے آیا لیکن آصف علی کے مقابلے میں ان کا یونین کا ریکارڈ کمزور تھا لیکن ان کو جتنے ووٹ ملے وہ اتنا بھی کمزور نہ تھا۔

سیکریٹری کے لیے شاہ عبدالقیوم صاحب اور افتخار عالم خان میں مقابلہ تھا۔ یہاں بھی یونین کی خدمات میں شاہ صاحب کا پلڑا بھاری تھا۔ افتخار عالم نے زندگی بھر جو سرسید کے بیرون خانہ اور اندرون خانہ پر جو تاریخی خدمات انجام دیں ہیں وہ ان کی اس ماضی میں شامل نہ تھا۔ اُس وقت وہ سچے پکے کامریڈ ترقی پسند، عظیم شاعر غلام ربانی تاباں کے بیٹے اور کمیونسٹ بھائی خان (اقتدار عالم خان) کے چھوٹے بھائی تھے۔ علی گڑھ کے کمیونسٹ ووٹ بینک کے چھ سو ووٹ کم وبیش ان کو سالِڈ مل گئے۔ مگر آصف علی اور شاہ عبدالقیوم کی فتح ہوگئی۔

آصف علی نے مجھے کہا کہ تم میرا خطبۂ صدارت لکھ دو میں نے ذوق وشوق سے خدمت قبول کرلی۔ اس طرح مجھے موقع مل گیا کہ میں ہندوستان، اسلام، علی گڑھ، اردو، ہندی ہندوستانی مسلمان ہندو پاکستان اور عالم اسلام غرض غازی وژن آصف علی کی زبان سے ادا ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آصف علی کو میری ہر بات سے اتفاق نہیں۔ لیکن وقت کی تنگی نے عبارت کے ردوبدل کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

حضرت مدنیؒ کا انتقال اور نورالدین صاحب پرووائس چانسلر سے ملاقات:

مولانا حسین احمد کا انتقال تاریخ دیوبند میں ہوگیا۔ مجھے رات سوتے وقت خبر ملی۔ میرے لیے یہ قومی المیہ ہی نہیں تھا بلکہ ذاتی ٹریجڈی بھی تھی۔ حضرت مدنی سے میرا تعلق خاندانی، مذہبی، سیاسی اور ذاتی تھا۔ جب سے آنکھ کھلی ان کو دیکھنے ملنے سننے اور ان کے کہے پر عمل کرنے کی سعادت حاصل رہی۔ حضرت مدنی تو اپنوں اور غیروں سب سے یکساں تعلق نبھاتے تھے لیکن مجھ کو لگتا تھا کہ جیسے مجھ پر خاص شفقت کی نظر تھی۔ بچپن میں حضرت کے گھر میں ریحانہ بی (صاحبزادی) اور رشید الوحیدی (پوتے) کے ساتھ کھیل کھیلتے تھے۔ ارشد

میاں اور ساجد میاں کو گود میں اٹھانا یاد ہے۔ حضرت کی بیگم کی شفقتیں بچپن سے اُس وقت تک ہمیں حاصل رہیں جب تک وہ معذور ہو کر صاحب فراش نہیں ہوگئیں۔ حضرت کی محفلیں، مولانا قاری طیبؒ صاحب کی محفلوں کی طرح میری پسندیدہ درسگاہیں تھیں۔

یہ افسوسناک خبر ملتے ہی میں آصف علی کے پاس پہونچا انہیں خبر سے باخبر کیا اور کہا کہ کل یونیورسٹی بند ہونی چاہیے اور یونین میں تعزیتی جلسہ منعقد ہونا چاہیے۔ آصف علی کے لیے مولانا بھی عام عالموں کی طرح ایک عالم تھے۔ اس لیے نہ یونین میں کنڈولینس میٹنگ کی ضرورت تھی نہ یونیورسٹی بند کروانے کی۔ ہم ابھی اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے ماموں احمد سعید (انڈا) اچانک وارد ہو گئے اور میری تائید پرجوش طریقے سے فرمانے لگے۔ آصف علی ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے احمد سعید صاحب نے فرمایا: ''چلو ہم دونوں نور الرحمٰن (پرووائس چانسلر) کے بنگلے پر چلتے ہیں۔'' زیدی صاحب موجود نہ تھے اور نور الرحمٰن صاحب پرووائس چانسلر تھے ان کی تجویز پر ہم دونوں نور صاحب کے بنگلے پر پہونچ گئے۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم پیدل ٹہلتے ہوئے آفتاب ہوسٹل سے نور الرحمٰن صاحب کے بنگلے کے دروازے پر پہونچے، وہاں ہو کا عالم تھا۔ اس زمانے میں وائس چانسلر پرووائس چانسلر اور یونیورسٹی کے عمائدین کی کوٹھیاں نہ اونچی آہنی چاردیواریاں رکھتی تھیں۔ نہ اندرونی دروازہ اور نہ اونچی چاردیواری سے گھر ہوتا تھا، نہ دروازے پر پولس کا پہرہ ہوتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ واپس چلو صبح پھر آئیں گے۔ احمد سعید صاحب نے فرمایا:

ع　　لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں

بڑھ کر دروازے کی گھنٹی پر انگوٹھا ٹیک دیا۔ اندرونی کوٹھی'' گھنٹیوں سے گونجنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ملازم آنکھ ملتا ہوا دروازے پر آیا اور اس نے دروازہ کھول کر جالی کے پیچھے سے سوال کیا: کون صاحب؟''

''ایک صاحب نہیں دو صاحب ہیں۔ احمد سعید سابق صدر اور عابد اللہ غازی

سابق سکریٹری پروائس چانسلر صاحب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔" احمد سعید نے دبنگ انداز سے مطالبہ کیا۔ ملازم دروازہ بند کر کے شاید نورالرحمٰن صاحب کو جگانے گیا۔ احمد سعید نے پھر گھنٹی کے بٹن پر میرے پروٹسٹ کے باوجود انگلی رکھ دی۔ میں نے احمد سعید کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے میں رات کے کپڑوں میں آنکھ ملتے ہوئے نورالرحمٰن صاحب دروازہ کھول کر جالی کے دروازے کے پیچھے تشریف لائے اور مجھ سے سوال کیا "غازی میاں کیا مسئلہ ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے؟ یہ کون سا وقت آنے کا ہے؟"

میں ابھی جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا احمد سعید صاحب نے جواب دینا شروع کر دیا: "یہ گفتگو کا کیا طریقہ ہے؟ کہ ہم باہر کھڑے ہیں اور آپ جالی کے پیچھے سے بات کر رہے ہیں یا آپ باہر آیئے یا ہمیں اندر بلایئے۔"

نورالرحمٰن صاحب نے گھبرا کر جالی کے دروازے کی چٹخنی کھولی اور ہمیں اندر بلا لیا اور صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اب احمد سعید صاحب نے قیادت سنبھال لی تھی اور کنڈولینس میٹنگ اور یونیورسٹی میں چھٹی کے کیس کو پوری شدومد سے پیش کیا۔ نورالرحمٰن صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "اس وقت اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا البتہ صبح آفس پہونچ کر میں آپ کی درخواست پر فیصلہ کرسکوں گا۔"

مجھے نورالرحمٰن صاحب کی بات وزنی لگی لیکن احمد سعید نے کھڑے ہو کر فیصلہ سنا دیا: "فیصلہ کا وقت اب ہے آپ اگر اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتے تو ہم بھی آپ کے فیصلہ کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم صبح خود یونیورسٹی بند کروا دیں گے۔"

میں نے نورالرحمٰن صاحب کی بات کو مزید سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن احمد سعید کھڑے ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے: "صبح یونیورسٹی بند ہے۔ ہم جانتے ہیں یونیورسٹی کیسے بند کرائی جاتی ہے۔"

میں اس صورت حال سے شرمندہ تھا اور احمد سعید صاحب کے فیصلہ کے بعد

معذرت کرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ ہم دونوں نورالرحمٰن صاحب سے مصافحہ کر کے نکلے تو میں نے احمد سعید صاحب سے پوچھا: ''آپ نے کہہ تو دیا کہ آپ اسٹرائیک کرائیں گے لیکن یہ سب کیسے ہوگا؟''

احمد سعید مسکرائے۔ ''تم نہیں جانتے یونیورسٹی کے حکام سے کیسے معاملہ کریں۔ دیکھنا صبح وہ یونیورسٹی بند کرادیں گے اور تعزیتی میٹنگ بھی کرائیں گے۔'' گویا ان کی رائے میں: ع دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔ واپس ہم آصف علی کے کمرے پر آئے وہ ہماری رپورٹ سننے سے زیادہ سونے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ بہر حال انہیں واقعات سے خبر دار کر دیا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ احمد سعید شاید اپنے کمرے چلے گئے یا یونیورسٹی میں گھوم گھوم کر یونیورسٹی بند کراتے رہے۔

تعزیتی جلسہ اور احمد سعید:

صبح آٹھ بجے نورالرحمٰن صاحب کے دفتر کے چپراسی نے مجھے ان کا خط لا کر دیا جس میں میرا شکریہ تھا اور یہ اعلان تھا کہ یونیورسٹی مولانا حسین احمد مدنی کی وفات کے احترام میں آج بند ہے اسٹریچی ہال میں تعزیتی جلسہ ہے اور عابد اللہ غازی تعزیتی قرارداد کے خاص مقرر ہیں۔ میں یہ خط پڑھ کر پھر لیٹ گیا کہ احمد سعید نو بجے آگئے اور فرمایا: ''سارا کام میں نے کروایا اور تقریر کے لیے تمہیں دعوت دی جارہی ہے۔ تم انکار کر دو اور میرے حق میں دست بردار ہو جاؤ۔'' میں نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا وہاں چل کر نورالرحمٰن صاحب سے بات کرلیں گے۔ مگر وہ مجھ سے فوری فیصلہ کرانا چاہتے تھے اور میں کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ میں حضرت مدنی کی زندگی اور خدمات کا پورا تعارف کراؤں احمد سعید کی معلومات حضرت مدنی کے بارے میں سرسری سے بھی کم تھیں۔ وہ ناراض ہوتے ہوئے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ ''اگر میری تقریر نہیں ہوگی تو دیکھتا ہوں تم کیسے تقریر کرتے ہو۔''

میں گیارہ بجے اسٹریچی ہال پہونچا تو ہال بھر چکا تھا۔ نورالدین صاحب نے مجھے

بھی بلا کر اسٹیج پر بٹھادیا۔احمد سعید غصہ سے بھرے حاضرین میں بیٹھے تھے۔ پروگرام میں چند تقاریر اور ریزولیوشن تھے۔میری تقریر میرے حضرت مدنیؒ کے متعلق زندگی بھر کے تأثرات اور تجربات پر مبنی تھی جو بہت زیادہ پسند کی گئی۔میں نے اس تقریر میں تحریک دار العلوم، تحریک ریشمی رومال، اسیرانِ مالٹا، جنگ آزادی میں مولانا کا کردار، ان کی ذاتی خانگی داخلی اور خارجی زندگی، خصوصی لمحات، عادات استقامت اور علمی تبحر غرض نصف گھنٹے کی یہ مربوط تقریر بہت دلچسپی اور مکمل خاموشی سے سنی گئی۔ چند جملے جو مولاناؒ کے کردار سے متعلق تھے میں نے کہے تھے یادداشت سے تحریر کررہا ہوں:

''ہم نے صحابہؓ کی سیرت پڑھی ہے اور ہم سوچتے تھے یہ صحابہ کیسے تھے؟ ان کا عمل کیسا تھا؟ ان کی سیرت کیسی تھی؟ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ان جیسے انسان بھی دنیا میں ہوسکتے ہیں۔لیکن جب ہم نے حضرت مدنیؒ کے ریاض، عبادات، اشغال اور افکار کو دیکھا تو یقین آیا کہ کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شخصیات کے پرتو آج بھی ہمارے سماج میں پائے جاتے ہیں۔حضرت مدنیؒ قدم بقدم سیرت طیبہ اور اخلاق صحابہ کا نمونہ تھے۔ زندگی کی جزئیات اور کلیات دونوں میں وہ سرتاپا متبع سنت تھے۔''

تقریر ختم ہوتے ہی احمد سعید نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھادیا لیکن نور الدین صاحب نے یہ کہہ کر اسے رد کردیا کہ تعزیتی میٹنگ بزنس میٹنگ نہیں ہوتی۔ اور جلسہ برخواست کردیا۔

اسٹوڈنٹ یونین۔مولانا کا تعزیتی جلسہ:

احمد سعید نے ہال میں میری تقریر کی تنقید میں اپنی تقریر شروع کردی کہ میں نے مولاناؒ کو صحابہؓ سے بھی آگے بڑھادیا۔انہیں میری تقریر میں توہین رسالت کا بھی پہلو نظر آیا۔ ان کی باتیں جسے لوگ مسکرا کر تھوڑی دیر سنتے اور آگے بڑھ جاتے۔احمد سعید یہاں سے سیدھے آصف علی کے کمرے پر گئے۔ اور یونین میں دوسری کنڈولینس کا نوٹس جاری

کرادیا۔یونین کی میٹنگ میں احمد سعید خاص اسپیکر تھے۔

میٹنگ تلاوتِ قرآن سے شروع ہوئی۔صاحب صدر نے احمد سعید صاحب کو تعزیتی قرارداد پیش کرنے اور تقریر کرنے کے لیے بلایا۔احمد سعید اب اختلاج کی کیفیت میں مبتلا تھے۔انہوں نے اپنی تقریر میں مولانا پر تنقید شروع کردی۔پھر انہوں نے مولانا مدنیؒ کا موازنہ مولانا مودودیؒ سے کیا اور مولانا مدنیؒ کو بہت کم نمبر دیئے۔سننے والے بھی حیران ہورہے تھے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اب پوائنٹ آف آرڈر کے لیے میرا نمبر تھا۔آصف علی نے مجھے موقع دے دیا اور اس موقع میں ہم نے وہ کام کیا جو ہمارے مخالف ہمارے خلاف کرتے رہے تھے۔اور ہم نے نہ اسے اپنے لیے جائز سمجھا نہ اس کا کبھی جواب دیا۔یعنی سیاست اور مصلحت کے لیے اسلام کو خطرہ میں ڈال کر ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔شاید یہ زندگی کا واحد موقع تھا جب میں نے اسلام کا پرچم بلند کیا اور ایمان کو خطرہ میں جان بوجھ کر ڈال دیا:

''جناب صدر معزز حاضرین! اسلامی اخلاق کی اور ہماری تہذیب کی متفقہ روایت ہے کہ ہم اپنے بزرگوں اور محسنوں کی خدمات کو ان کے انتقال کے بعد خراجِ عقیدت پیش کرتے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان کی خدمات کا احترام کریں اور ان کے تجربات سے اپنا مستقبل تعمیر کریں۔آپ حضرات اس بات کے شاہد ہیں کہ گذشتہ سال دوبار ہم یہاں اس مقصد کے لیے جمع ہوچکے ہیں اور ہم نے اسلامی تعلیمات اور علی گڑھ کی شاندار روایات کے مطابق کبھی کسی پر موت کے بعد تنقید نہیں کی۔آج پہلی بار اس عظیم یونین کی عظیم تر روایات سے ہم اعراض کرتے ہوئے حضرت مدنیؒ پر کھل کر تنقید کررہے ہیں۔افسوس ہے کہ آج ہم احمد سعید صاحب کو حضرت مدنیؒ پر ان کے شب وستم کے باوجود روکنے سے قاصر ہیں۔''

صدر صاحب تو ابھی میری بات سمجھنے کی کوشش میں تھے کہ یونین میں شیم شیم کے نعرے لگنے لگے۔اب احمد سعید صاحب نے بولنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا پیغام ہوٹنگ کی نذر ہو گیا۔تقریر جاری رکھنے کے لیے ان کی کوشش مزید جاری تھیں لیکن دو صحت مند کاشمیری نوجوانوں نے اور دوسرے حاضرین کی مدد سے انہیں یونین کے بیک ڈور سے باہر پھینک دیا۔احمد سعید یونین کے بادشاہ تھے کبھی ان پر کوئی حرف نہیں لا سکتا تھا۔آج وہ خود پر یہ نوبت لے آئے تھے۔

احمد سعید بے قابو:

جلسہ تعزیتی قرارداد کے بعد برخواست ہو گیا۔ہم لوگ رخصت ہو کر اپنے اپنے کمرے پر آ گئے۔آصف علی یونین میں اپنی صدارتی ذمہ داریاں سنبھالنے میں مشغول تھے کہ انہیں ان کے ماموں سعید نے جا لیا۔ماموں بھانجے میں کیا ہوا اس کی خبر نہیں لیکن یہ افواہ پھیل گئی کہ احمد سعید نے صاحب صدر کے تھپڑ مارا۔ہم آصف علی کی تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا وہ کانپور اپنے نانا جان سے ماموں جان کی شکایت کرنے چلے گئے۔یہاں بعض یونین کے اراکین نے بہت گفتگو اور غور وفکر کے بعد طے کیا کہ یونین احمد سعید کے اقدامات کی مذمت کرے اور صاحب صدر کی توہین پر یونیورسٹی سے مناسب اقدامات کرنے کی درخواست کرے۔

ادھر احمد سعید دن رات بے تکان گفتگو کر رہے تھے اور ان کی زبان کے ساتھ ساتھ ذہن کی حالت بھی بگڑ رہی تھی۔وہ واضح طور پر ڈیپریشن کا شکار نظر آ رہے تھے۔ایک شام میرے کمرے پر تشریف لے آئے۔چہرے پر ہوائیاں تھیں،سانس اکھڑی اکھڑی تھی۔انہوں نے کہا تم سے بہت ضروری بات کرنی تم میرے ساتھ کیفے ڈی پھونس چلو، میں چائے پلاؤں گا اور انڈا کھلاؤں گا۔میں تیار نہ تھا لیکن ان کے اصرار پر روانہ ہو گیا ساتھ ہی میں چاق وچوبند بھی رہا کہ ان کی کیفیت نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

ہم آفتاب ہوسٹل سے کیفے ڈی پھونس کی جانب روانہ ہو کر انگلش ڈیپارٹمنٹ کے قریب پہونچے تھے کہ احمد سعید کی زبان لڑکھڑانے لگی اور انہوں نے کچھ مبہم سے جملے کہے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سامنے کی جھاڑیوں سے کچھ لوگ اچانک نمودار ہوئے۔ میں پورے پلان کو سمجھ گیا۔ میں نے احمد سعید کے چہرے سے ان کا چشمہ نوچا اور واپس آفتاب ہوسٹل کی طرف بھاگا۔ میری خوش قسمتی سے اسی وقت چند لوگ راستے سے گذرے اور ایک رکشا نے ان کا راستہ روک دیا۔ میں صحیح سالم اپنے کمرے پر پہونچ گیا۔ احمد سعید صاحب کا چشمہ میں نے آفتاب ہوسٹل کی جھاڑی میں پھینک دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں احمد سعید پھر میرے کمرے پر وارد ہو کر معذرت کرنے لگے۔ جیسے اس واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے ان کی بزرگی اور سینیرٹی کے باوجود بہت کچھ سخت سست کہہ دیا اور وہ بہت لجاجت سے اپنا چشمہ مانگتے رہے۔ مجھے کھانے پر لے جانے کی دعوت دی۔ بالآخر میں نے ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے جھاڑی سے چشمہ کو بازیافت کر دیا۔ دو دن بعد یونین کی میٹنگ احمد سعید کے، صاحبِ صدر کے تھپڑ مارنے کی مذمت میں تھی۔ مجھے یونین کے ذمہ داروں نے وارن کر دیا تھا کہ میں یونین میں نہ آؤں۔ بلکہ اپنے کمرے پر بھی نہ ٹھہروں۔ پراکٹوریل اسٹاف کو بھی واقعات کی نزاکت کی خبر کر دی گئی تھی۔

یونین کے جلسۂ ندامت کی صدارت قمر الزماں صاحب سینئر کیبنٹ نے کی۔ ابھی قرارداد پر گفتگو جاری تھی۔ چند لوگوں نے قمر الزماں صاحب پر عابداللہ غازی سمجھ کر حملہ کر دیا۔ وہ زخمی ہو گئے۔ سر سے خون جاری تھا۔ پراکٹوریل اسٹاف نے انہیں ہسپتال پہونچایا۔ اور احمد سعید کو اپنی حراست میں لے لیا۔ رات ہی میں وائس چانسلر صاحب کے مشورے کے بعد انہیں کانپور روانہ کر دیا گیا۔

دوسرے دن پوری یونیورسٹی میں تہلکہ تھا۔ اب سب کا اتفاق ہو رہا تھا کہ احمد سعید کو یونیورسٹی بدر کر دیا جائے اور ان کی یونین کی ماضی کی خدمات کو مٹا دیا جائے۔ احمد

سعید سے ہمارا رشتہ فرسٹ ایر سے شروع ہوا تھا۔اب جو کچھ ہو رہا تھا اس کے عواقب کا شاید انہیں بھی اندازہ نہ تھا۔کسی کو ہو نہ ہو مجھ کو جو کچھ ہو رہا تھا اس کا افسوس ہو رہا تھا۔یونیورسٹی سے انکار یسٹیکیشن ہو گیا۔یونین کے افراد مزید اقدامات کو سوچ رہے تھے کہ یونیورسٹی کو ان کے والد کی طرف سے تار ملا جس میں احمد سعید سلمہٗ کے انتقال پر ملال کی خبر تھی۔یونیورسٹی نے ان کا نمبر ملایا تو کوئی صاحب فون اٹھا کر بند کر دیتے تھے۔

اس خبر نے پوری یونیورسٹی میں افسوس، صدمہ اور غصہ کی فضا پیدا کر دی وہ لوگ جو یونین کے ذمہ دار تھے اور میں جو ان واقعات کا کسی حد تک ذمہ دار تھا ہر ایک کی زد پر تھے۔اب طلباء کی بڑی تعداد تعزیتی سائرن بجانے پر مصر تھی۔ادھر بہت سے عقیدت مند یونین میں جمع ہو کر تعزیتی جلسہ کرنا چاہ رہے تھے۔خود بشیر حسین زیدی صاحب (وائس چانسلر) طلباء کے غصے کی زد پر تھے۔میرے لیے راستہ چلنا مشکل تھا۔یونیورسٹی نے فوراً پراکٹوریل ڈیپارٹمنٹ کے کسی ذمہ دار آفیسر کو کانپور بھیج دیا۔اگلے روز وہ احمد سعید کی صحت مندی کا پیغام لایا۔اب یونین کے ارباب کی باری تھی۔انہوں نے احمد سعید کی مذمت کا کام اور زیادہ زور شور سے شروع کر دیا۔

آصف علی اس دوران خود کانپور میں غائب رہے۔واپس آئے تو یونین کا آٹھ سالہ احمد سعید کا دور بہت افسوس ناک طریقے سے ختم ہو چکا تھا۔احمد سعید سے ذاکر صاحب، اساتذہ طلباء کو بہت توقعات تھیں۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ با۔!

میں جولائی ۱۹۵۱ میں علی گڑھ جب پہلی بار آیا تو احمد سعید یونین کے سیکریٹری تھے اور صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار تھے۔ان کا بلا مقابلہ طوطی بول رہا تھا۔لیکن بعض باتوں میں حد سے گذر جانے کی وجہ سے وہ شاہ عنایت حسین سے الیکشن ہار گئے تھے۔پھر اگلے سال ۱۹۵۵ سے میں وہ محمد امین بلبلیا کے مقابلے میں الیکشن جیتے۔اپنی صدارت کے بعد وہ کنگ میکر بنے رہے۔یونین ان سے چھوٹے نہیں چھوٹی تھی۔اول اول وہ علی گڑھ کے پاکستانی ذہن کے نمائندہ تھے۔پھر وہ قوم پرست بنے اور اعلان کیا کہ وہ ایک دن

ہندوستان کے سفیر بن کر محبت کا پیغام لے کر پاکستان جائیں گے۔وہ جامعی تھے۔ ذاکر صاحب کو ان سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کی بہت سی توقعات تھیں۔ ان کی مجبوری یونین تھی جو کمبل بن کر ان کو لپٹی رہی بالآخر اسی یونین کی بدولت انہیں بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔ان کے والد نے انہیں تنگ آ کر پاکستان بھجوا دیا۔ وہاں وہ کسی بھی علیگس کی اکٹو یٹی میں شریک نظر نہیں آئے۔ان کی شادی اسی علی گڑھ کی مسماۃ سے ہوگئی تھی اور ماشاءاللہ اولاد ہوئی۔میں پاکستان جب بھی گیا ان سے ملنے کی کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔

میں امریکہ سے رمضان میں عمرہ کے لیے گیا تھا۔ مسجد نبوی میں میں معتکف تھا۔ میرے ساتھ ذکی نامی کراچی کے ایک نورانی دیندار شخص معتکف تھے۔ان سے ذکر ہوا تو معلوم ہوا وہ کانپور کے مجیدی خاندان کے فرد میں ہیں۔ان سے احمد سعید صاحب کا احوال پوچھا تو فرمایا۔''وہ میرے چھوٹے بھائی تھے۔چند ماہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔وہ زیادہ تر اختلاج قلب کے مریض رہے۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اعتکاف اور اس کی دعائیں احمد سعید کی نذر ہو گئیں ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یونین اور علی گڑھ کی زندگی کا تصور احمد سعید کے بغیر ممکن نہیں۔ایک زمانے تک وہ اسٹوڈنٹ یونین تھے،اسٹوڈنٹ یونین احمد سعید تھی۔

علی گڑھ نے اپنے بہت سے ہونہار سپوت پاکستان کو بھینٹ چڑھا دئے۔علی گڑھ میں وہ لوگ پاکستان تحریک سے پیچھا نہ چھڑا سکے، پاکستان جا کر ہجرت کے داغوں کو دل سے نہ دھو سکے،اب وہ نسل بھی پاکستان میں معدوم ہوتی جا رہی ہے ع

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

آج کا علی گڑھ نہ تو ماضی کا علی گڑھ ہے نہ اس کے پاس شاید کوئی مستقبل کا خواب ہے۔ مسلمان کو مزاجاً ہنگامی سیاست چاہیے۔ پاکستان ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔اب علی گڑھ خموشی ہی خموشی ہے ع

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

علی گڑھ میں ساتواں سال

ایم.اے

مئی - جولائی ۱۹۵۸

تعطیلات موسم گرما

پاکستان کا سفر:

1957-58 کا سال ہر لحاظ سے میرے لئے تاریخی سال تھا۔اس سال میرے اوپر یونین کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔آصف علی مشوروں میں شریک کر لیتے تھے اور ہم اس کام میں بخل نہیں کرتے تھے۔افغانستان کے خاندان سے کبھی کبھار کا قلمی رشتہ تھا۔خاص طور پر چچا قاری حمید میاں انصاری (جو ابا جان کے سگے چھوٹے بھائی تھے) مجھ سے باقاعدہ رابطہ رکھتے تھے۔وہ بھی میری طرح تنہا تھے۔انہوں نے اپنے والد،مولانا محمد میاں منصور انصاری کے انتقال (۱۹۴۶) کے بعد سے اپنی سوتیلی والدہ اور دو بھائیوں اور دو بہنوں کی کفالت کی اور خود شادی نہ کی۔

مجھے ایک خط میں انہوں نے ابا جان اور پھوپھی جان اور پورے خاندان کے ساتھ افغانستان آنے کی دعوت دی تھی۔اور میں اب ان کی دعوت کی قبولیت کے لئے کوشاں تھا۔ہماری صاحب استقامت دادی صاحبہ حفصہ بیگم نے چھوٹے بیٹے حمید میاں کو باپ کی خدمت کے لئے سینے پر پتھر رکھ کر ۱۹۳۶ میں افغانستان بھیج دیا تھا۔چچا میاں نے ماں کی وصیت اور باپ کی خدمت کا عمر بھر حق ادا کیا۔اور ۱۹۴۶ء میں ان کے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی سوتیلی والدہ اور دو بھائی اور دو بہنوں کی پرورش کرنے میں عمر گزار دی۔میرے دل و دماغ میں ابھی تک ۱۹۳۹ء افغانستان کے سفر کے نقوش تازہ تھے۔

ادھر پاکستان سے میرے کزن مولانا احمد میاں صابری (بھائی جان) مستقل خط لکھ لکھ کر پاکستان بلا رہے تھے۔میں نے سوچا کیوں نہ آنے والی گرمیوں میں پاکستان اور

افغانستان کا سفر کروں۔جس قدر ارادہ آسان تھا اسی قدر وسائل دشوار تھے۔لیکن میں نے جب ارادہ کرلیا تو پھر وسائل کو بھی مہیا کرنے کی کوشش آسان ہوئی۔اس زمانے میں پاسپورٹ ملنا آسان نہ تھا۔اور پاکستان کا پاسپورٹ دشوار تر تھا۔کسی وزیر کی سفارش یا کسی پارلیمنٹ کے ممبر کی ضمانت ضروری تھی۔ابا جان کی مدد سے جنرل شاہنواز خان کی سفارش اور دستخط سے یہ کام ہوگیا۔ویزا کے لئے افغانستان سے اجازت کی ضرورت تھی جو چچا میاں نے دوڑ بھاگ کر کے مہیا کی۔پاکستان کا ویزا بھی آسان کام نہ تھا۔پاکستان کے سفارت خانے کے سامنے کئی دن مورچہ بند رہنا پڑتا تھا جو گرمیوں میں غیر معمولی طور پر صبر آزما ہو جاتا تھا۔جامعہ ملیہ میں پاکستانی سفارت کے چھوٹے ملازمین کے بچے پڑھتے تھے۔ (بڑے ملازمین کے بچے پبلک اسکول جاتے تھے) ان کی مدد سے ویزا مل گیا۔

پاکستان روانگی: خاندان مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

میں نے خاص خاص اعزاء کو پاکستان اور افغانستان میں خط لکھ دیئے بھائی جان نے لکھا تم لاہور میاں آفاق انصاری (ہم دونوں کے کزن) کے گھر پہونچ جاؤ تو باقی اخراجات کا انتظام میں کردوں گا۔اس دور میں (اور اس دور میں بھی) ہندوستان پاکستان میں ترسیل زر کا باقاعدہ سلسلہ نہ تھا۔لاہور پہونچنے کے لئے کم از کم تیس روپے درکار تھے۔ ابا جان نے کہیں سے پچاس روپیہ کا انتظام کرادیا، لاہور کے اعزاء نے درخواست کی تھی کہ میں پان، کیلے اور لکس سوپ ضرور لاؤں۔اتنی رقم کرائے اور تحائف کے لئے کافی تھی۔

میں بذریعہ ٹرین روانہ ہوا اور لدھیانہ میں کیا دیکھتا ہوں عزیز الرحمٰن لدھیانوی صاحب ابن رئیس الاحرار (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی) اپنی فیملی کے ساتھ ٹرین میں فیملی کو بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔مجھے دیکھ کر نہال ہو گئے اور فرمایا: ''تمہاری بھابھی بچوں کے ساتھ پاکستان جا رہی ہیں خیال رکھنا۔'' میں نے ان سے وعدہ کرلیا مگر معلوم یہ ہوا کہ معاملہ برعکس تھا۔بھابھی صاحبہ نے نہ صرف میرا خیال رکھا بلکہ امرتسر اور پاکستان کے

دونوں کسٹموں پر انہوں نے کسٹم آفیسر کے کان میں اپنے برقعے میں سے کچھ فرمایا اور ان کا اور میرا دونوں کام ہوگیا۔ ہندوستان میں آفیسر نے پرنام کیا اور پاکستان کے آفیسر نے سلام کیا اور ہم صاف نکل گئے۔ بھابھی صاحبہ نے بعد میں بتایا کہ لدھیانہ کے کسٹم آفیسر سردار جی کو انہوں نے بتایا کہ وہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی بہو ہیں تو اس نے بجائے سامان کھولنے کے بارڈر کراس کرانے تک ساتھ دیا۔ اور پاکستان میں انہوں نے مولانا انیس لدھیانوی کا نام لیا تو پاکستانی آفیسر نے بعینہ وہی معاملہ کیا جو امرتسر میں سردار جی نے کیا تھا۔ علماء لدھیانہ کے خاندان نے جس خلوص کے ساتھ اسلام اور وطن کی خدمت کی تھی یہ اس کا اثر تھا۔ شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے:

نام نیک پیش گاں ضائع مکن

تا بماند نام نیکت برقرار

رئیس الاحرار کے نیشنلسٹ خیالات کو مسلمانوں نے تو تسلیم نہ کیا لیکن ان کی حب الوطنی کی قدر ہندوؤں اور سکھوں نے کی۔ پنجاب کی تقسیم کے بعد پنجاب میں جس طرح کشت وخون کا وحشیانہ بازار گرم ہوا اس کی کوئی مثال نہیں۔ وہ خود ہی اپنی مثال بن گیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس قیامت کی گھڑی میں خاندان سمیت پاکستان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا وہ دہلی لوٹ آئے۔ دہلی میں ان کا قیام کوچہ رحمٰن میں رہا۔ ان کے ایک صاحبزادے پاکستان میں ہیں اور وہاں اپنے خاندانی ورثے تعلم وتعلیم سے وابستہ تھے ان کی اولاد بھی اب تعلیمی مشاغل میں مشغول ہے۔ مولانا کی اولاد نے واپس پنجاب جا کر دوبارہ مسلمانوں کی اور مساجد کی آبادکاری میں بہت حصہ لیا تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں میں اس خاندان کی جو عزت تھی اس کی وجہ سے مسلمانوں کی اور مساجد کی آبادکاری کے کام میں بہت معاونت ہوئی۔ اور آج بھی ان کے خاندان کا ایک حصہ لدھیانے کے آبائی گھر میں مقیم ہے۔ میرا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے

جامعی صاحبزادے عزیز الرحمٰن لدھیانوی سے بہت بہت گہرا ذاتی تعلق رہا ہے۔

لاہور میں آمد: بھائی آفاق احمد اور بھابی بی بی

پاکستان میں ٹرین سے اترتے ہی سوداگروں نے گھیر لیا۔ بہت سے لوگ جو سامان ہندوستان سے لائے تھے اسے فروخت کر کے نقد لینے لگے۔ مجھے کیش کی سخت ضرورت تھی لیکن میں نے بمشکل سوداگروں کی دستبرد سے خود کو بچایا۔ تانگہ لے کر سمن آباد بھائی آفاق کی کوٹھی پر پہونچا جہاں ان سے اور ان کی بیگم (بھابی بی بی) سے ملاقات ہوئی۔ بھابی بی بی بھائی آفاق کی پہلی محبت اور تیسری بیوی تھیں۔ ان کے عشق و محبت کی کہانی بہت دلچسپ اور طویل ہے۔ اس کا ذکر میں اپنے مضمون ''آپا جان: عباسیہ بیگم'' میں کر رہا ہوں بشرطیکہ وہ مضمون مکمل ہو پائے۔

بھائی آفاق کی یہ بیگم ان کی بہن عباسیہ کی نند تھیں۔ ان کی پہلی شادی ان کے کزن بنے میاں سے ہوئی تھی اور بھائی آفاق کی شادی بی بی کی خالہ زاد بہن رابعہ سے ہوئی۔ مدتوں بعد بی بی نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی اس عرصہ میں بھائی آفاق نے اپنی بیگم رابعہ کو طلاق دے کر خاندان کی ایک اور لڑکی شمشی سے شادی کر لی۔ پھر اسے طلاق دے کر بی بی سے شادی کر لی اس شادی سے خاندان میں بہت بڑا تنازعہ پیدا ہوا لیکن لڑکپن کا عشق رنگ لا کر رہا۔ اس عشق نے محبت کے رنگ میں بھنگ ہونے کی پرواہ نہیں کی۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بھائی آفاق کے دفاتر پرانی انارکلی میں تھے۔ گھر میں ان کے پھوپی زاد بھائی سلیم ریاض بھی رہتے تھے جو تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھائی آفاق کے ہاں اعزاء احباب اور اقربا کی چہل پہل رہتی تھی۔ لاہور میں

ایک ہفتہ قیام میں بہت سے اعزاء اقربا سے ملاقات کی۔ پنجاب یونیورسٹی جا کر محترم شیخ رشید صاحب (سابق صدر شعبۂ تاریخ) ملاقات کی۔شیخ صاحب نہ ہمارے استاد رہے تھے نہ پرودوست لیکن ہمارے زمانے کے عزیز استاد تھے۔علی گیرین کے لئے اتنا رشتہ عقیدت مندی کے لئے کافی تھا۔اس ملاقات نے قیام لندن میں بہت سی ملاقاتوں کی بنیاد ڈالدی۔

بہاولپور کا سفر:

اب اگلا سفر بہاولپور تھا۔ مجھے بھائی آفاق اور اعزاء سے خوب پیسے ملے۔ میں نے آسانی سے بہاولپور کا ٹکٹ خریدا۔ وہاں محلہ عام خاص میں ابھی تک اسی طرح خاندان رہتا تھا جیسا میں ۱۹۴۵ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں اب پردہ کی حدود میں تھا اس لیے مجھ سے پردہ میں شدت آ گئی تھیں۔ میرا قیام باہر مردانہ بیٹھک میں تھا اور خاص خاص وقت پردہ کے اہتمام کے بعد گھر میں بلایا جاتا تھا۔

ابا جان کے بڑے ماموں مولانا فاروق احمد صاحب (ابن مولانا صدیق احمد) ان کی بیگم، منجھلی بیٹی سیدہ اور داماد اسرار احمد اور بہت سے اعزاء اقربا وہاں مدتوں سے خیمہ زن تھے۔ ابا جان کے چھوٹے ماموں مولانا شفیق صاحب اور ان کا پورا خاندان بھی وہاں بوہڑ دروازے پر ہندوستان سے آ کر آباد ہو گیا تھا۔ میں بہاولپور میں رہ چکا تھا، خوب خاطر مداراتیں ہوئیں۔ ابا جان کے چھوٹے ماموں مولانا شفیق احمد صاحب نے میری آمد کی خبر سن کر خاموشی سے پیسے جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس بار انہوں نے اپنے قرآن کے جزدان کی جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال عطا فرمایا۔ اور کہا: ''میں نے تمہارے باپ حامد میاں کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہا ہے اور تم کو اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں پر ترجیح دی ہے۔'' ان کے یہ فرمانے میں جس قدر سچائی تھی میں اس کو ہمیشہ سے محسوس کرتا رہا ہوں۔ ماموں شفیق نے گڑھی پختہ میں بھی ایک روپیہ بیگم سے چھپا کر دیا تھا جس پر گھر میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مفلسی میں آٹا گیلا کی زد میں میں بے قصور آ گیا۔ اس کا ذکر گڑھی پختہ کے ذکر میں آ چکا ہے۔

بہاولپور کی گلیوں میں خوب چکر لگا کر ماضی کی یادوں کو تازہ کیا۔ بے روح درودیوار بھی پرانے تعلقات کی طرح تازہ اور زندہ ہو جاتے ہیں۔ جامعہ عباسیہ کی بلڈنگ کی زیارت کی۔ جہاں ہم نے مولانا فاروق احمد صاحب سے کریما کے سبق پڑھے تھے۔

بہاولپور میں پولس رپورٹ کے لئے تھانہ پہونچا تھا تو آفس میں بہت سی کرسیاں خالی تھیں میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آفیسر مجھے بیٹھنے کے لئے کچھ فرمائے گا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولدیں اور غصہ سے کہا: ''کھڑا ہو جا تینوکس نے بیٹھنے کے لئے کہا تھا؟'' میں نے عرض کیا، ''میں نے آپ کے حکم کا انتظار کرنے کے بعد ہی خود کو کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔'' وہ میری بات نہیں سمجھا اور مجھے اٹھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''میں نے کب تینوں آنے کی دعوت دی سی۔''

میں نے عرض کیا: ''ہم آپ کے ملک میں پہونچے ہیں اور آپ کے مہمان ہو گئے۔ آپ دعوت دینے کی زحمت کریں یا نہ کریں۔'' انہوں نے فرمایا: ''میں نے کوئی نوتہ نہیں بھیجا سی تو کرسی چھوڑ اور کھڑا ہو جا۔'' میں کھڑا ہو گیا تو فرمایا: ''ادھر بیٹھ۔'' میں نے انکساری سے عرض کیا ''بیٹھا تھا تو اٹھایا کیوں تھا؟ اور اب اٹھایا ہے تو بٹھاتے کیوں ہو؟'' انہوں نے غور سے مجھے دیکھا اور کہا: ''اب ادھر ہی تسی رہنا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''میں کسی زمانے میں یہاں قیام پزیر تھا لیکن بعض حوادثات نے مجھے وطن پہونچا دیا۔ اب میرا ارادہ ترک وطن کر کے مہاجر بننے کا نہیں ہے۔''

''لا پاسپورٹ''

میں سمجھا تھا وہ میرے جواب سے خوش نہ ہوگا کہ میں دار الاسلام کو چھوڑ کر کیوں ''دار الحرب'' میں رہنے کو ترجیح دے رہا ہوں مگر اس نے میری خوش فہمی دور کردی: ''اچھے سب لوگ یہی کہتے ہوئے آندے ہیں۔ پھر واپس نہیں جاندے'' میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس نے نیم رضا سمجھتے ہوئے اندراج کر کے پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں

شکریہ ادا کر کے باہر نکلنے لگا تو اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ مجھ اس کے طرز عمل میں وہ کشمکش نظر آئی جو کچھ عرصہ بعد واضح ہو کر سامنے آئی۔ اہل پنجاب وسندھ نے تقسیم کے وقت ہندوستان سے آنے والے پناہ گزینوں کو دل اور گھروں میں جگہ دی تھی لیکن آہستہ آہستہ زبان وتہذیب کی خلیج بڑھ رہی تھی۔ یہ عمل فطری تھا مذہبی جذبات متعدد بار دوسرے فطری جذبات کے مقابلے میں بعض اوقات زیادہ مؤثر ہو جاتے ہیں لیکن زبان، تہذیب، رنگ، نسل کے اثرات بھی قوموں کی زندگی میں اتنے ہی اہم ہوتے ہیں کہ وہ اکثر مذہب کو نظر انداز کر کے کشت وخون کرا دیتے ہیں۔ صرف مذہب پر اتحاد کی بنیاد پر کوئی اتحاد پائیدار نہیں رہ سکتا۔ پاکستان تحریک نے جس وحدت کلمہ پر قومیت کی بنیاد رکھی تھی بعد میں جذبات نے انھیں سرد کر دیا اس لئے تکثیری معاشرے میں وحدت پیدا نہ ہو سکی۔

مذہب ہمیں کوئی بھی سبق پڑھا رہا ہو تاریخ ہمیں دوسرا ہی سبق پڑھا رہی ہے۔ یہ کہنا ساری دونیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ساری دنیا کے مذاہب دوسری قوم، اصل حقائق اور محکماتِ زندگی سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ پاکستان تحریک اسکے قیام اور نظام میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ لیکن اس سے سبق کسی نے حاصل نہیں کیا۔

ہارون آباد:

بہاولپور سے میں بذریعہ بس ہارون آباد کے لئے روانہ ہوا۔ بس کے کنڈکٹر نے مجھے ٹکٹ اور ریز گاری اس طرح اچھال کر دی کہ میرے ہاتھ اس کو دبوچنے کے لئے اس تک نہ پہونچ سکے۔ اس پر سب لوگوں نے قہقہہ لگایا اور اس کے اٹھانے میں میری مدد کی۔ ہارون آباد پہونچا تو وہاں بھی پردے کا سامنا تھا۔ بھابی جان (بنت مولانا فاروق احمد صاحب) نے پردہ نہیں کیا لیکن ان کی صاحبزادی شمیمہ بی نے پردہ کر لیا۔ دوسرے دن ہماری بڑی پھوپی ذکیہ (بنت مولانا فاروق احمد) اپنے پردہ دار لڑکیوں کے ساتھ مجھ سے مزید ملاقات کے لئے بہاولپور سے تشریف لے آئیں اور مجھے اس مختصر سے گھر سے جلا وطن

ہونا پڑا۔میرا قیام ابا جان کے رشتہ کے چچا افتخار کے گھر میں ہوگیا۔میں جس گھر اور محبت کی تلاش میں پاکستان پہونچا تھا وہ مجھ سے گریزاں تھی۔

اس درمیان میں پھر پاسپورٹ کے رجسٹریشن کے مرحلے سے گزرنا تھا اور بہاولنگر کے پولس اسٹیشن جانا تھا۔ہارون آباد اور بہاد نگر کا فاصلہ بس سے ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ گرمی شدید تھی، بھائی جان ساتھ نہ جاسکے میں گرتا پڑتا پولیس اسٹیشن پہونچا وہاں چند اور وزیٹر بھی کھڑے تھے۔سب سے آگے ایک سردار صاحب تھے جو اپنے پرانے پڑوسیوں کی دعوت پر پاکستان پہونچے تھے۔ان سے سوال وجواب جس طرح ہو رہے اس سے لگتا تھا وہ ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان نہیں جاسوس ہیں۔یہ سلسلہ مجھے ناگوار ہو رہا تھا اور میرے اندر کے علی گڑھ نے آفیسر صاحب سے یہ کہنے کی جرأت دلا دی کہ ''پہلے ان کو بیٹھنے کی دعوت دیجئے پھر مزید سوالات کیجئے۔'' وہ آفیسر برہم ہوگئے اور انہوں نے برا بھلا کہہ کر مجھ سے کہہ دیا کہ میں تیرا اندراج نہیں کروں گا۔کل آنا۔میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ واپسی کے علاوہ نہیں تھا۔اسی گرمی میں میں بے نیل ومرام ہارون آباد واپس ہوا اور دوسرے دن پھر سفر کر کے بہاولنگر پہونچا تو معلوم ہوا اس دفتر کی اتوار کی چھٹی ہے۔پھر واپسی ہوئی۔ اب ہمت جواب دے رہی تھی۔

رات میں بھائی جان ہارون آباد کے کسی مقامی آفیسر کے پاس لے گئے جن کا تعلق راجستھان سے تھا۔انہوں نے میری بات سننے سے پہلے ان کے ساتھ مہاجر ہونے کی وجہ سے جو زیادتیاں ہو رہی تھیں اس کی داستان بیان کیں۔دوسرے دن انہوں نے اپنے کسی ماتحت کو کسی آفیسر کے نام خط دے کر میرے ساتھ بہاولنگر بھیجا۔حسن اتفاق سے اس دن کوئی دوسرا آفیسر ڈیوٹی پر تھا۔اس نے خاص سوال جواب نہیں کیے۔میں اپنی زبان پر کنٹرول کیے مؤدبانہ کھڑا رہا اور اس نے اندراج کر دیا۔

بہاولپور اور بہاولنگر کے تجربات کے بعد میں بددل ہو کر ہندوستان واپس جانے

کے لئے تیار تھا۔ بھابی جان سے میں نے کہا: ''میرا پاسپورٹ دے دیجئے۔'' انہوں نے فرمایا: میں نے چولہے میں جلا دیا۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہیں یہاں رہنا ہے۔ تمہارے بھائی نے تمہارے لئے کوارٹر خرید رکھا ہے اور زراعتی زمین کے پلاٹ ٹنڈو محمد خان میں الاٹ کرائے ہیں۔'' میں نے کہا میں کسی قیمت پر یہاں نہیں رہ سکتا پھر مجھے واپس جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ اب مجھے کراچی جا کر دوسرا پاسپورٹ بنوانا ہوگا۔''

میری پریشانی کو دیکھ کر بھابی جان نے مسکرا کر فرمایا: ''تمہارا پاسپورٹ میرے پاس محفوظ ہے تمہیں اس شرط پر واپس کردوں گی کہ تعلیم ختم کر کے اپنے گھر واپس آؤ۔'' ہماری بھابی جان ابا جان کی ماموں زاد بہن بھی تھیں۔ والدہ کے انتقال کے وقت ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور منجملہ اور عورتوں کے والدہ نے ان سے بھی خصوصیت سے میرا خاص خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔ ان کی غیر معمولی محبت نے میرے لئے والدہ کی رحلت کے غم کو کچھ ہلکا کر دیا تھا ان کے ساتھ فقیر والی اور بہاولپور میں قیام نے مجھے اپنا گھر عطا کر دیا تھا۔ لیکن میں اپنے وطن کو اپنے گھر پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میں نے لاہور پہونچ کر اپنی پھوپی جان محمودہ بیگم (ابا جان کی فرسٹ کزن) کو کراچی خط لکھ کر اپنی آمد کی خبر دی تھی اور پھر اس کا جواب مجھے ہارون آباد میں ملا۔ جواب چچا محامداللہ کی طرف سے تھا انہوں نے تحریر کیا تھا کہ: ''میرے، بھائی صاحب (حمداللہ انصاری) کے اور آپا جان (محمودہ بیگم) کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ ہم آپ کی مہمانداری کی ذمہ داری قبول کریں۔ آپ اپنا انتظام کر کے کراچی آئیں ہم سے کوئی امید نہ رکھیں۔''

ان کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا میں پڑھ کر خاموش رہا لیکن بھائی جان نے اسے دعوت سمجھا۔ بھائی جان نے خوش ہو کر کہا: ''بھئی اب تو چچا کا دعوت نامہ بھی مل گیا اب کراچی چلنا ضروری ہوگیا ہے۔'' میں نے ان سے چچا صاحب کے جواب کے بارے میں کچھ بھی نہ کہا۔ انہوں نے میری خاموشی کو نیم رضا سمجھا۔

ہماری ہاروں آباد پہونچتے ہی مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی کے مہتمم مولانا فضل محمد صاحب تشریف لے آئے تھے اور مدرسہ آنے کی پر جوش دعوت دے گئے تھے۔ادھر ہر روز ان کا پیغام آرہا تھا کہ: ''کس روز آؤ گے مہمان ہو کر۔'' کراچی سے پہلے بھائی جان فقیر والی لے گئے۔فقیر والی کی زندگی ماضی کے سفر کی داستان میرے مضمون ''فقیر والی۔داستانِ حیات کا ایک ورق'' میں آچکی ہے اس وقت تفصیل کی ضرورت نہیں۔دراصل میرے فقیر والی کے قیام کی پرانی یادیں اساتذہ کی شفقتیں، زندگی کی سادگی، مزاج کی بےلوثی، ایسی باتیں جو زندگی کا سرمایہ تھیں ان کی تجدید ہوگئی۔اور یہ ملاقات نئی اور خوش گوار یادوں کا تحفہ دے گئیں۔

ٹنڈو محمد خان:

ہم بھائی جان کے ساتھ بذریعہ ٹرین کراچی کے لئے نکلے تو راستے میں ڈیرہ رحیم یار خان میں کسی شادی کے لئے رکے۔پھر ٹنڈو محمد خان پہونچے جہاں ہمارے انبہٹہ کے عزیز واقارب جاکر آباد ہو گئے تھے۔انبہٹہ کے کچھ لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ ٹنڈو محمد خان میں نیا انبہٹہ بسائیں لیکن کراچی کو چھوڑ کر کون گاؤں میں جاکر بستا ہے، البتہ کچھ خاندان وہاں ضرور آباد ہو گئے تھے انبیٹہ کے پیر جی خورشید (ہمارے پردادا کے کزن) آفتاب احمد، ذوالفقار احمد، افتخار احمد نے وہاں اپنی انبہٹہ کی زمینیں ٹرانسفر کرالیں تھیں۔آفتاب احمد بھائی جان کے سوتیلے باپ بھی تھے انہوں نے بھائی جان کی والدہ رابعہ بیگم سے ان کے والد محمد موسیٰ کے انتقال کے بعد شادی کی تھی۔جن سے ایک لڑکا شمیم اور ایک لڑکی نجمہ تولد ہوئے تھے۔آفتاب صاحب کی پہلی بیگم سے قطب علی (بعد میں افضال احمد کے نام سے موسوم ہوئے) والد کے ساتھ آئے۔ہم نے بچپن سے بڑے ہونے تک اس گھر کی محبتوں میں ایک دوسرے کے لئے فرق نہیں دیکھا۔ہماری ممانی رابعہ جنتی خاتون تھیں ہمیں بچپن میں معلوم ہی نہ ہوسکا کہ بھائی قطب ان کے سوتیلے بیٹے ہیں۔

ادھر آفتاب صاحب کے دل میں بھائی جان کے لئے شفقت و محبت کے انبار تھے۔ مجھ پر اپنے گھر جو کچھ گذری اس سے تو کوئی مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ گھر اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے بعد ہم نے اپنی پھوپی قدسیہ کو اپنی سوتیلی اولاد فصیح الزماں اور مطیع الزماں پر فدا ہوتے دیکھا۔ ان دونوں کی پاکستان روانگی سے بھی ان کے دل دماغ متاثر ہوئے تھے۔ جس نے شدید اعصابی بیماری کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ٹنڈو محمد خان میں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ وہاں زمین اور گھر دونوں ہی کی پیش کش ہوئی۔ بھائی جان نے بھی وہاں ہمارے نام سے مربے ریزرو کر رکھے تھے، دادا آفتاب اور ممانی رابعہ کے ساتھ میں دہرہ دون میں بچپن میں رہا تھا۔ جس کا ذکر آ چکا ہے۔ میں بھی اس محبت بھرے گھر کا حصہ تھا۔ ممانی رابعہ نے تو محبت اور خیال کے علاوہ کچھ اور سیکھا ہی نہیں تھا۔ بھائی افضال اور سلیم سے بچپن کی انبیٹہ اور دہرہ دون کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ بھائی افضال علی سے میری ملاقات مدت بعد کراچی میں ہوئی۔ وہاں وہ دوبارہ پناہ گزیں ہو کر پہونچے تھے۔ ان کا ہونہار فرزند بی ایس سی کے امتحان میں پہلی پوزیشن لے کر پہونچا تھا۔ انعام کی تقریب میں وہ اپنے اقرباء کے ساتھ طلائی تمغہ لینے پہونچا۔ کسی سندھی نیشنلسٹ کی گولی کا نشانہ بن گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خود افضال بھائی کی فیملی کو خطرات کا سامنا تھا، وہ کراچی کے مہاجرستان میں منتقل ہو گئے۔

کراچی میں آمد:

ٹنڈو محمد خان سے کراچی پہونچے جس کا ذکر بچپن سے سنتے چلے آ رہے تھے یہاں ہمارے رشتے کے ماموں عثمان انصاری مدتوں سے رہتے تھے۔ وہ آموں کے موسم میں انبیٹہ والوں کی روایت کے مطابق آ کر اپنے باغوں کے آم کھاتے اور کھلاتے۔ ان کا لڑکا سلیمان (عرف چھامن) ہمارا دوست تھا۔ چھامن کے ساتھ ہماری ایک تصویر شبہ بالا بنے ہوئے بچپن کی یادگار ہے۔ وہ عین عالم شباب میں رخصت ہو گیا تھا۔ ماموں عثمان

کے ذریعہ ان کی وطن آمد پر کراچی کا تعارف اور تعریف ہوتی تھی۔اس کی صفائی شفاف سڑکیں، بلندو بالا عمارتیں، سندھی تہذیب ٹھاٹے مارتی ہوئی سمندر کی لہریں غرض کراچی اگر جنت نہیں تو وہ جنت کا دنیا میں ایک نمونہ تھی۔ہم کراچی بمبئی دیکھ کر پہونچ رہے تھے۔ کراچی سرتاپا بمبئی نظر آئی اور اسے دیکھ کر ابا جان کی شدید یاد آنے لگی۔کراچی میں اب مہاجر آ آ کر آباد ہو رہے تھے۔ ہمارے بھی خاندان کے لوگ انبہٹہ، گنگوہ، دیوبند، حیدر آباد، دلی، پنجاب وغیرہ سے نکل کر کراچی میں آباد ہو چکے تھے۔ان لوگوں سے ملے مدتیں ہو چکیں تھیں میرے پاس کراچی کے لئے چند دن تھے پھر افغانستان کا سفر تھا۔چند دن میں کہاں کیسے اور کس کس سے ملیں گے۔ بھائی جان کے مطابق پہلی ملاقات دونوں چچاؤں اور پھوپی جان سے ہونی ضروری تھی۔

میرے لئے میری ننھیالی کزنس آپا عباسیہ، آپا مشتری، آپا بلقیس وغیرہ تھیں جن کی گود میں آنکھ کھولی تھیں۔اس لئے سب سے پہلے آپا بلقیس کے پاس سامان رکھا اور وہاں سے ایک جوڑا شیروانی سمیت پہن کر اور ایک کپڑے کے تھیلے میں مزید جوڑا لے کر ہم لوگ دوسرے دن نکلے تو ایک ہفتہ بعد واپس آئے۔اس ہفتہ میں بہت کچھ ملاقاتیں ہوئیں۔

چچا حمداللہ: کراچی کے حضرت خضر

بھائی جان میرے تکلف کے باوجود مجھے چچا حمداللہ انصاری کے گھر لالوکھیت پہونچ گئے۔ چچا میاں تو موجود نہیں تھے۔لیکن چچی جان (آمنہ خاتون) جو ہماری خالہ زاد بہن بھی تھیں یہیں موجود تھیں۔لالوکھیت خاندان کے بہت سے لوگوں کا پہلا پڑاؤ تھا۔چچا میاں بھی ایک اور عزیز کے ساتھ اس گھر کے نصف حصہ دار تھے، چچی جان نے بہت آؤ بھگت کی اور بتایا: ''تمہاری آمد کی اطلاع بھائی محامد سے ہوئی تھی۔انہوں نے تمہارے خط کا اور اپنے جواب کا ذکر کیا تھا اس پر تمہارے چچا بہت ناراض ہوئے، آپا محمودہ کو پتہ چلا انہیں بھی بہت افسوس ہوا، آپا بلقیس کے گھر سے پتہ چلا کہ تم پہونچ گئے ہو تو تمہارے چچا تمہیں

ڈھونڈنے نکل گئے۔"

ان سے لالوکھیت کے اور بہت سے عزیزوں کو خبر ہوئی جس میں آپا مشتری اور بھائی الیاس، دادا شریف، اور ان کی اولاد، پھوپی سعدیہ اور پھوپا اصغر، خالہ رشیدہ اور ان کا خاندان اور بھی بہت سے گھرانے تھے۔ یہ ملاقاتیں ان لوگوں سے تھیں جن کے ساتھ زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا۔ ہر کام کے ساتھ یادیں ہی نہیں تھیں بلکہ کہانیاں بھی تھے۔ دادا شریف کے ساتھ ایک کہانی نہیں پورا ناول تھا۔ سب لوگ سیٹل ہونے کے ابتدائی مراحل میں تھے لیکن ہر ایک کا دل گھر اور دستر خوان کھلا تھا، سب سے ہم دوڑ دوڑ کر مل رہے تھے کہ دادا شریف نے مجھے پر قبضہ کرلیا۔ اب بھائی اصغر مجھے کھانے پر بلانے کے لئے آئے تو دادا نے ایسا ٹکا سا جواب دیا کہ بھائی اصغر بپھر گئے۔ انہوں نے گرج کر کہا: "چچا تمہیں معلوم ہے عابد میاں سے سعدیہ کی کیا رشتہ داری ہے۔ ان کی اماں عطیہ اور ان کی دادا ی حبیبہ اور دادا منصور انصاری فرسٹ کزن تھے۔ ان کا بچپن دیو بند میں ان کے گھر میں گزرا۔"

دادا میں یہ سب سننے کے لئے برداشت کہاں تھی انہوں نے گرجنا اور برسنا دونوں ایک ساتھ شروع کر دیئے معاملہ نازک ہو گیا: دادا نے للکارا "میاں کہاں تو بھنڈے کے راستہ سے رشتہ داری نکال رہے ہو۔ جن عطیہ کی تم بات کر رہے ہو وہ اور ان کی عابد میاں دادی دونوں میری بہنیں تھیں۔ میں ان کے باپ کو اور خود ان کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرا ہوں۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو وہ میرے گھر رہتے۔ انہیں آپا عطیہ کے یہاں رہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

آپا مشتری نے یہ شور سنا تو وہ بھی برقعہ پہن کر نکل آئیں اور صلح کرانے کی کوشش میں کہا: "میں نے عابد میاں کو اس دن سے گود میں اٹھایا ہے جس دن سے وہ پیدا ہوئے پھوپی مونے (میمونہ) کے انتقال کے دن میں نے اور سلمی نے ہی اسے بہلا کر رونے سے چپ کرایا تھا۔ میں نے اس کے لئے بکری کا شوربہ اور ماش کی دال پکائی ہے جو اس کے شوق کا

کھانا ہے۔''وہ میرے گھر کھانا کھائے گا۔'' اتنے میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے چچا حمد اللہ آ گئے۔ پہلے تو مجھ پر ناراض ہو گئے کہ تو اپنا گھر چھوڑ کر بلقیس کے گھر کیوں اترا۔ پھر سب سے مخاطب کر کے کہا جسے کھانا کھلانا ہو وہ ہمارے گھر لے آئے۔ اس طرح ہم اپنی تکا بوٹی ہونے سے بچ گئے۔ ورنہ تو خدشہ تھا: پا بدست دیگرے دست بدست دیگرے۔

ہمارا فیصلہ اس دن ہو جاتا۔ اور ہم بھی ہندوستان کی طرح اس دن تقسیم ہو جاتے۔ کراچی میں یوں تو درجنوں گھر اپنے گھر تھے لیکن اس کے بعد ہمارا کراچی کا ہیڈ کوارٹر لالوکھیت کا چوراہہ ہو گیا تھا۔ میں اب چچا حمد اللہ کے قبضے میں تھا۔ ان کا لقب کراچی کی دائی تھا۔ انہیں سارے رشتہ داروں کے رشتے، پتے، احوال اور راستے معلوم تھے اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ ہم کسی بھی عزیز رشتہ دار کی ملاقات کی سعادت سے محروم نہ رہیں۔ یہ اس وقت تھا کہ نہ کراچی میں ٹرانسپورٹیشن کا مناسب انتظام تھا اور نہ پتے متعین تھے۔ اب چچا میاں تھے اور میں تھا۔ انہوں نے وہ پلاٹ بھی مجھے دکھا دیے تھے جو میری نیت سے انہوں نے خرید رکھے تھے اور ان آرکیٹیکٹ کی بھی معلومات فراہم کر دیں تو جو کوٹھی کی تعمیر میں مدد کریں گے۔

ان کے سامنے جو بھی مسئلہ پیش ہوتا اس کے حل کے لئے نصف درجن نام بتا دیتے۔ خود انہوں نے کر زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا۔ آمدنی سے زیادہ گزر اوقات قناعت پر تھی۔ توکل کا یہ حال تھا کہ وہ ملازمت سے بغیر چھٹی کی درخواست دیے سترہ دن میرے ساتھ رہے اور میرے اصرار کے باوجود مجھے یہ کہہ کر مطمئن کرتے رہے کہ: ''میاں تم کب کب آؤ گے نوکری کا کیا ہے کراچی میں نوکری کی کیا کمی ہے۔''

یوں چچا جان کی ملازمت قریبی عزیز سعید میاں کے پاس تھی۔ وہ دلی چتلی قبر کے مشہور ادارے مطبع مجتبائی کے وارثین میں سے تھے۔ دلی میں مشہور تھا نصف دلی ان کی ہے ہم نے بھی بچپن میں ان کا مطبع، بیٹھک، گھر، کاریں، ٹیلی فون اور دسترخوان دیکھا۔ تھا۔

کراچی میں ان کے نام گوردھن داس مارکیٹ الاٹ ہوگئی تھی جو کروڑوں کی تھی۔ چچا حمداللہ اس کے نگہبان تھے۔نگہبانی بھی وہ غائبانہ کرتے تھے۔کبھی کبھی چکر لگا لیتے۔ورنہ دور سے ہی آیت الکرسی پڑھ کر دم کر دیتے تھے اخلاق اور روحانیت پیٹ نہیں بھر سکتی وہ بھی کثیرالاولاد آدمی کا۔مگر یہ مسئلہ ان کا نہیں تھا۔ چچی جان کا تھا۔صبر وضبط کے علاوہ ان بے چاری کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہ تھا۔

مولانا زاہر قاسمی اور فیملی سے ملاقات:

ہمارے سامنے ایک بہت اہم مسئلہ افغانستان کے سفر کا تھا۔ہم ویزا لیکر پاکستان آ گئے تھے اور افغانستان کا ویزا ہمارے پاسپورٹ پر لگا تھا اب سوال یہ تھا اگر افغانستان جائیں تو کیا قانونی کاروائی کرنی ہوگی۔اور اگر افغانستان پہونچ گئے تو واپسی کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہم نے سترہ دن چکر لگائے۔ چچا میاں نے پہلے ماموں زاہر قاسمی کا نام اس عقدۂ مشکل کے حل کے لئے پیش کیا اور ایک رات وہ وہاں لیکر پہونچ گئے۔سب سو چکے تھے سوتوں کو کنڈی کھٹکا کر اٹھا دیا۔زاہر ماموں نے دروازہ کھول کر کہا: کیا قیامت برپا ہوگئی؟''

چچا حمداللہ نے جواب دیا: ''میاں شام کے بارہ بجے سو گئے یہ کونسا سونے کا وقت ہے؟''غرض مجھے ماموں ممانی کے سپرد کر کے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ میں صبح سویرے لینے آ جاؤں گا۔ زاہر قاسمی صاحب (ابن مولانا طاہر قاسمی نبیرۂ مولانا قاسم نانوتوی) نوجوان مسلم لیگ کی متحرک اور فعال رکن تھے۔(ان کے والد غیر فعال رکن تھے) اس لئے تقسیم کے بعد وہ فوراً ہی پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ان کے سماجی تعلقات ہر حلقے سے تھے۔ ہر شخص کا کام کروا دیتے تھے۔ریڈیو اسٹیشن سرکاری اور غیر سرکاری فنکشنز میں قاری مقرر اور بزلہ سنج ہونے کے سبب مقبول تھے۔مزاج سے مرد قلندر تھے۔

گھر لسبیلہ ہاؤس میں تھا۔ان کو دیکھا تو بزرگوں کی قناعت کے واقعات کی یاد

تازہ ہوگئی۔ایک کمرے میں تقریباً کھرے پلنگ پر چادریں اوڑھے ان کی پاکستانی نسل خواب مست تھی۔پاکستان آکر اللہ تعالیٰ نے اولاد کا دروازہ کھولا۔اور کافی کشادہ کھولا۔دلی میں کچھ دن (۱۹۴۲) میں ان کے پاس بھی رہا تھا۔جب کوئی اولاد کو پوچھتا تو ممانی کہتی تھیں کہ مجھے اولاد کی کیا ضرورت میرا بیٹا عابد میاں تو ہے۔وہ اپنے پاس ہی مجھ کو لٹایا کرتی تھیں۔ان دونوں کی یہ بہت سی یادیں دل میں محفوظ تھیں میں سمجھ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے لئے محل تعمیر کرلیا ہوگا مگر ان کا حال بھی ہمارے ابا جان کی طرح تھا کیونکہ دونوں کی ہتھیلی میں چھید تھا۔جو پایا وہ خرچ کردیا۔جس کی امید تھی وہ بھی خرچ کردیا اور جس کی امید نہیں تھی وہ بھی اللہ کا نام لیکر خرچ کردیا۔اپنے پر بہت کم اوروں پر زیادہ سے زیادہ۔

بہر حال رات گزارنے کے لئے ماموں نے بچوں کو ادھر ادھر کرکے ایک پلنگ پر میرے لئے جگہ نکال دی۔میں نے کہا کہ پاجامہ یا تہبند پہننے کو اور اوڑھنے کو چادر چاہیے انہوں نے ایک بچے کے اوپر سے چادر کھینچ کر کے مجھے دیکر کہا:''اسی کو تہبند بنالے اسی کو اوڑھ لے۔یہاں کون دیکھنے آرہا ہے؟''

صبح مجھے جگا کر فرمایا:''چل ریڈیو اسٹیشن۔'' میں نے معذرت کی انہوں نے پاجامہ اور بنیان پر شیروانی زیب تن کی اور روانہ ہوگئے۔ممانی جان نے بہت عمدہ ناشتہ کرایا۔عامر قاسمی (بچپن کے دوست) سے ملاقات ہوئی۔زاہر ماموں اور چچا جان دونوں پہونچ گئے تھے۔ان کے سامنے افغانستان کے سفر کا مسئلہ پیش ہوا۔انہوں نے آسان نسخہ بتایا۔میں اپنا پاسپورٹ ان کے حوالے کردوں۔وہ میرا پاکستان کا پاسپورٹ بنوا کر افغانستان کا اس پر ویزا لگوادیں گے۔دراصل ماموں پاکستان کی شہریت دلوانے میں مہارت رکھتے تھے۔جو شخص ان کی معاونت حاصل کرتا اس کا پاسپورٹ لے کر خاموشی سے پھاڑ دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ تم پاکستان کے شہری ہوگئے۔اور وہ پاکستان کا شہری ہوجاتا تھا۔

دراصل اس دور میں پاکستان کا قلب کشادہ تھا اور وہاں کی شہریت کے لئے واحد شرط اسلام تھی لیکن وقت نے بتلایا کہ دوقومی نظریہ کی رو سے نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو پاکستان کا حق شہریت حاصل ہونا چاہئے۔لیکن جب سے پاکستان بنا اس کی شہریت جغرافیائی حدود کی اسیر ہوگئی۔ بلکہ جو وہاں پہونچ چکے تھے وہ بھی اصل شہری حقوق سے محروم کردیے گئے تھے۔ ہرچند کہ قائداعظم نے وہاں کے ''ذمیوں'' تک کو پوری شہریت کی ضمانت دے دی۔

چچا میاں نے ہمیں کراچی خوب گھمایا۔ان کی ماموں زاد بہن چھمّو قائداعظم کے مزار کے اور دگرد کی گلیوں میں رہ رہی تھی۔وہ اور ہم بچپن کے ساتھی تھے۔اس کی شادی میں ہم شریک تھے۔اس سے ملاقات کی۔وہ ایک تنگ وتاریک جھونپڑہ میں بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔اس کے فوراً بعد سر سلیمان انجینیر کے ایر کنڈیشن محل میں ان سے اور ان کی بیگم خاتون تائی اماں سے ملے اور دلی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ جہاں ان کا نئی دلی کا دو محلہ تھا جس میں بیڈمنٹن اور ٹینس کورٹ تھا اور گوری میمیں آکر بیڈمنٹن غیر شرعی لباس میں اور ہمارے گھر کی لڑکیاں شرعی لباس میں کھیلتی تھیں ہمارے گھر کی بزرگ معزز خواتین ان انگریز خواتین سے پردہ کرتی تھیں کہ کہیں انہیں دیکھ کر وضو نہ ٹوٹ جائے۔خان بہادر صاحب نئی دلی کے ماہر آرکیٹیکٹ تھے۔کراچی میں اس وقت قائدِ اعظم کے مزار کی تعمیر کا کام شروع ہورہا تھا جس کے انچارج ہمارے چچا اسرائیل مدنی تھے۔ان کا چھوٹا سا عارضی کوارٹر مجوزہ تعمیر کے احاطہ میں تھا۔جہاں سے وہ کام کی نگہبانی کرتے تھے۔

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا لیکن ویزا کا معاملہ اٹکا ہوا تھا۔اس وقت بنگال سے حسین شہید سہروردی آگئے۔ بھائی جان ان کی جماعت عوامی لیگ کے سرکردہ ممبر تھے۔ان سے بھائی جان نے ہماری بھی ملاقات کرادی۔سہروردی صاحب کا چہرہ مہرہ جسم و جان ماشاءاللہ بڑا رعب داب کا تھا۔ان کی گفتگو میں بلا کی خوداعتمادی تھی۔انہوں نے ویزا کے

سلسلے میں ایک خط پاسپورٹ آفیسر کے نام لکھوادیا۔ان صاحب سے ملاقات کی تو فرمایا ابھی ہمارا آفس اور ملک نیا نیا ہے اس قسم کے قوانین ابھی بنے نہیں۔ میں نے پوچھا: اس شکل میں کیا کروں تو فرمایا: ''ہندوستان جاؤ اور براہ راست بذریعہ طیارہ افغانستان کا سفر کرو۔'' غرض جس قدر ہم افغانستان جانے کی آرزو رکھتے تھے اور طریقہ کی جستجو کررہے تھے اسی قدر ناکامی ہورہی تھی۔

چچی سیدہ اور چچا محامداللہ انصاری:

اس عرصہ میں ہم نے سیدہ چچی جان (بیگم محامداللہ انصاری) سے بھی ملاقات کرلی۔انہوں نے بہت شفقت ومحبت کا اظہار کیا اور اپنی مجبوریوں کا ذکر کرکے فرمایا: ''یہ گھر تمہارا ہے تمہیں یہاں ہی ٹھہرنا چاہئے تھا لیکن میں مجبور ہوں۔'' ان کی آنکھوں سے بہت سے آنسوؤں کے قطرے گرے۔ مجھے ان حالات کا علم تھا جو شادی کی دھوم دھام کے بعد سے ان دونوں کی زندگی میں پیش آرہے تھے، اس میں ان کے بزرگوں کی انا کا بہت زیادہ قصور تھا۔لیکن نہ کبھی چچا میاں نے انقطاع تعلقات کو سوچا نہ چچی جان نے۔اس بے تعلقی میں بھی اللہ نے پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نواز دیا۔اب دونوں اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں دونوں غیر معمولی شخصیات کے مالک تھے۔چچا محامد میرے آئیڈیلس میں سے تھے۔مجھ سے ان کی برہمی کے باوجود (جو میرے کبھی سمجھ میں نہیں آئی) وہ مجھ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور بقول ان کی اولاد کے وہ مجھے مثال بناکر ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔

پھوپی محمودہ سعود آباد میں مقیم تھیں وہ مجھے دیکھ کر بے اختیار رونے لگیں۔علی گڑھ میں ان کی اولاد کی جگہ تھا۔تامبرم سینی ٹوریم جانے کے بعد (56-1955) انہیں توقع نہ تھی میں واپس علی گڑھ آؤں گا اس لئے وہ اپنا گھر اور سامان چھوڑ کر عارضی طور پر کراچی آئی تھیں پھر دونوں بھائیوں نے انہیں پاکستانی بنادیا۔پھوپی محمودہ سند یافتہ اور تجربہ کار مڈوائف تھیں۔علی گڑھ کے شیروانیوں کی کم وبیش پوری نسل کی وہ دوسری ماں تھیں۔

بھائی جان کا اصرار تھا چچا محامد انصاری سے ملنا ضروری ہے۔ان کے اصرار پر میں نے ڈرتے ڈرتے فون کیا تو انہوں نے بہت تپاک سے اپنے آفس لنچ پر مدعو کرلیا۔لنچ بہت لذیذ تھا۔اور گفتگو اس سے زیادہ ملذذ۔فرمایا:''جب تمہارا پہلے دن فون آیا تھا تو میں تمہاری گفتگو دوسری لائن پر سن رہا تھا۔میں نے تمہیں خط میں بھی اپنا معذرت نامہ بھیج دیا تھا۔میرے گھر کے حالات کسی مہمانداری کے متحمل نہیں ہوسکتے۔'' پھر انہوں نے چند ذاتی واقعات کا ذکر کیا جن کو بیان کرنا مناسب نہیں۔

چچا محامد اللہ انصاری اپنی ذات سے ایک غیر معمولی انسان تھے۔وہ خود علیگ تھے۔ان کے والد احمد میاں انصاری علی گڑھ اسکول اور یونیورسٹی میں دینیات کے استاد تھے۔ان کے دادا مولانا عبداللہ انصاری پہلے ناظم دینیات اور بانی شعبہ تھے۔اوران کی بیگم سیدہ خاتون (بنت سید محتشم کاظمی اور طیبہ بنت حافظ احمد صاحب ابن مولانا قاسم نانوتوی) بھی بہت دیندار اور شائستہ خاتون تھیں۔ان دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے شاہانہ انداز سے ہوئی تھی۔سید محتشم صاحب دیوبند کی ناک آنکھ اور کان تھے۔کئی گاؤں کے مالک جس میں نعمت پور بہت خاص تھا۔یہ شادی بھی انہوں نے نعمت پور سے ہی کی تھی جہاں جنگل کو انہوں نے منگل کردیا تھا۔

یہ جوڑا یقیناً ممتاز اور آئیڈیل تھا لیکن بزرگوں کی نادانی سے ابتداء ہی میں تعلقات کشیدہ ہوگئے محامد اللہ انصاری پورے خاندان میں اپنی اصول پرستی کے لئے مشہور تھے۔شادی کے بعد انہوں نے چاہا ان کی بیگم ان کے گھر انبہٹہ چل کر والدہ کی دعائیں حاصل کریں۔دیوبند کے لوگ انبہٹہ کے دامادوں کو پسند کرتے ہیں،لیکن لڑکیوں کو وہاں بھیجنے میں توہین سمجھتے ہیں،معاملہ اس قدر بڑھا کہ سید صاحب کے گھر سے طلاق کا مطالبہ ہوگیا۔چچا میاں کے گھر ان کی بڑی صاحبزادی رفعت کی ولادت ہوچکی تھی انہوں نے طلاق دینے سے انکار کردیا۔ابا جان چچا جان کے بڑے بھائی (تائے زاد) تھے تو امی جان

سیدہ چچی کی بڑی (پھوپی زاد) بہن تھیں۔ یہ دنوں ان معاملات کے حل کرانے میں پیش پیش تھیں۔لیکن امی جان کو خود اس بات پر فخر تھا کہ وہ کبھی انبہٹہ اپنی سسرال نہیں گئیں۔لیکن ان دونوں کی سیدہ چچی کو ہدایت تھی کہ طلاق نہ لیں۔لیکن خود ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا سارا قصہ بزرگوں کی ناک کا تھا۔ میں کم عمری کے باوجود اس واقعہ کی جزئیات تک سے واقف تھا کیونکہ عورتوں اور مردوں میں یہی موضوع گفتگو رہتا تھا۔

بات میں بات یہ بھی آئی تھی کہ آخر امی جان بھی تو انبہٹہ نہیں گئی۔تو چچا میاں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب کہلا کر بھیج دیا: ''بھائی میاں (ابا جان) دھیچو ہیں اور اگر انہوں نے غلطی کی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ میں بھی وہی غلطی کروں۔'' بالآخر سیدہ چچی از خود انبہٹہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں اور اس طرح اس بریک ڈاؤن کی سلسلۂ جنبانی ہوگئی۔ اولاد کا سلسلہ بھی ماشاءاللہ جاری ہو گیا اور اولاد بھی سبحان اللہ ایک سے ایک ہے لیکن ان دونوں کے آپس کے رشتوں کے الجھاؤ نہ سلجھ سکے۔

بچپن کے ان واقعات کا میں صرف سامع اور تماشبین نہیں تھا بلکہ جذباتی طور پر خاموش محرم تھا، چچا میاں، خاندان، انبہٹہ دادی بہو (والدہ چچا محامد) سب میری محبت وعقیدت کا مرکز تھے ان پر لعن طعن، طعن وتشنیع کو میں سنتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ میرے بارے میں ہیں۔ دراصل یہ ایک واقعہ نہیں تھا بلکہ اس دور کے خاندانوں کا مزاج تھا جس کی بنیاد علم دین نہ تھا خاندانی جہالتیں اور رقابتیں تھیں۔ یہ کسی ایک گھر کا قصہ نہ تھا۔ کم وبیش ہر گھر کی کہانی تھی اور اب بھی اس کہانی کا تسلسل قائم ہے۔ عالموں کے خاندان ہوں یا غیر عالموں کے عورت کو جاہل رکھنے پر سب کو اتفاق تھا۔ تعلیم کے علاوہ تربیت کا بھی کوئی نظام نہیں تھا۔ کم وبیش ہر بہو اپنے ساتھ خاندانی رقابتوں کا پٹارہ لیکر آتی اور اپنی لڑکی کو رخصت کرتے وقت اس کو جہیز میں مع اضافے کے دیدیتی۔

میں نے اس کشمکش سے بچنے کے لئے خاندان سے باہر شادی کی تھی اور تجربہ کامیاب رہا۔ لیکن جب ایک عمر کے بعد دونوں خاندان ایک ہو گئے تو مجھے اور تسنیمہ دونوں ہی کو بقدر ظرف ان خاندانی جھگڑوں سے بھی حصے مل گئے جن سے ہمارا دور دور کا بھی تعلق نہ

تھا، ہم ایسے جھگڑوں میں ملوث سمجھے گئے جس کا ہمیں علم تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کی عمارت کی پہلی اینٹ گھر اور خاندان ہے لیکن یہاں تو آوا کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے تنزل کے تجزیے بہت سے ہیں۔ جماعت تبلیغ کہتی ہے کہ کلمہ صحیح ہو جائے جماعت اسلامی کہتی ہے اسلامی ریاست قائم ہو جائے، علماء فرماتے ہیں قانون حدود نافذ ہو جائے۔ بریلوی کہتے ہیں صحیح نیاز ادا ہو جائے۔ عورتیں کہتی ہیں سمدھیانے کے لوگوں کو عقل آ جائے۔ مرد کہتے ہیں جائداد کے مقدمے نپٹ جائیں۔ غرض جس قدر مسلمان ہیں اتنے ہی جھگڑے ہیں اور اتنے ہی اس کے مجوزہ حل ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ تعلیم و تربیت ہے وہ بھی خواتین کی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہیں۔ وہ علماء جو علومِ دین کے داعی ہیں انہوں نے بھی اپنے گھر کی عائشاؤں کو علم سے محروم رکھا ہے۔

احتشام کاظمی اور حمیرا باجی:

جہاں چچا حامد اللہ انصاری کا ذکر ہوا اور وہاں ان کے برادر نسبتی کا بھی ہو جائے۔ احتشام کاظمی ابن سید محتشم صاحب اور ان کی بیگم حمیرا بنت مولانا طیب صاحب اپنے پورے گھر سمیت دیوبند سے پاکستان (۱۹۵۶) پہونچے تھے۔ ان دونوں سے مجھے طبعی مناسبت بچپن سے تھی۔ ان سے ملنا طبیعت کا بھی تقاضہ تھا۔ احتشام صاحب میرے چچا اور یہ خالو تھے۔ یعنی ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے عزیز داری تھی۔ پھر ہمارے چچا ان کے بہنوئی بن گئے تھے۔ لیکن رشتہ داری سے زیادہ ہمارے تعلقات کی بات تھی اور تعلقات کی بات بھی ان کی اور ان کی بیگم دونوں کے اخلاق کی تھی۔ یوں تو میں ہر پاکستان جانے والے کو روکتا تھا کہ وہ اپنا گھر، مسجد، قبرستان اور تہذیب چھوڑ کر پاکستان نہ جائیں لیکن وہ لوگ جن کے پاکستان جانے سے میں بہت متاثر ہوا ان میں احتشام صاحب اور حمیرا خالہ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر کا اسٹوڈینٹ تھا اور ان کے چھوٹے بھائی واصف امام سیکنڈ رایر کے اسٹوڈنٹ تھے اور میرے روم پارٹنر تھے۔ احتشام صاحب پاکستان جانے سے پہلے خود مجھ

سے ملنے آئے تھے۔ہم دونوں نے عشاء کی نماز کے لئے وضو کی اور سلسلہ کلام کو جاری رکھا میری ضد کہ وہ اپنے بزرگوں کے نام اور کام کو چھوڑ کر ایسی جگہ جارہے تھے جہاں وہ گمنام تھے۔ان کا اصرار کہ ہندوستان میں رہ کر کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکتے۔

میں نے اپنی محدود عقل اور تجربے کی بنیاد پر بہت سی تجاویز رکھیں لیکن ہر تجویز کے راستے میں خاندان کی عزت بزرگوں کی عظمت، والدین کی ناک آگئی، میں نے کہا: پاکستان جا کر آپ کیا کریں گے؟'' تو انہوں نے فرمایا: ''پاکستان میں مجھے کون پہچانتا ہے محنت، مزدوری، دکانداری غرض جو بھی ہوگا وہ ہو جائے گا۔ ہندوستان میں ہر کام میں بزرگوں کا نام حارج ہے۔'' ہم جاء نمازوں پر بیٹھے گفتگو میں محو تھے کہ مؤذن نے فجر کی آذان دیدی۔تب ہمیں ہوش آیا اور عشاء کی وضو سے عشاء کی قضا اور فجر کی ادا نماز ادا کی۔

احتشام صاحب کی بات درحقیقت صحیح تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے معیار شرافت میں ہر وہ کام جس سے اکل حلال میسر آئے ''شرفاء'' کا نہیں ''چھوٹی ذاتوں'' کا کام تھا۔عربوں میں اور ساری دنیا کے مسلمانوں میں بڑھئی،لوہار،سنار،قصاب،تجار،شرفاء کے کام ہیں۔سب سے زیادہ شریفانہ کام یوپی میں زمینداری تھا جس میں مزدور کے خون پسینے کا اصل پھل بغیر کسی کوشش کے زمیندار کھاتا تھا۔ہندوستان کے مسلمانوں نے منودھرما شاسترا کے ذات پات کے نظام کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا اور اس کے جواز کو خود ساختہ نظام سید،شیخ،مغل،پٹھان اور اجلاف کی تقسیم کو کفو کے نام پر شریعت کا چوغا اڑھا دیا تھا۔دیوبند میں سید محتشم صاحب کا تو بہت بڑا نام تھا۔ان کے اور ان کے اولاد کے آگے پیچھے ملازم چلتے تھے۔ہمیں وہ منظر یاد ہے جب محمد علی جناح صاحب کی سیاست نے (۱۹۴۶) مسلمانوں کو ڈائرکٹ ایکشن ڈے کی دعوت دی تھی اور مسلمان جوق در جوق ڈائریکٹ ایکشن کے لئے نکل آئے تھے۔اس وقت بھی سید صاحب اور ان کی اولاد کے پیچھے ان کے ملازمین ان کی کفش برداری کے لئے چل رہے تھے۔علامہ نے خوب فرمایا ہے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

احتشام خالو اور حمیرا خالہ سے ملاقات ہوئی تو بہت سادہ زندگی تھی اور بہت اعلیٰ اخلاق تھا۔مختلف کاموں کے تجربے کر چکے تھے لیکن کسی چیز میں مہارت نہیں تھی۔ پہلا کام انہوں نے چچا جان کے گھر کی ٹھیکیداری کا کیا تھا۔الحمد للہ محنت سے یا مشقت سے انہوں نے کسی طرح اپنے خاندان کی پرورش کی اور پاکستان کی خدمت کی جس کے قائم کرانے کے لئے ان کے بزرگوں نے قربانیاں دیں اور بقا کے لئے ان کے والد اور چچا نے اپنی جان دیدی۔آج پاکستان میں ان دونوں شہیدوں کے نام کو کون جانتا ہے؟ ان کی خوددار اولاد نے خود بھی ان کی شہادت کی قربانی کا سود لینے سے انکار کر دیا۔انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی واصف امام کو امریکہ بھجوادیا۔واصف میاں نے تعلیم کے بعد پیپسی کولا کمپنی میں ملازمت کی اعلیٰ عہدے تک پہونچے بھائی بہن اور خاندان کے دوسرے افراد کو اسپانسر کیا اور سیٹل کرایا۔احتشام صاحب نے سب بچوں کی شادیاں کیں، بہن کی اولاد کی بھی سرپرستی کی اور سارے فرائض انجام دے کر ۲۰۱۲ء میں اللہ تعالیٰ سے جاملے۔

پاکستان کے بارے میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے
کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

میں نے بھی اس مضمون کو دو شعروں میں باندھا ہے۔

لٹ گئے در بدر ہو گئے
کچھ ادھر کچھ ادھر ہو گئے
منقسم ہو گئی زندگی
خاندان منتشر ہو گئے

شاہ مودود احمد صابری سے ملاقات:

ان ملاقاتوں میں ایک خاص ملاقات شاہ مودود احمد صابری (سجادہ نشین درگاہ شاہ ابوالمعالی انبہٹہ پیرزادگان ضلع سہارنپور) اور ان کی فیملی سے تھے۔شاہ صاحب اور ہمارے خاندان سے ہیں اور ہم جد ہیں یعنی دونوں خاندانوں کو شاہ ابوالمعالی سے نسبی نسبت ہے۔شاہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایم.اے.ایل.ایل.بی تھے۔یونین کے وائس پریزیڈنٹ (اس زمانے میں وائس چانسلر صدر ہوتا تھا) منتخب ہوئے تھے۔شاہ ابوالمعالی صاحب کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔اس درگاہ کے ۲۴ گاؤں مغلوں کے زمانے سے وقف تھے جن سے درگاہ اور سجادگان کا خرچ چلتا تھا۔اس درگاہ پر چڑھاوے اور نذرانے کا رواج نہ تھا۔صابری صاحب کو علی گڑھ کے بعد سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔میرے ہائی اسکول کے زمانے (1950-51) میں وہ بجنور میں راشننگ افسر تھے۔ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ سہارنپور میں وکالت کی ہندوستان میں ان کی ہر چند کہ نال گڑی تھی لیکن سر میں پاکستان کا سودا تھا۔

ان کے خاندانی قریبی رشتے درگاہ شاہ ابوالمعالی صاحب کے علاوہ درگاہ شاہ عبدالقدوس گنگوہی، درگاہ صابریہ دریا گنج دہلی، پیران پیر صابر کلیری (جن سے نسبت صابری ملی) اور ہندوستان کی معروف درگاہوں سے تھے لیکن جب دماغ میں پاکستان سما گیا تو ہندوستان سے متعلق سارے قلبی علائق ہیچ ہو گئے۔

ان کا گھر شاہی زمانے کی کشادہ ڈیوڑھی تھا اور شاہ ابوالمعالی صاحب کا مزار، جامع مسجد اور خانقاہ پوری بستی کا مرکز تھا۔انہوں نے اپنے تاریخی ڈیوڑھی کے سامنے بہت خوبصورت جدید اسلوب کی بیٹھک بنائی تھی۔اس زمانے میں لوہے اور خوبصورت کتبے نہیں ملتے تھے انہوں نے بڑھئی سے پہلے مستطیل لوحے لکڑی سے بنوائے پھر خطاط سے ان پر اقبال کے اشعار لکھوائے جب ان کے بیٹھک کے کمرے میں داخل ہو تو

سامنے کتبہ تھا۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
ربط باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

پھر دوسرا کتبہ تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور بائیں طرف کے کتبے پر تحریر تھا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ان میں یہ شعر بھی تھا:

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

وہ جب بیٹھک میں جاتے تو شاید ان کی یہ تختیاں انہیں ہجرت اور جہاد پر اکساتیں۔ سب لوگوں نے ان کو روکا۔ ان کے چچا اور قائم مقام سجادہ شاہ مقصود احمد نے سمجھایا اور چھوٹے موٹے چھوٹا منہ بڑی بات والے عابد میاں نے بھی ادب سے عرض کیا کہ "آپ کے جانے سے بستی ویران ہو جائے گی۔" مگر اب ان کے سامنے پاکستان کے مقاصد کی تکمیل تھی وہ اپنی ساری اولاد کے اور اپنے کتبوں کے علاوہ سب کچھ چھوڑ کر ۱۹۵۵ء میں پاکستان روانہ ہو گئے تھے۔

میں چچا حمداللہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا ان کی حسین وجمیل داڑھی غائب تھی جو انہوں نے بجنور کے زمانے میں اس لئے رکھی تھی کہ فسادات میں اگر کوئی ان کو قتل کرے تو مسلمان سمجھ کر کرے اور قتل کے بعد ان کے جسم کی توہین نہ ہو۔ پھر ہم

نے دیکھا وہ کتبے جو ان کا واحد سرمایہ تھے جو وہ ہندوستان سے لیکر چلے تھے وہ بھی دیواروں کی زینت نہ تھے۔

ہم ان کے گھر پہونچے تھے کہ خبر ملی کہ ان کے داماد سعدیہ بی کے شوہر زاہد میاں کو حکومت کی طرف سے پیرس جانا ہے۔اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔اس زمانے میں جو بھی نوجوان ہندوستان سے پاکستان پہونچتے تھے انہیں اچھے سے اچھے مواقع حاصل ہو جاتے۔ زاہد میاں تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔جوشؔ نے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر جھنجھلا کر کہا تھا۔

جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

اور اپنی کسمپرسی کا شکوہ اس طرح کیا تھا:

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

لیکن جوش جو کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر گئے تھے وہ انہیں پاکستان میسر آنا ناممکن تھا۔ان کا پاکستان سے کوئی رشتہ نہ تھا۔وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ہیرو،شاعر اعظم اور پنڈت نہرو کے ذاتی دوست تھے۔ان کا معاملہ ''خود کردہ علاقے نیست'' کے زمرہ میں تھا،صابری صاحب کا فیصلہ سوچا سمجھا اس آئیڈیولوجی کے نفاذ کے لئے تھا۔جس کو انہوں نے طالب علمی کے دور سے پروان چڑھایا تھا اور اب جبکہ اس آئیڈیولوجی نے ایک نیا وطن بنا دیا تھا تو ان کے لئے اس کی خدمت زندگی کی اولیت ہونی چاہئے تھی۔

کھانے کے بعد گفتگو شروع ہو تو میں نے صابری صاحب سے عرض کیا کہ: ''چچا جان آپ سے تین سوال ہیں؟'' انہوں نے شفقت ومحبت سے پوچھا: ''وہ کیا سوالات ہے''؟ میں نے عرض کیا کہ میں ایک ایک کر کے سوال کرتا ہوں پھر عرض کیا: ''آپ نے جو بجنور میں شرعی داڑھی رکھی تھی وہ کن حالات کا شکار ہوگئی''؟۔

صابری صاحب مسکرائے پھر فرمایا: ''ہندوستان میں داڑھی اسلام کا امتیازی

نشان تھی۔ فسادات کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا اس لئے میں نے صرف داڑھی نہیں رکھی شیروانی اور رامپوری کیپ یا جناح کیپ اس کے ساتھ پہنتا تھا۔ تا کہ اگر کوئی مجھے قتل کرے تو مسلمان سمجھ کر قتل کرے۔ ہندوستان میں داڑھی اسلامی تشخص کا نشان ہے۔ پاکستان میں داڑھی والوں کا کردار داغدار ہے یہ بھی دین کی تجارت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے میں نے داڑھی صاف کردی تا کہ میں ایک آدمی بن جاؤں۔''

پھر میں نے دوسرا سوال کیا: ''آپ ہندوستان سے علامہ اقبال کے اشعار کے کتبے لیکر نکلے تھے لیکن وہ یہاں نظر نہیں آرہے؟'' صابری صاحب نے فرمایا: ''علامہ اقبال کی شاعری، فلسفہ اور اسلامی پیغام نے ہمارے شعور کی آنکھ کو کھولا اور انہوں نے جو سبق پڑھایا وہ ہم نے از بر کرلیا۔ علامہ کا سب سے بڑا سبق تھا ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

میرا تجربہ یہاں آکر اس کے برعکس رہا۔ میں نے رہائش کے لئے لاہور کا انتخاب کیا تھا اور وہاں پر ملازمت کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ملازمت تو کیا انٹرویو بھی نہیں ملا ایک معمولی سی کلرکل ملازمت کے لئے میں نے سفارش کرائی جس سے انٹرویو کا دعوت نامہ حاصل تو ہوگیا، مجھ سے انٹرویو میں آفیسر نے پہلی نصیحت یہ کی: ''آپ ملازمت کی کوشش کراچی میں کریں۔ کچھ تو آپ لوگ مقامی لوگوں کے لئے بھی چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا میں ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کی خدمت کے لئے یہاں آیا ہوں اور لاہور میری پسند کا شہر ہے۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا: قائداعظم نے تو آپ سے کہدیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر وہاں اپنا مقام بنائیں۔ آپ کو ان کے حکم پر عمل کرنا چاہئے تھا۔

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کا فلسفہ حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ دراصل قوم مذہب سے نہیں بنتی یہ زبان تہذیب اور جغرافیہ سے بنتی ہے اور دوقومی نظریہ کا راز بھی آشکار ہوا کہ

جس قائداعظم نے ہندوستان کیا دنیا کو دوقوموں (مسلمان اور غیر مسلم) میں تقسیم کیا تھا اسی نے اپنی بات کی پاکستان بنتے ہی تردید بھی کردی۔پاکستان آکر مجھے بے ساختہ مولانا آزاد کی دلی والی تقریر یاد آئی۔اس دن میں نے سارے کتبے دیواروں سے اتار کر ہمیشہ کے لئے صندوق میں بند کردیئے۔"میرا تیسرا سوال یہ تھا:"ایک ماہر قانون کی حیثیت سے قائداعظم نے کیا نقشہ اسلامی ریاست کا پیش کیا اور آپ خود ماہر قانون کی حیثیت سے پاکستان کے اسلامی مستقبل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟"

صابری صاحب نے فرمایا:"میں نے عمر بھر جن معتقدات کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھا تھا اب وہ میرے پاس نہیں ہیں۔اب میری فکر صرف اپنے بچوں کے مستقبل کی ہے۔ ہم نے جو کچھ سوچ کر پاکستان بنایا تھا اس کو عملی شکل میں قابل عمل نہیں پایا۔"

اس کے بعد گھنٹوں انہیں سوالات پر مباحث ہوتے رہے اور درحقیقت آج تک انہیں تین موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے،یعنی پاکستان کا اسلامی تشخص کیا ہے؟ دوقومی نظریہ کیا ہے؟ اور اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ کیسے اسے بروئے کار لاکر پاکستان کے وجود کے مقصد کو پورا کیا جاسکتا ہے؟ ہندوستانی مسلمان جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا وہ پاکستانی قوم کا حصہ کیوں نہیں ہیں؟ کیا کوئی غیر مسلم کسی اسلامی حکومت کا مکمل شہری ہوسکتا ہے؟ آپ چاہیں تو آپ بھی اس مکالے میں شریک ہوکر اپنی گرمیٔ محفل کا لطف دو بالا کرتے رہیں۔لیکن ان کا حل کوئی کہاں سے لائے گا:

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رَوَد دیوار کج

(شیخ سعدی)

اس لئے جہاں تک ان سوالات کے علمی،ادبی،فکری جوابات ہیں وہ کسی عمل کی رہنمائی نہیں کررہے ہیں۔گفتگو برائے گرمیٔ محفل بن رہے ہیں۔

ہندوستان کے شرنارتھی اور پاکستان کے مہاجر:

لاہور اور کراچی میں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا۔اس کا اظہار الفاظ میں مشکل ہے یوں تو میں پنجاب کے بعض شہروں میں (فقیر والی، بہاولپور پٹیالہ) میں تقسیم سے پہلے رہ چکا تھا۔اور متعدد دوسرے شہروں (ہارون آباد، بہاونگر، کپورتھلہ، انبالہ) میں گھوم پھر چکا تھا لیکن وہ سب ہندوستان تھا ہر جگہ ہندو مسلمان اور سکھوں کی مشترکہ آبادی تھی۔ میں اب ہندوستان سے ایک نئے ملک پاکستان میں تھا جو اسلام کے نام پر اسلام کو برپا کرنے کے لئے قائم ہوا تھا۔اور اسی ضرورت کے لئے مشرقی پنجاب اور پاکستان سے کم وبیش آبادی کا مکمل تبادلہٗ ہوا تھا۔ہندوستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر کراچی اور سندھ میں آباد ہوئے اور انہوں نے خود کو مہاجر کہلوانا پسند کیا۔پاکستان نے ہندوستان میں اور خصوصیت سے دہلی میں بہت بڑی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی لٹ پٹ کر آئی تھی جنہیں شرنارتھی (پناہ گزین) کہا جاتا تھا۔۔ان شرنارتھیوں نے خود اس تعارف پر اعتراض کیا اور کہا ہم کسی کے شرن (پناہ) میں نہیں آئے بلکہ ہم اپنے وطن میں آئے ہیں۔ پھر انہوں نے کسی بھی امداد پر بھروسہ نہیں کیا اور بہت جلد اپنی محنت سے اپنا مستقبل تعمیر کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے کر بھی لیا۔

ان لوگوں کی زبان پنجابی تھی، یہ شلوار اور کرتا پہنتے تھے یہ خود اور ان کی خواتین کسی بھی کام سے گریز نہیں کرتی تھیں۔ میں نے چند واقعات ''انسانیت'' نامی کتاب میں لکھے ہیں۔لیکن پاکستان میں مہاجرین دلی اور لکھنؤ کی تہذیب ثقافت اور لب ولہجہ تلاش کر رہے تھے۔ پاکستان کے ہر علاقے کی اپنی زبانی تہذیب اور لب ولہجہ تھا اور وہ اوروں سے پرانا اور زیادہ مستند تھا۔تہذیب ایسا پیکج نہیں جو خریدا جاسکے۔ ہر تہذیب کے لئے ماحول، آب و ہوا تاریخی محرکات کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہر تہذیب منفرد ہے۔ یہی مسئلہ اب مغربی دنیا میں بسنے والوں کو درپیش ہے۔اور یہ پاکستان میں دریا کی گنگا جمنی تہذیب کی تلاش۔ سے

کہیں زیادہ گمبھیر ہے۔

لاہور پہونچ کر پہلا تأثر یہ تھا کہ میں شرنارتھیوں کی بستی میں آ گیا۔ان کی گفتگو، برتاؤ، لباس اور طرز زندگی میں ہندوستان کے شرنارتھیوں سے کوئی فرق نہ تھا۔دوسرے یہاں کی ہر چیز بڑی تھی وہ چائے کا کپ ہو یا سنترہ کے جوس کا گلاس وہ قد آدم تھا۔تیسری چیز اسلام کا جوش وجذبہ جہاد عام تھا مگر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں ہندوستان سے ہوں تو اکثر رحم اور حقارت کے جذبات سے استقبال ہوتا۔چوتھے وہاں ہر جگہ جہاد کا ذکر تھا اور اس کا انتظار تھا کہ وہ دن دور نہیں جب جنگ کے نتیجے میں دلی فتح ہو جائے گی۔اور لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہوگا۔

ہندوستان سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے اول اول ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی تھی پھر وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے بعد رقابت میں بدل گیا پھر دشمنی قائم ہوگئی۔ مجھے کئی دفعہ اس جذبۂ رقابت کا تجربہ اپنے اعزاء اور دوسرے پاکستانیوں میں محسوس ہوا۔لیکن ہندوستان اور ہندو کی مذمت میں مکمل اتحاد تھا۔
میں جب پنجاب سے کراچی پہونچا تو محسوس ہوا میں دلی اور علی گڑھ میں ہوں۔

کراچی کا مہاجرستان اور خالہ امت الرحمٰن

چچا حمد اللہ نے سترہ دنوں میں شاید ستر گھروں میں گھمادیا ہو۔ان میں وہ اعزاء بھی تھے جو تقسیم کے ساتھ ہی ہم سے رخصت ہو گئے تھے اور ہم ان کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہے تھے۔وہ اعزاء بھی تھے جن کے صرف نام سنے تھے لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا۔ان خاص اعزاء میں جن کی محبت کے ہم سزاوار تھے ہماری خالہ (والدہ کی کزن) امت الرحمٰن تھیں جنھوں نے والدہ کے انتقال (۱۹۳۶) کے بعد اپنے دامن شفقت کو اس طرح وا کیا کہ میں ان کی گود میں لیٹا رہتا تھا اور ان کے صاحبزادے اکبر انصاری ماں کے دامن کو پکڑے روتے رہتے تھے۔خالہ کے شوہر خالو انیس صاحب نے سنا تھا پیدل حج کیا تھا۔انہوں نے ۵

اولاد (۴ لڑکے اور ا لڑکی) نامی گرامی پیدا کیں۔لڑکی تو ہمارے چچا حمد اللہ کی بیگم آمنہ تھیں، ادریس انصاری مصنف مبلغ اور صوفی، پھر الیاس حسینی انصاری موسس مدارس، اسلامیہ اور مہاجر مکی اور تیسرے عالمی شہرت یافتہ روحانی ڈاکٹر اور پیرومرشد شمس الدین عظیمی صاحب اور پھر ہمارے خورد اور دودھ شریک بھائی اکبر انصاری تھے۔خالہ پاکستان جانے کے لئے تیار نہیں تھیں بلکہ ان کے صاحبزادے عظیمی صاحب نے انہیں حج وعمرہ کا لالچ دلایا کہ وہ سب کچھ تج کے براہ بنگلہ دیش کراچی آ گئیں۔بعد میں الحمد للہ انہوں نے عمرہ اور حج بھی ادا کرلیا۔

یہاں آ کر انہیں معلوم ہوا کہ ان کے فاضل بیٹے شمس الدین (چھمو) کسی صوفی اور ملنگ کے حلقۂ ارادت میں گرفتار ہیں۔عظیمی صاحب کے دونوں بڑے بھائی فاضل دارالعلوم تھے اس لئے خاندان کو دارالعلوم سے خصوصی فکری اور علمی علاقہ تھا۔عظیمی صاحب نے تحصیل علم کی خارزار وادی میں قدم نہیں رکھا تھا۔عظیمی صاحب کو جو کچھ ان کے پیرومرشد عظیمی صاحب نے عطا کر دیا اس نے انہیں عالمی شخصیت بنا دیا گویا:

کالجوں سے ہے نہ اسکول کے در سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

خالہ امت الرحمٰن مجھ سے ہمیشہ کی طرح نوٹ کرلیں۔میاں اکبر کی شادی ہو چکی تھی۔شادی اور بچے کی پیدائش میں بمشکل نو ماہ کا فصل تھا۔اکبر میاں کو بڑی صاحب استقلال بیوی ملی تھیں اور اولاد کا سلسلہ بھی نو ماہی یا سالانہ تھا۔اب امریکہ میں گیارہ سعادتمند اولادوں کی خدمات کا لطف اٹھا رہے اور کم وبیش پینتیس گرانڈ چلڈرن کے لاڈ پیار اور یاد اللہ میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اکبر میاں نے منت سماجت سے اور لڑ جھگڑ کر اپنی بیگم کو منہ دکھائی کا ایک روپیہ اور بیٹے کو شہد چٹائی کا ایک روپیہ زبردستی دلا کر چھوڑا۔وہ اب امریکہ میں شاد آباد بامراد ہیں۔بیگم اللہ کو پیاری ہو چکیں۔اولاد اس قدر عاقل اور عالم ہے کہ مجھ جیسے بے علم کو ہمیشہ ملاقات

پر کچھ نہ کچھ سبق پڑھا دیتی ہے۔اکبر میاں انبہٹہ میں اپنی چال کی وجہ سے بانڈے کہلاتے تھے اب امریکہ کی کامیابی کے بعد بانکے کہلانے کے لائق ہیں۔

خالہ بھی اپنی دو بن ماں کی پوتیوں (عابدہ اور شاکرہ) کے ساتھ لالوکھیت کے نواح میں ایک بے در دیوار سے گھر میں رہتی تھیں اور انبہٹہ میں گھر کا جو خانگی مدرسہ چھوڑ آئیں تھیں۔وہ یہاں پھر قائم ہو چکا تھا۔الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اوران کی دعا سے ان کی اولاد درا ولاد کو خوب خوب نوازا ہے۔ہمارے لئے وہ اس دور کی رابعہ بصریہ تھیں ہمارے پاس بھی جو کچھ ہے وہ ان کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔

ماموں عثمان انصاری۔گفتار اور کردار:

ایک اور خاص ملاقات ماموں عثمان انصاری اور سلمیٰ مومانی جان سے ہوئی۔یہ لوگ پاکستان بننے سے بہت پہلے سے کراچی میں رہتے تھے اور آم کے موسم میں آم کھانے اور کھلانے کے لئے اور اہل انبہٹہ کی طرح یہ بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ان کا گھر اور بیٹھک شاندار تھے اور بہت سے باغات بھی تھے۔ان کے بڑے بیٹے سلیمان ہمارے ہم عمر تھے۔ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ہم سمجھ رہے تھے ماموں عثمان کی رہائش کسی عظیم کوٹھی میں ہوگی مگر وہ مسلم لیگ کولونی کے ایک بیڈروم کے کوارٹر میں رہتے تھے۔تھوڑی سے ملاقات کے بعد ہم نے ان سے تنگی مکان کا سبب پوچھا کیونکہ ہندو عیسائی پارسی جو بھی کراچی سے ہندوستان گئے انہوں نے بہت عظیم عمارتیں چھوڑیں اور بہت سے مقامی لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔پھر ماموں نے فرمایا: ''بیٹا ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہاں پاکستان بننے سے پہلے ہی بھیج دیا تھا اس لئے ہم آنے والوں کی مدد میں آگے آگے تھے۔ان جائدادوں پر ہمارا حق نہیں تھا۔یہ حق ان کا تھا جو وہاں سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے۔اور ہم نے جن کا حق تھا ان تک وہ حق پہونچانے میں مدد کر دی۔''

''مگر ماموں جان آپ کی بھی تو زمین مکانات باغات تھے جو آپ چھوڑ آئے

تھے۔ان کے بدلے میں تو آپ جائداد لے سکتے تھے۔"

ہم نے پھر سوال کر دیا:

"ہم انہیں اپنی مرضی سے چھوڑ کر آئے تھے۔جب ہم آئے تو پاکستان کا اور ہجرت کا کوئی سوال کسی کے سامنے نہ تھا ہم نے یہ سوچا کہ ہمیں اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے اور جو آرہے تھے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔پھر میاں یہ کیا کم ہے کہ بیٹھے بٹھائے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ملک عطا کر دیا۔حقیقت تو یہ ہے میاں! قائداعظم نے تبادلۂ آبادی کو کبھی نہیں سوچا تھا اور قائداعظم کے کہنے پر ہم اور بہت سے مسلم لیگ کے والینٹیر ہندوؤں کو جاجا کر سمجھا رہے تھے کہ وہ اپنے گھر چھوڑ کر نہ جائیں بہت سے لوگوں نے جاتے وقت اپنی چابیاں بھی ہمارے حوالے کر دی تھیں۔لیکن انہیں ہم نے امانت سمجھ کر قبول کیا تھا اور جن کا حق تھا ان کو پہونچا دیں۔"

پھر ماموں تقسیم سے پہلے کے اور بعد کے واقعات سناتے رہے ان پر ہندو اور پارسی پڑوسیوں کا ذکر کر کے جو ہندوستان چلے گئے ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی تھیں۔اسی طرح ہندوستان میں اپنے وطن انبہٹہ کا ذکر چھیڑا تو ان کا رومال تر ہو جاتا تھا۔انہوں نے انبہٹہ کی یاد میں غزلیں لکھیں تھیں جنہیں سنا کر وہ خود بھی روتے تھے اور اہل انبہٹہ کو بھی رلاتے تھے۔

ان سے معلوم ہوا کہ اسی کولونی میں بی اماں بیگم مولانا شبیر احمد عثمانی اور بیگم مولانا یحیٰی صاحب مولانا کے (بھانجے اور متبنیٰ) بھی مقیم ہیں۔ہم ان کے گھر بھی گئے۔وہ گھر بھی تنگی اور سادگی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔دونوں اللہ والی خواتین کی دعائیں ہم نے سمیٹ لیں۔انہوں نے بہت آسانی سے ہمیں پہچان لیا اور دیوبند کے افراد کی فرداً فرداً خیریت معلوم کرتی رہیں۔حقیقت تو یہ ہے جن لوگوں نے پاکستان کے لئے سچے دل سے قربانیاں دیں ان کے لئے پاکستان کا قیام ہی ان کی قربانیوں کا صلہ تھا لیکن بقول محسن بھوپالی۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

جو شریکِ سفر تھے انہوں نے نیرنگئ سیاست دوران کی شکایت تک نہیں کی۔ پاکستان کے عطیہ کے لئے شکر گزاری تھی۔ ہمیں بھائی جان، ماموں ظاہر قاسمی، چچا حمد اللہ، چچا محامد، سید احتشام کاظمی، ماموں عثمان، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے گھر کے افراد کی سادگی اور بے لوثی میں پاکستان تحریک کا وہ روپ نظر آیا جس نے ایک مبہم خیال کو محکم تحریک بنا کر دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک بنایا۔ لیکن صد افسوس! بہت جلد اس تحریک کے محکمات متشابہات بن گئے۔ اس وقت پاکستان کے ہر گوشے میں وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی قربانی کو قربانی نہیں سمجھا اور پاکستان کو انہوں نے اپنے اخلاص وایمان کی جاگیر کا نذرانہ عطا کیا۔

کراچی کے سترہ دنوں میں ہم نے اپنے اعزاء اقرباء احباب سے ملاقاتوں کے علاوہ سیر وسیاحت بھی کی۔ کراچی کے مہاجرین میں جذبۂ حب الوطنی غیر معمولی تھا۔ ہماری ہندوستانی حب الوطنی نے ہمیں مشکوک کر دیا۔ اور بعض لوگوں نے غدار کے لقب سے بھی نواز دیا۔ اس وقت چند ہی لوگ تھے جنہیں مستقبل کے خدشات کی فکر تھی ورنہ تو وسائل کی فراوانی تھی، ملازمتیں ملازمت کے متلاشیوں کا انتظا کر رہی تھیں نئے نئے مکانات تعمیر ہو رہے تھے اردو کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اخبارات رسائل کتابیں خوبصورت اور دیدہ زیب شائع ہو رہی تھیں ہندو اور ہندوستان سے نفرت بڑھ رہی تھے اگر چہ کرکٹ کے علاوہ کسی بھی دوسرے میدان میں پاکستان کا ہندوستان سے کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن کرکٹ کا ہر میچ پانی پت کا میدان تھا۔

خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا:

سیٹو کے اور بغداد پکیٹ کے ذریعہ امریکن اور برطانوی امداد نے جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ اس جنگ کا ہر شخص منتظر تھا۔ نسیم حجازی، صادق سردھنوی عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے زیر اثر ایک نیا میدان جنگ پھر تیار تھا جس میں مرد مومن کو تاریخی فتح حاصل ہونے والی تھی۔ دلی کا لال قلعہ جسے مسلمانوں نے خود اپنی خوشی سے ہندوستان کے حوالے کیا تھا اب نئے مجاہدین کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ اس پر پھر سے سبز پھریرا لہرا دیا جائے۔ اصل تاریخ نے ہزاروں

صفحات پلٹ دیئے تھے لیکن پاکستانی ابھی تک یاد ماضی کے بوسیدہ اوراق سے مستقبل کے نقوش بنا رہے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ وہ مستقبل کو یاد ماضی کی بنیاد پر تعمیر نہ کر سکے اور۔

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

کراچی کے مہاجر جس ذہنی کشمکش اور تجربے سے گذر رہے تھے اس کا اندازہ ہمیں امریکہ کی شہریت کے بعد ہوا۔ تسنیمہ نے یہ کام بہت آسانی سے کر لیا تھا۔ ان کے سامنے اپنے خاندان کو امریکہ بلا کر آباد کرنا تھا۔ اس لئے انہوں نے فوراً ہی امریکن شہریت اختیار کر کے وہ کام شروع کر دیا اور چند سالوں میں ان کے چھ بھائی اور دو بہنیں بھی امریکہ پہونچ گئیں لیکن جس دسرایت کے لئے یہ کام کیا تھا وہ حاصل نہ ہو سکا امریکہ کی مادیت نے ان کے خاندان کو اپنے دام فریب میں بہت آسانی سے گرفتار لیا۔ بڑی بہن جس حصہ میں تھیں وہ اولاد کی رہین منت تھیں چھوٹی بہن آسیہ کی شادی ہم نے یہ سوچ کر ان کے خاندن کے لندن باسی ڈاکٹر انور علی خان سے کی تھی پھر وہ خود امریکہ نہ آئے، آسیہ کو بھی لندن لے گئے۔

جو لوگ یہاں رہ گئے تھے انہوں نے اپنے سسرال والوں کے ساتھ وہی کیا تھا جو ہم نے اپنی سسرال والوں کے ساتھ کیا تھا۔ اب ان کی سسرال والے اپنی سسرال والوں کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو ان کے ساتھ ہوا تھا یعنی امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی میں قانونی طور پر اضافہ کر رہے ہیں۔

پاکستان کے قیام کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد اسلامی معاشرے میں زندگی کے بہترین مواقع فراہم کرنا تھا۔ وہ ان لوگوں کو چھوڑ بھاگے تھے جن کے نعروں اور قربانیوں نے پاکستان بنایا تھا۔ جو پاکستان پہونچے وہ کبھی یاد ماضی کو بھلا کر مستقبل تعمیر نہ کر سکے جو پاکستان کی علاقائی لسانیت اور تہذیب سے ہم آہنگ ہوتا۔ اب دوسری ہجرت کا

سلسلہ جاری ہے اور امریکہ برطانیہ اور کنیڈا نئی منزل مقصود بن رہی ہے۔ میں نے اس صورتِ حال کے بارے میں لکھا ہے۔

شاخ سے ٹوٹ کے بے سمت سفر سے اپنا
اب جہاں چاہے زمانے کی ہوا لے جائے

عابدؔ

سفرافغانستان

کراچی میں ۷ا دن ملاقاتوں کے علاوہ یہ کوشش بھی جاری رہی کہ افغانستان کس طرح پہونچا جائے۔ میرے پاس پاکستان اور افغانستان دونوں جگہ کا ویزا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ میں براہ راست ترخم کے ذریعہ افغانستان روانہ ہو جاؤں یا پاکستان میں کسی حکومتی ادارے سے اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اب سب کا مشورہ تھا کہ بہتر ہے ہم ہندوستان واپس چلے جائیں تا کہ کسی پیچیدگی کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہندوستان واپسی کے لئے پولس کو رپورٹ لکھوانی تھی۔ ہم چچا جان کے ساتھ پولس اسٹیشن پہونچے۔ آفیسر صاحب نہایت ہی مرد معقول تھے۔ انہوں نے چچا میاں کا بھی استقبال بقدر عمر کے کیا اور ہمیں بھی بطور مہمان کے نوازا۔ انہیں جب چچا میاں سے علی گڑھ کے تعلق کا پتہ چلا تو انہوں نے فوراً چائے اور بسکٹ آرڈر کر دئے گویا:

لو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

ان کا پورا خاندان خورجہ کا پٹھان اور علی گڑھ کا علیگ تھا۔ چچا جان نے ان کے سامنے افغانستان دورے کے مرحلے کا بھی ذکر کر دیا۔ وہ مرد دانا علماء دیوبند کی تحریک آزادی میں شرکت سے بھی کما حقہ واقف اور ان کا معترف تھا۔ اس نے پاسپورٹ دیکھ کر فرمایا: ''ان کے پاس افغانستان کا ویزا ہے۔ میں یہاں سے واپسی درج کر لیتا ہوں اور ایک

ہفتہ کا وقت دیتا ہوں جس میں یہ افغانستان تشریف لے جائیں۔" ہم تو افغانستان کا ارادہ چھوڑ چکے تھے اب پھر سے باب افغانستان کھلنے سے ہماری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ انہیں ہمارے چائے ختم کرنے کی جلدی نہ تھی اب مارے خوشی کے ہمیں جلدی تھی۔ انہوں نے دروازے تک تشریف لاکر خدا حافظ کہا اور چچا میاں سے دعا کی درخواست کے علاوہ ملاقات کرتے رہنے کا وعدہ کرایا۔

افغانستان روانگی اور شری عابداللہ غازی:

اب ہمیں جلد از جلد افغانستان روانہ ہونا تھا۔ ۷؍جولائی ۱۹۵۸ء سے یونیورسٹی کھل رہی تھی اور ہم اواخر جون میں تھے۔ ٹرین کے لمبے سفر سے صحتمند مسافروں کی کھچا کھچ سے تھکے ہارے ہم پشاور پہونچے اور وہاں سیدھے افغانستان کونسلیٹ جمعہ کے مبارک دن پہونچ کر حاضری دی۔ انہوں نے کاغذات دیکھ کر تصدیق کر دی اور کہا کہ ہفتہ میں صرف دو دن پوستہ بس ڈاک لیکر کابل جاتی ہے وہ خوش قسمتی سے تیار تھی۔ ہم اس میں اور مسافروں کے ساتھ بیٹھ کر پشاور کے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ ہمارا دل دھڑک رہا تھا پتہ نہیں خوشی کے سبب یا خوف سے۔ بس کے سب مسافروں کو جن میں اکثر ہندوستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ تھے، ایک ایک کر کے اجازت ملتی رہی۔ سب بس میں بیٹھ گئے مگر میرا نمبر نہیں آیا۔ میں نے آفیسر صاحب سے درخواست کی کہ میرے کاغذات پر بھی توجہ کریں۔ انہوں نے غصہ سے میری طرف دیکھ کر کہا: "کیا تجھے بہت زیادہ جلدی ہے"؟ میں نے ادب سے عرض کیا کہ "باقی مسافر جا چکے ہیں اور میرا انتظار ہو رہا ہے۔" اس نے پاسپورٹ کا صفحہ اٹھا کر نام پڑھا: "شری عابداللہ غازی" پھر فرمایا: "تو ہندو ہے؟"

میں نے عرض کیا: "کیا عابداللہ غازی ہندو کا نام ہے؟"

اس نے اعتراض کیا: "یہ شری کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا: باقی پاسپورٹوں پر بھی شری لکھا تھا ان سے آپ نے نہیں پوچھا۔"

اس نے غصہ سے کہا: ''تجھے زیادہ ہی بولنا آتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی شری لکھواتے ہوئے۔'' میں نے پھر غصہ دباتے ہوئے مؤدبانہ عرض کیا: ''ہندوستان کے ہر پاسپورٹ پر شری چھپا ہوا ہوتا ہے۔اس میں ہمارا اختیار نہیں''۔اس کا مطلب مسٹر ہے۔

پھر اس نے سوال کردیا: ''تیرا افغانستان میں کیا کام ہے۔تو جسوس ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''کوئی جاسوس اپنے منھ سے جاسوسی کا اقرار کب کرتا ہے۔''

پھر میں نے دادا ابا کی جہاد آزادی میں شرکت ریشمی رومال تحریک افغانستان میں ہماری فیملی کی موجودگی اوران سے ملاقات کے اشتیاق کا ذکر کیا۔اس نے سوسوالوں کا ایک جواب دے دیا۔''تو نہیں جاسکتا'' میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمیں کھسک گئی۔اب میں منت سماجت پراتر آیا۔مگر وہ شری لکھوانے پر اتنا برہم ہوا کہ مجھ سے صاف صاف کہہ دیا: ''میں اس پر اندراج نہیں کررہا ہوں جب تو لاہور کا بارڈر کراس کرے گا تب تجھے پتہ چلے گا۔تجھے سرکاری مہمان خانے میں مزا آئے گا۔''

بہت بے آبرو ہوکر لاہور واپسی:

اب میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل رہی تھی ادھر بس کا ڈرائیور اور مسافر بے چین ہورہے تھے اس نے اپنے اسسٹینٹ سے کہا ڈرائیور سے کہو اسکا سامان نکال دے۔ڈرائیور نے سامان نکال کر سڑک کے کنارے لگادیا اور یہ جاوہ جا ہوگیا۔دفتر جمعہ کے سبب فوری بند ہوگیا۔گرمی ٹھاٹیں ماررہی تھی۔کچھ سفر کی تکان کچھ آفیسر کی جہالت سر بری طرح چکرارہا تھا۔میں سڑک پر سامان سمیت تنہا کھڑا تھا کہ وہی اسسٹنٹ آ گیا۔اس نے پٹھانی لہجے میں بہت معذرت کی اور آفیسر کو دواک گالیاں بھی دیں۔

پھر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرکے کہنے لگا: ''ہم اس افسر کو دکھانے کے لئے چلا گیا تھا۔اب اس کے جانے کے بعد واپس آیا ہوں۔ہم کو تمہارا پورا قصہ معلوم ہے۔ہمارے خاندان نے بھی اس تحریک میں کام کیا تھا۔اس جاہل آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ان علماء نے کیا قربانیاں دیں

تھی جس کا پھل پاکستان ہے۔ یہ حرامزادہ ہے۔ یہاں بیٹھ کر یہ مسلمان کو پریشان کرتا ہے۔"

میں نے کہا یہ کون ہے: "اس نے بے دھڑک کہا یہ قادیانی ہے اور سیالکوٹ کا رہنے والا ہے۔ یہ پٹھان کا ملک ہے ادھر پٹھان کو نوکری نہیں ملتا پنجابی کو ملتا ہے!"

اس نے پوچھا ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔ میری ڈائری میں قصہ خوانی بازار کے ایک افغانی دکاندار موسیٰ جان کا پتہ تھا۔ میں نے وہ دکھا کر کہا کہ تم وہاں پہنچوادو۔ اس مرد خیر نے تانگہ لاکر اس میں سامان رکھ کر پتہ سمجھا دیا اور پیسے دینے لگا لیکن میں نے باصرار منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔

میں قصہ خوانی بازار کی اس دکان میں جا اترا۔ موسیٰ خان کا اصل تعلق جلال آباد سے تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور مسئلہ بتایا۔ وہ بجائے خوش ہونے کے ناراض ہونے لگے، "ادھر افغانستان میں بیٹھ کر وہ لوگ نہیں سمجھتا ادھر ہم کو کتنے عذاب ہے۔ آپ ہندوستان سے آیا ہے، افغانستان جارہا ہے، آفیسر سے جھگڑا کرتی ہے اور ہم کو حکومت مصیبت میں ڈالتی ہے۔" میں نے اس سے کہا: "میرا ارادہ ستیہ گرہ کرنے کا ہے میں گورنر کی کوٹھی پر جاکر بھوک ہڑتال کروں گا۔" اس نے گھبر کر کہا: "او بئی تو اودر جائے گی ادھر وہ تجھ کو جیل میں ڈالے گی اور ہم کو بھی ساتھ میں ڈالے گی۔" میں نے کہا: میرے پاس بی۔اے۔کی ڈگری ہے وہ مجھ کو کم از کم بی (B) کلاس جیل دیں گے"

وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے اور کہا: "یہ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی کیا ہوتی ہے۔ میں نے کہا: "ہندوستان کے قانون میں سیاست دانوں کو اور تعلیم یافتہ لوگوں کو جیل میں آرام سے رکھا جاتا ہے۔" اب خاں صاحب کا پارہ بہت اوپر چلا گیا اور انہوں نے بآواز بلند کہا:

"بئی ہندوستان میں قانون ہے اس پر عمل ہوتی ہے اور پاکستان میں قانون ہے اس پر عمل نہیں ہوتی۔ تم افغانستان جارہے ہو وہاں نہ قانون ہوتی نہ عمل!" ہمارا بات سنو تم سیدھا ہندوستان جاؤ اور ہمارا پیچھا چھوڑو۔" ان کے ساتھ ہم جمعہ کی نماز کو گئے۔ پھر انہوں نے کھانا کھلایا۔ شام ہوئی تو ہم چچا میاں کے ارسال کردہ دوسرے پتہ پر ملاقات کے لئے

گئے۔جو حاجی صاحب ترنگ زئی کے اولاد یا عقیدت مندوں میں سے کسی کا تھا۔وہاں بھی خان صاحب کی طرح کا خاطر خواہ استقبال ہوا۔انہوں نے کہا کہ ان کے پیچھے پہلے سے آئی بی آئی ہے اور ہماری مہمان داری سے ان پر اور قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ہم جتنی جلدی ان کے گھر سے نکل جائیں تو بہتر ہے میری ٹرین دوسرے دن تھی۔خان صاحب نے محلے کی گلی میں میرے لئے چارپائی ڈلوادی۔رات کا کھانا گھر میں سخت پردہ کرا کے کھلا دیا۔گلی میں ایک نئی چارپائی دیکھ کر محلے والے جوق در جوق آنے لگے اور ہندوستان کے بارے میں بہت سے سوالات کرتے رہے۔

ان لوگوں سے گفتگو پر مزاح تھی اور وہ بتارہے تھے حکومت اگر کسی کو مہمان رکھتی ہو تو پھر اس کو باہر کی روشنی نصیب نہیں ہوتی۔ہر شخص چائے اور کھانے کو بھی پوچھ رہا تھا۔سونے سے پہلے ان لوگوں نے شب بخیر کہا اور فرمایا: ''تم شریف آدمی کا بچہ لگتا ہے۔اور جتنا مہاجرین کا بچہ آیا ہے وہ سالا بنگی (بھنگی) کا اولاد ہے۔''میں نے سب کو مخاطب کر کے کہا: ''خانصاحب میں اگر اپنا وطن چھوڑ کر یہاں رہوں گا میں بھی سالا بنگی کا اولاد کہلاؤں گا۔''اس بات پر بہت پر زور قہقہہ لگا۔پھر میں نے کہا: ''جو آدمی اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر رہتا ہے وہ بنگی کا اولاد کہلاتا ہے۔''ان میں سے کچھ نے میری تائید میں سر ہلایا کچھ نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر خدا حافظ کر کے وہ بھی اپنی چارپائیوں پر پسر گئے۔صبح ہر گھر سے چائے اور تندوری روٹی ناشتہ آنے گا۔موسیٰ خان نے کباب پراٹھے کا ناشتہ کرایا۔حکومت کو بہت سی گالیاں دیں اور مجھے لیجا کر اسٹیشن پر چھوڑ دیا۔اب میرے پاس ان چار دنوں کا جو سفر و حضر میں گذرے لاہور پولیس یا بارڈر پولس کے لئے کوئی تحریری حساب نہ تھا۔مجھے ڈر تھا کہ کہیں واقعی اس قانون شکنی کی جزا کے طور پر میں سرکاری مہمان خانے میں نہ داخل کرادیا جاؤں۔

لاہور واپسی۔پولس رپورٹ اور علی گڑھ تک:

لاہور اتر کر میں بھائی آفاق کے گھر نہیں گیا بلکہ سیدھا پولس اسٹیشن ریکارڈ

کرانے کے لئے چلا گیا۔ وہاں کہیں کوئی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں پر ایک فرشتہ صفت آدمی نظر آئے وہ میری داستان سننے کو تیار تھے لیکن کچھ کر نہ سکتے تھے۔ میرے لئے اس تنکے کا سہارا بھی اس کسمپرسی کے عالم میں شہتیر ثابت ہوا۔ ان کا تعلق یو پی سے تھا۔ انہوں نے بتایا چیف پولیس آفیسر بدایوں کے ہیں اگر آپ کی رسائی ہو جائے تو کام بن جائے گا۔

ان بزرگ کا شاید روحانی تصرف تھا کہ میرے دماغ میں خیال کی چنگاری چٹکی میں نے ان بزرگ سے کہا کہ اگر وہ پندرہ منٹ میرے سامان کی دکھ بھال کر لیں تو میں ان چیف صاحب سے مل کر آتا ہوں انہوں نے حیرت سے پوچھا: ''ملو گے کیسے؟ میں نے عرض کیا: ''واپسی پر آپ کو بتاؤں گا۔'' وہ تیار ہو گئے اور میں چیف صاحب کے دفتر کی طرف پوری خود اعتمادی سے روانہ ہوا۔ گارڈ نے مجھے روکا تو اسے میں نے اپنا یونین آنریری سیکریٹری کا کارڈ دے کر کہا: ''خالو جان کو پہونچا دو۔'' گارڈ نے جھک سلام کیا اور اندر چلا گیا فوراً واپس آ کر کہا: ''صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

وہ کسی اہم میٹنگ میں تھے مجھے اشارے سے بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ میٹنگ ختم ہو گئی۔ اب کمرے میں صرف خالو جان اور سیکریٹری تھے۔ انہوں نے بلا کر رشتہ پوچھا میں نے عرض کیا: ''انسانیت کا، میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم اور سخت پریشان ہوں آپ کی میں نے بہت تعریف سنی ہے اس لئے آپ سے پانچ منٹ درکار ہے۔'' انہوں نے فرمایا: ''کہئے کیا بات ہے؟''

میں نے کم و بیش ۵ منٹ میں دادے ابا کی جلا وطنی تحریک شیخ الہند اور اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے پشاور کے آفیسر کا ذکر کیا جس نے مجھے اس پریشانی میں ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا آپ کیا چاہتے ہیں۔

میں نے عرض کیا: ''پاکستان سے باعزت طریقہ سے اپنے وطن ہندوستان جانا۔''

فرمایا: ''اتنی جلدی کیا ہے؟''

عرض کیا: یونیورسٹی کھل رہی ہے دوسرے میرے پاس ان چار دن کا حساب نہیں جو سفر کی نذر ہو گئے۔"

فرمایا: آپ افغانستان کیوں نہیں جاتے؟

میں نے عرض کیا: "اپنی سی کوشش کر چکا اب ہمت نہیں۔"

فرمایا: "واہ جوان آدمی ہوکر اور علی گڑھ کے طالب علم ہوکر آپ علی گڑھ کے نام کو رسوا کریں گے۔ اب ہم آپ کو افغانستان بھیجیں گے۔ اور آپ وہاں سے ہمارے لئے پانچ کلو پستہ لے کر آئیے گا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرا دیئے۔ جس سے معلوم ہوا وہ حقیقتاً نہیں وہ تفریحاً یہ بات کہہ رہے تھے۔

پھر سیکریٹری سے کہا: "یہ آفیسر افغانستان کے لئے کلیرنس نہیں دیتا ہے اس کی بہت شکایات آرہی ہیں اسے بلوچستان کے کسی غیر آباد علاقے میں بھجوا دینا چاہئے۔" پھر مجھ سے فرمایا: "اس شخص کی فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں دو ہفتہ کے قیام کی اجازت دیں گے تم دو ہفتہ کے اندر اندر افغانستان چلے جاؤ اور اس بار اس چوکی پر رپورٹ نہ کرنا بلکہ براہ راست ترخم چلے جانا۔ میں نے اس کاغذ پر اپنے آفس کے اور گھر کے نمبر لکھدیئے انہیں تم اپنی ڈائری میں بھی نوٹ کر لینا۔ اگر ضرورت پڑے تو اس آفیسر کو میرا کارڈ دکھانا اور کہنا مجھے فون کرلیں۔"

میں بہت سے شکریے ادا کر کے باہر نکلا، سیکریٹری مجھے رخصت کرانے کے لئے آیا۔ تانگہ بلا کر اس میں سامان رکھوا دیا۔ ان بزرگ نے فرمایا: "میں آپ کے لئے دعا کر رہا تھا۔" میں نے عرض کیا: "آپ کی دعا کام کرگئی۔"

لاہور سے پشاور واپسی:

سمن آباد میں دو دن بھائی آفاق صاحب کے یہاں قیام کر کے پھر سے پشاور پہونچا۔ پستہ بس کا ٹکٹ خرید کر پھر افغانستان جانے کے لیے اس میں بیٹھا اور پولس چوکی پر

حسب ہدایت پاسپورٹ نہیں درج کرایا۔ پھر ترخم پر رپورٹنگ تھی ڈرائیور نے سب کے پاسپورٹ جمع کر کے آفیسر صاحب کو بھیج دیئے۔ گرمی حسب معمول سخت تھی۔ سب کے پاسپورٹ آ گئے مگر میرا نہیں آیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد دفتر کا چپراسی آیا اور عابد اللہ غازی کو آواز دی۔ میں نے عرض کیا حاضر ہوں۔ انہوں نے کہا: ''بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' راستہ میں میں نے ساری دعائیں پڑھ ڈالیں۔ آفیسر صاحب نے بہت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ چپراسی سے کہا روح افزا لائے اور کچھ کھانے پینے کا عمدہ سامان بھی لاؤ۔ پھر مسکرا کر پوچھا: ''آپ علی گڑھ میں کس ہاسٹل میں رہتے ہیں۔'' میں نے بتایا آفتاب میں انہوں نے کہا میں ممتاز میں رہتا تھا۔ جان میں جان آئی۔

پھر علی گڑھ کے سب اساتذہ کی خیریت پوچھنی شروع کر دی۔ اتنی میں چکن بروسٹ، آلو کی ٹکیا، اور بسکٹ چائے آ گئی۔ ہم لوگ بہت آرام سے خس کی ٹٹی میں بیٹھے تھے۔ باہر قیامت کی گرمی میں بس کھڑی تھی اور مجھے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ منت سماجت کر کے اجازت چاہی اس شرط پر کہ واپسی میں ان کے ساتھ قیام کروں گا۔ خود وہ حضرت بس تک آئے۔ بس ڈرائیور کے بعد کی پوری سیٹ کو ایک حکم سے میرے لئے خالی کرا دیا۔ وہاں جو لوگ بیٹھے تھے وہ اب اوپر چھت پر سورج کی تمازت سے لطف اندوز ہونے کے لئے چلے گئے۔ اس سیٹ پر دو پاکستان کے تاجر بھی تھے جو انڈسٹریل نمائش میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ میری درخواست پر ان کو سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ جو مراعات میرے سینیر علیگ نے مجھے دلا دیں تھیں اس سے آرام تو تھا ہی لیکن اس سے زیادہ شرمندگی ان لوگوں سے تھی جنہیں میری وجہ سے بے سیٹ کیا گیا تھا۔

دو گام منزل کی طرف:

بس چلی تو راستہ کی زخم خوردہ سڑکوں نے تشریف سمیت جسم کے ہر حصے کی خبر لی۔ ترخم کراس کر کے افغانستان سائڈ لنڈی کوتل میں پولیس نے استقبال کیا۔ وہ قرون اولی

کے مسلمان مجاہدین کے لباس میں تھے۔ یعنی شکستہ جوتے، پھٹی ہوئی وردیاں، اس نے پاسپورٹ دیکھا پھر کہا ''پچکاری'' ہم سمجھنے سے قاصر رہے بالآخر کسی پڑھے لکھے افغان نے بتایا صحت کے ٹیکہ کا سٹرفکیٹ مانگ رہا ہے۔ میرے پاس وہ سٹرفکیٹ تھا۔ لیکن میرے دونوں پاکستانی ساتھیوں کے پاس نہ تھا۔ میں نے ان سے کہا: ''جیب میں دیکھئے کوئی کاغذ ہے۔'' انہوں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو پشاور کی شاپنگ کی رسیدیں مل گئی۔ میں نے وہ رسیدیں پیش کر دیں اس نے ہاتھ کے اشارے سے حدود افغانستان میں داخلے کی اجازت ہم لوگوں کو مرحمت فرمادی۔

اب بس جو چلی تو دھکوں مکوں کا اضافہ ہی اضافہ تھا۔ راستہ میں فوجی ملے جن کو چھٹی ملی تھی لیکن ان کے پاس گھر پہونچنے کا کرایہ نہ تھا۔ یہ لوگ بس کے اوپر زبردستی چڑھ گئے۔ ڈرائیور بس کو سڑک سے ہٹا کر ایک میدان میں لے گیا۔ پھر دہاں بس کو روک کر اس نے اور کنڈکٹر نے ایک ایک سپاہی کو ٹانگ پکڑ پکڑ کر کھینچا اور پٹائی کرنا شروع کی۔ وہ لوگ پشتو میں اس سے منت سماجت کر رہے تھے۔ وہ پشتو میں ہی ان کو گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ان فوجی جوانوں کو لق و دق میدان میں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن دیکھا تو تھوڑی تھوڑی دیر میں اس طرح کے فوجی مل رہے تھے۔ جو اپنے گھروں کو چھٹی گزارنے جا رہے تھے۔ لیکن ان کے پاس نہ پیسہ تھا نہ ٹرانسپورٹیشن۔

کئی دن سے سفر ہی سفر چل رہا تھا، میں تھکن سے چور تھا۔ جلال آباد لنڈی کوتل سے صرف چند گھنٹوں کا سفر ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ گھر قریب تر ہو رہا ہے۔ جہاں دادی اماں چچا میاں اور سب اعزا سے ملاقات ہو گی دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کم و بیش ایک ماہ کی جدوجہد اور عمر بھر کی تمناؤں کا ثمرہ بہت قریب تھا۔ جلال آباد آ گیا۔ بس رکی وہاں مزدور بھی مل گیا اس کے ساتھ قلعہ مولانا منصور روانہ ہوا۔ مزدور کو پتہ معلوم تھا قلعہ کے دروازے کے اندر کئی مکانات تھے۔ مزدور نے ایک دروازے پر دستک دی میں چچا میاں سے گلے ملنے کے لئے

تیار تھا۔وہاں سے ایک ضعیف العمر شخص نکلا جس میں چچا میاں کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔اس نے کہا:''آج صبح وہ لوگ کابل روانہ ہو گئے!''

جلال آباد سے کابل روانگی:

میں نے پوچھا:''کابل میں کہاں قیام ہے'' تو اس نے دونوں ہاتھوں کو اور ہونٹوں کو ہلا کر بتایا کہ''خدا جانے مجھے کچھ خبر نہیں۔'' گھر آ کر تھکن اترنے کا احساس ہوا تھا لیکن ایسا لگا جسم سے کسی نے جان نکال دی۔چند لمحوں میں فیصلہ کرنا تھا کہ گھر پر رک جاؤں یا شہر کابل میں جا کر چچا میاں کو تلاش کروں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بس مجھے چھوڑ کر روانہ ہو گئی تھی میں موٹر اسٹینڈ کی طرف دوڑنے لگا۔بس جا چکی تھی ایک صاحب اس سمت سے بائسکل پر آ رہے تھے جدھر بس گئی تھی۔انہوں نے کہا:''یہاں سے کچھ دور بس نماز مغرب کے لئے رکے گی۔دوڑ کر جاؤ شاید مل جائے۔'' میں نے اس سے پوچھا:''تمہیں پتہ ہے قاری صاحب کابل میں کہاں ٹھہرتے ہیں؟'' اس نے کہا''شاہ جی کی دکان دوا فروشی پر وہ اکثر بیٹھتے ہیں۔'' اب میں نے اور مزدور نے پھر دوڑنا شروع کر دیا۔کچھ بس کے مسافروں نے ہمیں دوڑتا ہوا دیکھ لیا۔اور بس ہمارے انتظار میں رکی رہی۔بس تو مل گئی مگر بے بسی کا سامنا تھا میری سیٹ چلی گئی اور کہیں چھت کے علاوہ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ڈرائیور اور ان پاکستانی احباب نے مدد کی ٹھوسم ٹھاس مجھے بس میں گھسا لیا۔سخت تنگی تھی،کابل کا سفر طویل تھا،راستہ خراب اور بس ڈانواڈول۔مرتا کیا نہ کرتا۔نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ہمت کو دعوت دیتا رہا وہ جواب دیتی رہی میں سوال کرتا رہا۔بس پہاڑوں،دروں،خندقوں سے گذر رہی تھی کبھی دریا کے ساحل کے کنارے پر چل نکلتی خوب کھل کر چاند نکلا تھا لیکن یہاں تو حال یہ تھا۔

روداد اپنے غم کی ہم کیا کہیں کسی سے
لگتی ہے چوٹ دل پہ تاروں کی روشنی سے

کابل آمد:

صبح کے چار بجے کے قریب ہم کابل پہنچے۔ یہاں موسم کا حال پشاور اور جلال آباد سے الٹا تھا۔ راستے بھر موسم سرد ہوتا چلا گیا۔ کابل پہونچے تو سب کی گگھی بندھ گئی۔ ہم بش شرٹ اور پتلون میں تھے اور ہمارے پاکستانی دوست شلوار اور قمیص میں۔ ڈرائیور نے کچھ پشتو میں کہا اور روانہ ہوگیا۔ باقی لوگ بھی چل دیئے ہم نے ایک جانے والے کو روک کر پوچھا ڈرائیور نے کیا فرمایا: ''اس نے کہا اب رات کو دیر ہوگئی صبح آ کر سامان لینا۔'' سب لوگ رخصت ہوگئے اور ہم کو موسم سرما سے مقابلے کے لئے چھوڑ گئے۔ سردی سے ہم تینوں کی بری حالت تھی۔ اپنی بس کے دروازے پر زور آزمائی کی باقی کھڑی ہوئی بسوں کو ٹٹولا۔ ایک بس کا دروازہ کھلا ہوا مل گیا جس میں ہم تینوں نے پناہ لے لی مگر ٹمپریچر اندر باہر برابر تھا۔ رات بھر درجہ نو میں انگریزی کہانی کی یاد آتی رہی۔

صبح ہوئی تو بیت الخلاء کی ضرورت پڑی۔ ایک صاحب اتفاق سے گذرے ان کو اپنا مقصد سمجھایا انہوں نے نشان دہی کی جس سے ہم یہ سمجھے ہم سامنے جائیں۔ سیڑھیاں اتریں وہاں ہر چیز کا انتظام ہے۔ ہم سمجھے اس دار السلطنت میں انڈر گراؤنٹ بیت الخلا ہے۔ موقعہ پر پہونچ کر دیکھا تو کہیں بیت الخلاء نظر نہیں آئی۔

غور کرنے پر اس افغان کا مفہوم واضح ہوگیا۔ سیڑھیوں سے اتریں تو دریائے کابل آہستگی سے بہہ رہا تھا۔ اس کے گرد اپنی چادر کا پردہ کئے افغان بیٹھے ہوئے تقاضاء فطرت پورا کر رہے تھے۔ افغان لوگ ایک چادر گرمی سردی کاندھے پر ڈالے رہتے ہیں جس کے ایک درجن فوائد بتائے جاتے ہیں جن میں عام فہم تولیہ، بستر، جانماز، اوڑھنے کی چادر، سودا سلف لانے کا تھیلا وغیرہ ہیں اس کے نئے استعمال کو آنکھوں سے دیکھا اور دریائے کابل سے مستفید ہونے والوں کے سلیقہ پر رشک آیا۔

مگر ہم کیا کریں کہ پتلوں و بش شرٹ میں ہیں۔ پتلوں کھول کر بیٹھنا مشکل اور بش شرٹ کو گھسیٹ کر ستر ڈھکنا ناممکن تھا۔ ساتھ غیور پٹھانوں کے جذبہ غیرت سے عزت

اور جان کا خطرہ! لیکن تقاضے کا وہ زور کہ ہم جان داؤں پر لگانے کے لئے تیار ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ اتنے میں زور سے کسی نے لات رسید کی۔ میں گھبرا کر شرمندگی کا اظہار کرتا ہوا کھڑا ہو گیا مگر وہ ایک نابینا گدھا تھا۔ میں اس سے معذرت کر کے پھر بیٹھ گیا۔ الحمد للہ کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ ہم بس پر پہونچے تو سب اپنا اپنا سامان لے کر جا چکے تھے ہمارا سامان زمین پر رکھا ہوا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

ہم اس مقام پر تھے کہ جیب سے سب پیسے غائب ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہ جی عطار کو کہاں تلاش کریں۔ ہم ہندوستان میں بہت سے شاہ جیوں سے واقف تھے اور ہمارے خاندانی ناموں میں ہمارا ایک نام شاہ جی بھی تھا۔ مگر جن شاہجیوں سے ہم واقف تھے وہ گیروے یا سبز کپڑے پہنتے تھے لمبی زلفیں اور اس سے لمبی داڑھی رکھے تھے۔ اب ہم ایک مزدور کے ساتھ شاہ جی عطار کی دوکان کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ مل کر نہیں دے رہی تھی۔ ہم کو ایک دکان روشن فارمیسی نظر آئی اس پر دوا فروشی بھی لکھا تھا۔ ہم کو یاد آیا کہ جلال آباد کے رہبر نے ہم سے شاہ جی دوا فروش کہا تھا لیکن ہم نے شاہ جی کی نسبت سے اسکا ترجمہ عطار کر دیا تھا۔ ہم روشن فارمیسی کے کھلنے کا انتظار کرتے رہے اور جیسے ہی وہ کھلی ہم نے شاہ جی دوا فروش کا پتہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ جی دوا فروش نہیں ہیں وہ افغان افواج کے ڈپٹی کمانڈر انچیف رہے ہیں ان کی فارمیسی کا نام زمان فارمیسی ہے۔ اسکا انہوں نے پتہ بھی اس مزدور کو سمجھا دیا۔ اس نے زماں فارمیسی پہونچا دیا جو اس وقت بند تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ بچا تھا وہ اس کے حوالے کر کے کہہ دیا ''ختم شد'' مسکرا کر جو ملا اس پر وہ راضی ہو کر چلا گیا۔

میں سیڑھیوں پر سامان سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہی تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ فارمیسی کا ملازم کھولنے کے لئے آیا تو اس نے مجھے اٹھا کر پوچھا تم کون ہو؟ بچپن میں میں نے فارسی پڑھی تھی۔ اس وقت ثقیل اردو اور آسان فارسی کی مدد سے اس کو دادے ابا اور چچا میاں کا

تعارف کرانے کے بعد عرض کیا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں مجھے نیند کی ضرورت ہے۔ اسی لڑکے نے سامان اٹھا کر دکان میں رکھ دیا اور میں نے نیند کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہاں سے جوڑ دیا۔ میں فارمیسی کے ہال کے بیچ میں زمین پر سامان پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اس درمیان میں لوگ آتے جاتے رہے۔ فارمیسی میں جھاڑو لگی اس کے منیجر نے فارمیسی کے انچارج سے میرے بارے میں سوالات کیئے کسٹمر آئے اور گئے لیکن وہاں میں سوتا رہا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا میں کہاں ہوں؟ اور کیوں ہوں؟

چچا میاں سے ملاقات:

تین چار گھنٹے مسلسل سونے کے بعد اٹھا تو بھوک بھی لگی تھی اور چائے کو بھی بے تحاشہ دل چاہ رہا تھا۔ فارمیسی کے انچارج نے کہا کہ زماں صاحب آ گئے ہیں اور کمرے میں موجود ہیں۔ میں نے زماں صاحب سے ملتے ہی فرمائش کر دی۔ ''میں بھوک سے بے قرار ہوں چائے اور روائے کا طالب ہوں میرے پاس ادا کرنے کے لئے پیسے بالکل نہیں ہیں۔'' زماں صاحب نے پوچھا کہ: ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟۔ میں نے جیسے ہی قاری حمید میاں کا نام لیا وہ ساری کہانی سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا'' پیدا می کنم۔'' پیدا کرنے کا مطلب فارسی میں تھا کہ بلاتا ہوں۔ ادھر چائے اور اس کے ساتھ نان کابلی آ گیا۔ اور میں خاموشی سے ناشتہ میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں چچا میاں دروازے سے داخل ہوئے۔ میں نے ان کو ڈھائی سال کی عمر میں ۱۹۳۷ میں دیکھا تھا اور تبھی انہوں نے مجھ کو دیکھا تھا لیکن ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں چند لمحے بھی نہیں لگے اور مجھ میں ایسی طاقت آئی کہ میں چائے روٹی چھوڑ کر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ زماں صاحب نے ہنس کر کہا اب آپ ہمارے مہمان ہیں ہم کہیں نہیں جانے دیں گے۔ چچا میاں نے بھی کہا آپ آرام سے چائے ختم کر لیں۔ گھر قریب ہی ہے وہاں سب آپ کے منتظر ہیں۔

غلام محمد صاحب کی مہربانی:

زماں فارمیسی سے چچا میاں کی نئی قیام گاہ پہونچے جو کابل کے محلہ اندرابی میں تھی۔ وہاں بی بی جان (دادی اماں) پھوپی فردوسیہ، امیت اللہ، عبید اللہ خاں اور سیف اللہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ چچا میاں دراصل اپنے دوست غلام محمد صاحب کے گھر ٹھہرے تھے۔ افغانستان میں موسم گرما میں جلال آباد کے لوگ کابل آجاتے ہیں اور سردیوں میں کابل کے لوگ جلال آباد چلے جاتے ہیں۔ وہاں کرائے پر گھر لینے کا رواج عموماً نہیں ہے۔ یہ کام تعلقات کی بنیاد پر چلتا ہے۔ ہر گھر میں دس بیس لوگوں کی رہائش کے لئے کمرے اور ساز و سامان تیار رہتا ہے۔اب پورا موسم گرما ہمارے خاندان کو غلام محمد صاحب کے یہاں گزارنا تھا۔ غلام محمد کی بیگم اور شاہ جی صاحب کی بیگم بہنیں تھیں۔ان کی ایک بہن شیریں جان غیر شادی شدہ تھی اور اس سے سے ہمارے چچا عبید اللہ شادی کرنا چاہتے تھےلیکن دادی مخالفت کررہی تھیں کہ وہ فیشنی ہےاور برہنہ ہے۔ برہنہ کا مطلب تھا موزے کے اوپر اسکرٹ پہنتی ہے۔

غلام محمد سے ملاقات ہوئی تو بے تکلف ہونے میں چند منٹ لگے۔میں نے انہیں ملی جلی اردو فارسی میں اپنا سفرنامہ سنایا تو انہوں نے خوش ہوکر فرمایا: ''خوب گپ است''،یعنی خوب گپ ہے۔ میں ان کے اس جملے سے تشویش میں بھی پڑا مگر اسے ان کی خوش مزاقی سمجھا۔میں جس قدر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ گپ نہیں ہے سچ اتنا ہی وہ کہتے کہ بہت خوب گپ ہے۔ میں کہتا سچ کہتا ہوں گپ نہیں کہتا۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا فارسی میں ''اچھی گفتگو'' کو گپ کہتے ہیں۔ یہ فارسی کی گپ اردو کی گپ سے کس قدر مختلف نکلی ہے۔

دوپہر میں بخاری یا کابلی پلاؤ کی دعوت تھی۔روٹیاں تندور میں اتنی پکی تھیں میں سمجھا میرے اعزاز میں محلہ بھر کی دعوت ہے۔میں نے چچا میاں سے پوچھا کہ کتنے اور لوگ کھانے پر آرہے ہیں تو انہوں نے فرمایا بس گھر کے لوگ ہیں۔میں نے روٹیوں کی طرف اشارہ کر کے کہاں روٹیاں اتنی کیوں پکائی ہیں۔ چچا میاں نے فرمایا کھانے کے لئے۔

مگر کھانے کے بعد بھی آدھی روٹیاں بچ رہیں۔ پھر میں نے چچا میاں سے پوچھا اتنی روٹیاں ضائع ہوں گی؟ انہوں نے فرمایانہیں کھائی جائیں گی۔ چنانچہ کھانے کے بعد چائے آئی اور روٹیاں اس کے ساتھ بھی کھائی گئیں۔ پھر فروٹ آئے روٹیاں ان کے ساتھ میں ٹھونگی گئیں پھر پنیر آیا تو پھر روٹیوں کی یاد آئی۔ پھر شام کی چائے آئی تو روٹیاں شریک محفل رہیں۔ شام کو پھر اتنی ہی روٹیاں تندور میں لگیں۔

وہاں ہماری دعوتیں شروع ہوگئیں جو بلاتا وہ اوروں کو بھی دعوت دیدیتا۔ کچھ ملنے والوں سے چچا میاں کہہ دیتے پھر راستہ میں جو ملتا اس کو دعوت دیدی جاتی۔ میں نے چچا میاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ مناسب نہیں کہ آپ میزبان کے دسترخوان پر اس فراخ دلی سے دوسروں کو دعوت دیں۔ انہوں نے غصہ سے فرمایا: ''تمہیں کیا پتہ کیا مناسب ہے۔؟ جن کے گھر پہونچتے ان کے ہاں باقاعدہ سب کے کھانے کا انتظام ہوتا۔ دعوت خاص کو دعوتِ عام بنادینا افغانستان کی تہذیب ہے۔

یہ داؤد خاں کا زمانہ تھا۔ سویت یونین سے تعلقات بڑھ رہے تھے۔ کابل میں انڈسٹریل نمائش لگی تھی۔ ہندوستان کی انڈسٹریل نمائش کے مقابلے میں یہ مختصر تھی لیکن افغان لوگوں کو اس پر بہت فخر تھا۔ روس کا ہر طرف بول بالا تھا۔ شٹل کاک برقعہ ہر عورت کے لیے لازمی تھا۔ عام طور پر خواتین موزوں سے ٹانگوں کو ڈھک کر اسکرٹ اوپر پہنتیں پھر برقعہ اس کے اوپر ہوتا۔ انڈسٹریل نمائش کے لئے خواتین کی خصوصی بسیں تھیں۔ لیکن خواتین کے چڑھنے اور اترنے کی جگہ نوجوانوں کی وہ بھیڑ اور سامان بدتمیزی تھا کہ خواتین کی حفاظت مشکل تھی۔

افغانستان میں دادے ابا کے شاگرد اور عمائدین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک خاص ملاقات علی گڑھ کے دوست عبدالخالق رفیقی افغاں سے ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ سے علوم سیاسیات میں ایم۔اے کیا تھا کابل میں وہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔ قندھار میں ان کے باغات تھے جہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ پھل اور میوہ جات آتے تھے۔ گھر کا دستر

خوان بھی بہت وسیع تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی بہت ذہین اور شریر تھے ان کا کار کے ایکسڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔عبدالخالق ننگہارد (جلال آباد) کے گورنر ہو گئے۔ صدر تر کی کے دور میں شہید کردیے گئے۔ ان کی ساتھ علی گڑھ کی یادیں تازہ ہوتی رہتی تھیں۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

کابل چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا تھا۔ اس کے درمیان سے دریائے کابل گزرتا تھا۔کابل کے قریب پغمان شہر تھا جہاں کے باغات مشہور تھے۔ وہاں پر شاہ جی صاحب کا باغ اور کوٹھی تھی جہاں موسم گرما میں پکنک کے لئے جاتے تھے۔ شاہ جی ان طلباء کے گروپ میں سے تھے جو ۱۹۱۲ میں خاموشی سے لاہور سے فرار ہوئے تھے جن کا مقصد افغانستان کی مدد سے استنبول پہونچنا تھا تاکہ خلیفہ کی فوج میں بھرتی ہوکر عالم اسلام اور ہندوستان کو آزاد کراسکیں۔ اس گروپ کے بعض لوگ کابل میں موجود تھے۔ مولانا یعقوب قریشی افغانستان کے شاہی اتالیق میں سے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان اپنے اقرباء سے ملتان ملنے گئے تھے وہاں سے واپسی پر گرفتار کر لئے گئے اور طویل عرصہ جیل میں رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ قریشی سے ہماری چھوٹی پھوپی امیت اللہ کی شادی ہوئی۔ دونوں اب رخصت ہوچکے اولاد افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور امریکہ میں آباد ہیں۔

کابل میں خود اپنے ہی گھر سے دوبارہ تعارف ہوا۔ پہلی بار میں ۴۔۵/سال کی عمر (۱۹۳۹ء) میں اس وفد کا حصہ تھا جو ظاہر شاہ کی دعوت پر دادے ابا مولانا منصور انصاریؒ کی وساطت سے مولانا طیبؒ قاسمی کی قیادت میں افغانستان پہونچا تھا۔ اس کے بعد سے ان اقرباء سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ چچا حمید میاں پر دادے ابا کے انتقال (۱۹۴۶ء) کے بعد ان کے پورے گھر کی ذمہ داری پڑ گئی۔ سب سے چھوٹی بچی امیت اللہ ایک سال کی تھی، سب سے بڑی فردوسیہ ۱۳/سال کی تھی، دولڑ کے سات اور آٹھ سال کے تھے۔ فردوسیہ سے چھوٹی امت اللہ تھی جس کا انتقال ہوگیا تھا۔ چچا میاں ایثار وقربانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ

خدمت کے لئے انتخاب کرتا ہے اور وہ اس انتخاب میں پورے اترتے ہیں۔عین عنوان شباب میں ان کی والدہ حفظہ خاتون نے انہیں باپ کی خدمت کے لئے ۱۹۳۷ء میں افغانستان بھیج دیا تھا۔میری آمد کی سب سے بڑی خوشی چچامیاں کو تھی۔چچامیاں چاہتے تھے ہم جلال آباد چل کر گھر دیکھیں اور ممکن ہو تو لغمان چل کر دادے ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھیں۔

جلال آباد آمد:

ہمیں بھی جلال آباد دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ہم سب غلام محمد صاحب کے اور دوسرے اعزاء کے اصرار کے باوجود جلال آباد خاندانی گھر،قلعۂ مولانا منصور انصاری پہونچ گئے۔اس قلعہ کی دیواریں منہدم کردی گئی تھیں۔اور اندر کے گھر بھی حکومت کے قانون کی زد میں تھے۔افغانستان اور قبائلی علاقے میں لوگ قلعے بنا کر رہتے ہیں۔قلعہ کے اندر خاندان کے لوگوں کے اور ملازمین کے گھر ہوتے ہیں۔لیکن داؤد صاحب کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ افغان اب ماڈرن وِلا جسے وہ کوتی (کوٹھی) کہتے تھے تعمیر کریں۔سنٹرل جلال آباد اب درہم برہم ہو رہا تھا۔جدید جلال آباد کی تعمیر کے لئے حکومت نے اس زمین پر قبضہ کرلیا تھا جو دادے ابا کو امان اللہ خان نے الاٹ کی تھی۔چچامیاں نے اپنی اس زمین کا تھوڑا سا حصہ جس پر قلعۂ منصور تھا حکومت سے دوبارہ خریدا تھا۔لیکن اب انہیں قلعہ مسمار کر کے کوٹھی بنانی تھی۔ اصل مسئلہ پردہ کا تھا۔ ماڈرن کوٹھی میں پردہ کا اہتمام نہ تھا۔اس لئے ہمارے واپس آنے کے بعد چچامیاں نے کوٹھی تعمیر کرا کے کرایہ پر دیدی اور اندرون شہر ایک مکان پردہ دار رہائش کے لئے تعمیر کرایا۔

مولانا منصور انصاریؒ۔اہم دستاویزات:

جدید جلال آباد کی تعمیر کے لئے ۱۷ مساجد شہید ہوئیں۔جلال آباد کی اکثریت سکھ تھی۔یہ لوگ بہت فعّال اور مالی طور پر تجارت کر کے بہت مظبوط تھے انہوں نے شہر کے مرکز میں گردوارے کے لئے جگہ حاصل کر کے گردوارہ تعمیر کرلیا تھا۔اس پر مسلمانوں کو برہمی ہوئی

لیکن گردوارے کی مرکزیت قائم رہی۔

جلال آباد سے قریب کسی قصبہ میں ہم ملا صاحب باڑہ سے ملاقات کے لئے گئے ملاّ صاحب افغانستان کے مشہور عمائدین میں تھے۔ چچا میاں نے دادے ابا کے کاغذات سے تعارف کرایا تو ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی۔ اس میں ایک خط ۱۹۲۸ کا تحریر کردہ علامہ اقبال کے نام تھا۔ جس میں علامہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مغربی مسلم اکثریت ریاستوں کی متحد کر کے ڈومنین بنانے کی تحریک چلائیں جو انڈین کنفیڈریشن کا حصہ ہو یعنی اندرونی طور پر بالکل آزاد ہو۔ لیکن اگر ہندو اکثریت اسے تسلیم نہ کرے تو پھر وہ بالکل آزاد ہو۔ اس کا دارالسلطنت کراچی ہو۔ شاید یہ خط علامہ کے خطبۂ الہ آباد کا محرک ہو۔ لیکن علامہ اس ریاست کو ہندوستانی ریاست کا حصہ رکھنا چاہتے تھے مولانا منصور اسے آزاد رکھنے کے قائل تھے۔ اس ریاست میں یہ پروگرام ہونا چاہئے تھا کہ افغانستانی ایران عراق اور ترکی اس فیڈریشن کا حصہ ہو سکیں۔ اس خیال کو مولانا نے اپنی کتاب انواع الدول (شائع شدہ ۱۹۲۶ بجنور) میں بھی اجمالی طور پر پیش کیا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ علامہ کو مولانا کا خط ملا یا نہیں۔

اس دور میں خلافت تحریک کی ناکامیابی کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ چلا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمان قیادت مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے نئے راستے تلاش کر رہی تھی۔ ان کاغذات میں چچا میاں کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ وہ دادے ابا کی بعض تحریروں کو اپنی جیب میں رکھ کر گھومتے تھے اور اگر کوئی مانگتا تو اسے عاریتاً دے دیتے تھے۔ کابل میں ہندوستان کے سفیر افغانستان اور جلال میں ہندوستان کے کونسل جنرل کو انہوں نے بعض اہم تحریریں دیں تھی اور واپس نہیں مل رہی تھیں۔ میں نے چاہا چچا میاں یہ کاغذات میرے حوالے کر دیں لیکن چچا میاں چاہتے تھے ان کاغذات کی دوسری کاپی بنائی جائے وقت کم تھا اور کاغذات بہت زیادہ اور بہت اہم تھے۔ میرے پاس وقت بہت تھا اس لئے ان کاغذات کا مطالعہ خاص مشغلہ تھا۔

گورنر سے ملاقات کی کوشش:

ایک دن بیٹھے بیٹھے اکتایا تو میں ٹہلنے نکل گیا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ گورنر صاحب سے اپاؤنمنٹ لے کر ان کا انٹرویو لے لوں۔ یہ سوچ کر گورنر کے آفس پہونچ گیا اور ان کے سکریٹری سے اپنا تعارف کرا کے اپائنمنٹ کی درخواست کی۔ مگر وہ اللہ کا نیک بندہ پتہ نہیں کیا سمجھا اس نے ایک ماتحت کو پشتو میں ہدایات دیکر مجھے فارن آفس بھیج دیا۔ وہاں سکریٹری صوفے پر اکڑ و بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ جیسے ہی ماتحت نے میرا تعارف کرانے کے بعد گفتگو ختم کی یہ سکریٹری برہم ہو گیا اور فارسی میں مجھ سے کہنے لگا، ''تم نے ہماری شکایت کی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اپنی صفائی پیش کی اور مدعا بیان کیا۔ اس نے اپنے ہرکارے سے کہا کہ قاری حمید میاں کو لے کر آئے۔ چچا میاں تشریف لائے تو مجھے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ سکریٹری نے احوال بتایا اور اس طرح کی آزادیٔ خیال سے متنبہ کیا۔ چچا میاں نے مجھ سے سوال کیا اور میں نے بتایا کہ میرا کیا مقصد تھا۔ چچا میاں نے پشتو میں میری ترجمانی کر کے مجھے رہا کرالیا۔ باہر جا کر انہوں نے نصیحت کی کہ یہ افغانستان ہے ہندوستان نہیں۔ یہاں ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ تم گورنر سے ان کی شکایت کرنے پہونچے۔ پھر معلوم کیا کہ میں گورنر سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ان کا انٹرویو لینا چاہ رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ: ''مجھ سے کہنا چاہئے تھا۔ میں رات میں تم کو ان کے گھر لے چلوں گا۔''

رات میں ہم گورنر صاحب کے گھر پہونچے اور دروازہ کھٹکھٹایا وہاں سے ملازم دروازے پر آیا اور چچا میاں سے دعا سلام کے بعد ہم دونوں کو اندر لے گیا۔ وہاں اور لوگ بھی بیٹھے حقے پی رہے تھے اور گفتگو کر رہے تھے۔ گورنر صاحب نے کھڑے ہو کر چچا میاں کا استقبال کیا پھر میرا تعارف کرایا تو غیر معمولی محبت اور اخلاص سے خوش آمدید کہا۔ دادے ابا کی خدمات کا ذکر کیا۔ چچا میاں کے علم سے جو فیض اہل جلال آباد کو پہونچ رہا تھا اس کے

لئے شکر گزاری کے الفاظ کہے۔ پھر مجھ سے فرمایا: ''یہ تمہارا ملک ہے۔ ہم پر تمہارا حق ہے۔ تم جہاں چاہو جاؤ تم پر کوئی پابندی نہیں۔''

پھر چچا میاں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''میں تم کو یاد کر رہا تھا ایک ضروری کام ہے۔'' اس نے اس کام کی نشان دہی ایک بورڈ منگا کر کی۔ بورڈ پر لکھا تھا Entering Pakistan drive left یعنی: ''جب پاکستان میں داخل ہو تو بائیں طرف سے ڈرائیو کرو۔'' اس وقت افغانستان اور پاکستان میں تنازعہ تھا۔ باجوڑ (آزاد قبائل) سے دادی اماں کے اعزاء بھی پناہ لینے کے لئے افغان حکومت کے مہمان کے طور پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں دنوں خان عبدالغفار خاں بھی پاکستان سے تشریف لائے تھے۔

بورڈ سے متعلق مسئلہ یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ بورڈ سے پاکستان کا نام مٹ جائے اور بورڈ بامعنی رہے۔ یہاں گورنر کو سمجھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چچا جان ہندوستانی نسل سے تھے، مقتدر شخصیت تھے پھر بھی انہیں کسی بھی وقت پاکستانی سمجھ کر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ وہ مجاہدین جو لاہور سے ۱۹۱۲ء میں افغانستان پہونچے تھے ان کے سرخیل مولانا محمد یعقوب صاحب جیل میں تھے۔ وہ شاہی اطالیق رہے تھے، ان کا قصور یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنے اقرباء سے ملتان میں رابطہ قائم کیا تھا۔ چچا میاں نے میرا تعارف کراتے ہوئے گورنر صاحب سے فرمایا: ''عابد اللہ غازی علی گڑھ مایۂ ناز یونیورسٹی میں ایم.اے کر رہے ہیں یہ اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں۔'' دراصل مسئلہ صرف پاکستان کے نام کو مٹانے کا نہ تھا بلکہ اس کے لئے برش رنگ کا بھی فقدان تھا۔ میں نے پوچھا تو کہا وہ صرف پشاور میں ملتا ہے۔ اور پشاور ابھی تک پاکستان میں ہے ہم اس بورڈ کو لے کر گھر آ گئے اور کئی دن اس مسئلہ پر غور کرتے رہے کہ کیسے پاکستان کا نام اس بورڈ سے نکال دیا جائے اس عرصہ میں گورنر صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور انہیں میں نے سمجھایا کہ پاکستان ایک ہمسایہ ملک ہے آپ کے اس سے سفارتی تعلقات ہیں۔ آج آپ کے تعلقات خراب ہیں کل

اچھے ہوں گے لیکن وہ اعلیٰ حکام کے حکم کو پورا کر رہے تھے۔اس عرصہ میں پشاور سے پینٹ اور برش آ گئے اور اس سے ہم نے شگفتہ خط میں لکھ دیا۔ Leaving Afghanistan Drive left (افغانستان چھوڑنے کے بعد بائیں طرف گاڑی چلائیں۔) گورنر صاحب کی سرخروئی ہوگئی۔اور انہوں نے اس خوشی میں اپنی جیپ کار ہمیں پیش کردی کہ ہم لغمان جا کر حضرت لملک کا مزار دیکھ لیں اور دادے ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھیں۔ یہ میری سب سے بڑی خواہش کی تکمیل تھی۔

پاکستان ٹرانزٹ ویزا کی کوشش اور نیم گرفتاری:

میری روانگی میں ایک ہفتہ باقی تھا اور مجھے براہ پاکستان ٹرانزٹ ویزا کی ضرورت تھی۔خوش قسمتی سے جلال آباد میں پاکستان کونسلیٹ تھا لیکن اس میں داخل ہونے کی افغان حکومت کی طرف سے اجازت نہ تھی۔کونسلیٹ کے لوگوں کو بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔میرے پاس بجز کونسلیٹ جا کر ویزا کی درخواست دینے کے چارہ نہ تھا۔اس لئے ایک دن میں نے علی گڑھ کی شیروانی زیب تن کی اور پاسپورٹ لے کر کونسلیٹ پہونچ گیا۔وہاں ایک مرگلا سا افغان سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔اس نے کہا اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ویزا کی ضرورت ہے وہ ویزا اور ضرورت کو نہ سمجھتا تھا۔بلکہ کچھ بھی نہ سمجھتا تھا۔دروازہ کے باہر ایک چھوٹا سا بوسیدہ خیمہ اس کی رہائش گاہ تھا۔ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر وہ درخت کے سائے میں مکھیاں مارتا رہتا تھا۔

میں اس کے منع کرنے کے باوجود کونسلیٹ میں داخل ہوگیا۔آفس کے اندر پہونچا تو وہاں کھلبلی مچ گئی۔ہفتوں مہینوں بعد کوئی ہم جنس نظر آیا فوراً ہی کونسل جنرل شیر محمد خان اپنے دفتر سے نکل کر آ گئے اور خیریت پوچھنے لگے۔میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ حیران رہ گئے کہ میں کیسے اندر پہونچا۔انہیں اپنی نہیں میری فکر تھی۔انہوں نے کاغذات اور ہدایات مجھے دیں اور کہا انہیں آج جمع کرادیں ہم پندرہ دن کا ایگزٹ ویزا فراہم کردیں گے۔شیر محمد

خان نے چائے کی دعوت دی اور فرمایا کہ دروازے کے قریب درخت کے سائے میں بیٹھ کر جائے پئیں گے۔ تاکہ اس افغان سپاہی کو شبہ یا شکایت نہ ہو۔ شیر محمد صاحب بہت دلچسپ، زندہ دل اور پٹھان صفت آدمی تھے۔ پشاور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے پشاور میں بھی اپنے اعزاء کے پتے دیئے اگر مجھے وہاں ضرورت ہو تو ان سے رابطہ قائم کروں۔

میں باہر نکلا تو اس سپاہی نے کہا: ''شما بندی شدید (تم اب گرفتار ہو) میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور روانہ ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا چل رہا تھا کہ تمہیں پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔ تم گرفتار ہو۔ تم نے پاکستان سے مذاکرات کیے ہیں۔ میں نے کہا یہاں کے جو افسر اعلیٰ ہیں ان کے پاس لے چلو۔ وہ مجھے لے کر پولس اسٹیشن گیا اور وہاں کے افسر اعلیٰ سے ملاقات کرائی پھر پشتو میں جرائم کی فہرست بتائی۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

آفیسر صاحب نے مجھے بہت احترام سے کرسی پر بٹھایا اور مجھ سے میری مزاج پرسی کے بعد صورت حال کے بارے میں جاننا چاہا۔ میں نے پہلے تو دادے ابا اور چچا جان کا نام لیا جن سے وہ واقف تھا پھر اس سے میں نے واقعات بیان کرنے میں خاص طور پر شیر محمد خاں کی پٹھان مہمان نوازی اور اخلاق کا ذکر کیا۔ اسے یہ بھی بتایا: ''آپ تو جانتے ہیں کہ پٹھانوں کا اخلاق کتنا وسیع ہوتا ہے۔'' آفیسر صاحب نے چپراسی کو بلا کر کہا جائے، چائے اور بسکٹ لے کر آئے۔ میری گفتگو سن کر معذرت کی اور اس سپاہی کے طرز عمل کی معافی چاہی پھر فرمایا کہ: ''آئندہ کونسلیٹ سے جو کام ہو وہ میری معرفت کرائیے۔'' اس سپاہی سے انہوں نے فرمایا اب تمہارا کام ہو گیا ہے تم جاؤ۔ وہ جانے کے لئے تیار نہ تھا اور پشتو میں میرے جرم کی سنگینی ثابت کر رہا تھا۔ بالآخر آفیسر نے اسے غصہ سے کہا ''برو'' جاؤ اپنا کام کرو اور وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ چائے کے بعد مزید تکلف یہ کیا کہ مجھے لیکر گھر تک پہونچانے گئے۔ چچا میاں نے جو مجھے اس آفیسر کے ساتھ دیکھا تو ان کی پریشانی کی حد نہ رہی۔ لیکن آفیسر نے انہیں بھی یقین دہانی کرائی کہ کوئی فکر نہ کریں اور میرے پاس کاغذات بھیج دیں۔

چچا میاں نے فہمائش کی کہ ان کے کہنے کے باوجود کہ میں از خود کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ کروں۔ میں نے پھر انہیں مشکل میں ڈال دیا۔ انہوں نے پھر افغانستان کی سیاسی صورتحال سے آگاہ کر کے متنبہ کیا کہ ہمارے خاندان کی ساری خدمات کے باوجود وہ کسی وقت بھی مشتبہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ میں نے کئی بار ہندوستان کی شہریت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ میں نے ویزا کے کاغذات کی خانہ پری کر کے چچا میاں کو دے دیئے انہوں نے افغان آفیسر کو پہونچا دیئے افغان آفیس نے کونسلیٹ میں جمع کرا دیے۔ دوسرے دن پندرہ دن کا ٹرانزٹ ویزا لگ کر پاسپورٹ میرے پاس آ گیا۔

الفاظ کا ہیر پھیر۔ مکان کے نئے معنی:

زبانوں کا مسئلہ بھی عجب ہوتا ہے وہی الفاظ ایک زبان میں ایک معنی رکھتے ہیں، دوسری زبان میں دوسرے معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو فارسی عربی ترکی میں خاص طور پر ایک ہی لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں ہم رہائش گاہ کو مکان کہتے ہیں۔ ہم دادی اماں سے بھی ذکر کرتے ہوئے کہتے تھے کہ بمبئی میں مکان پانچ منزلہ اور چھ منزلہ ہوتے ہیں تو وہ شرما جاتیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا۔ ایک بار کابل میں کسی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہم سے اپنی ہندوستان آنے کی خواہش کا ذکر کیا تو ہم نے اخلاقاً کہہ دیا ''مکان ما حاضر است (ہمارا مکان حاضر ہے)۔ وہ صاحب منہ بنا کر چلے گئے اور ہم حیران ہو کر رہ گئے۔ جلال آباد میں ہم نے ایک صاحب سے پوچھا: ''مکان شما کجا است؟'' (آپ کا مکان کہاں ہے؟)'' انہوں نے فرمایا ان کا مکاں تو دور ہے لیکن یہاں قریب ان کے دوست کا گھر ہے اس مکان کو آپ استعمال کر سکتے ہیں۔

میں نے ان سے لاکھ معذرت کی لیکن وہ نہ مانے۔ دوست کے گھر پر مجھے لے کر پہونچ گئے اور تیزی کے ساتھ جس کمرے کی طرف نشاندہی کی وہ بیت الخلا تھا۔ میں نے اخلاقاً بیت الخلاء میں تھوڑی دیر توقف کیا۔ پھر نکل آیا اور شکریہ ادا کر کے رخصت

ہو گیا۔ گھر جا کر چچا میاں سے وضاحت چاہی تو انہوں نے مکان کے افغانی معنی بتائے۔ گھر بھر میں قہقہے لگے اور سب کو یہ قصہ پسند آیا۔ دادی صاحبہ نے فرمایا: ''مجھے بہت پریشانی تھی کہ عابد میاں مجھ سے مکان کا قصہ ہر وقت کیوں بیان کرتا ہے۔ اور میں سوچتی تھی بمبئی میں اگر مکان پانچ اور چھ منزلہ ہوتے ہیں تو لوگوں کو چڑھنے اترنے میں کتنا وقت لگتا ہوگا۔''

دادی اماں۔ محبت کے آنسو:

جوں جوں وقت روانگی قریب آ رہا تھا دادی اماں کے آنسوؤں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی محبت میں تو کوئی شک نہیں لیکن وہاں گھر کے کئی مسائل کو میں نے سلجھایا تھا۔ عبیداللہ چچا، شیرین جان سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ شیرین جان تعلیم یافتہ تھیں شاہ جی اور غلام محمد صاحب کی سالی تھیں عبیداللہ چچا کے لئے ہر طرح مناسب تھیں۔ لیکن بی بی کہتی تھیں فیشنی است و برہنہ است (فیشن والی ہے اور برہنہ ہے) برہنہ سے مطلب تھا اسکرٹ پہنتی ہے۔ اسکرٹ افغانستان کی اکثر تعلیم یافتہ لڑکیوں کا لباس تھا لیکن وہ اس کے نیچے لانبے سیاہ موزے پہنتی تھیں۔ افغانستان کی تعلیم یافتہ خواتین کا یہ عام لباس تھا، ان کو سمجھا بجھا کر تیار کیا اور پھر ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اب عمر کا آخری حصہ دونوں جرمنی گزار رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ چچا میاں اور دادی بی بی کے مزاج کا تفاوت۔ چچا میاں نے پوری زندگی والد اور ان کے انتقال کے بعد سوتیلی والدہ اور ان کی اولاد کی خدمت میں گزاری میں لگا دی تھی۔ دادی بی کو پھر بھی ان پر اعتماد نہ تھا۔ وہ افغانستان میں ان کی شادی کرنا چاہتی تھیں وہ اس کے لئے تیار نہ تھے۔ میں نے دونوں سے گفتگو کر کے ناکام کوشش کی کہ باہمی مفاہمت کی شکل نکلے۔ تیسری فردوسیہ بی کی شادی دادی بی کے ماموں زاد بھائی باجوڑ کے عبدالسبحانی سالارزئی سے ہوگئی تھی۔ میں کابل پہونچا تو ان کا لڑکا اسد جان تین دن کا تھا۔ ان کا معاملہ فردوسیہ بی سے اچھا نہ تھا۔ فردوسیہ بی تو زندگی جیسے تیسے گزار لیتی لیکن عبدسبحانی سے میں نے سختی سے معاملات کو درست کرنے کو کہا ورنہ تو فردوسیہ اپنے گھر میں رہیں گے۔

وہ بہت سے وعدہ کر کے لے گئے۔اور الحمد للہ ٹھیک ٹھاک گزر ہوا تین لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑ کر دونوں رخصت ہو چکے ہیں۔

جس دن میں سفر کر رہا تھا دادی بی کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ ہر شخص ہی افسردہ تھا، میں نے بھی والدہ کے انتقال کے بعد سے ایسی سچی اور بے لوث محبت نہیں دیکھی تھی۔اور مجھ پر بھی بہت اثر تھا۔ چچا میاں نے مجھے دادے ابا کے کاغذات تو نہیں دیے لیکن اتنی رقم دیدی کہ ایم.اے فائنل میں داخلہ ہو جائے اور سفر آرام سے کٹ جائے۔انہوں نے میری پسند کا اصل چینی کا ٹی سیٹ خرید وا دیا تھا جو میرا قابل رشک سرمایہ رہا۔آمد کا سفر جتنا مشکل تھا واپسی کا سفر اتنا ہی آسان تھا۔

پھوپی جان۔قدسیہ بیگم۔صبر و استقامت:

مجھے علی گڑھ پہونچنا تھا لیکن طبیعت میں عجیب وحشت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری کوئی قیمتی چیز مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔دیوبند کا اسٹیشن آیا تو میں غیر ارادی طور پر اتر کر سیدھا پھوپا جان کے گھر پہونچا۔گھر میں داخل ہوا تو پھوپی جان نے استقبال کیا میں نے بے اختیارانہ پوچھا: ''پھوپی جان سب خیریت ہے؟''۔انہوں نے بڑی طمانیت سے فرمایا ''اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے بس اس نے ہمیں رفیع میاں کی شکل میں جو امانت عطا کی تھی وہ واپس لے لی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش تو ہو گئیں لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اور شکر گزاری چہرے سے عیاں تھی۔لیکن میں ضبط نہ کر سکا اور زندگی میں شاید ہی کبھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا ہوں جیسا اس دن رویا۔اب پھوپی جان اور پھوپا جان مجھے تسلی دلا رہے تھے۔ان کے بیٹے وصی میاں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔

رفیع میاں کی عمر ڈھائی تین سال ہوگی۔ مجھے ان سے غیر معمولی محبت تھی۔وہ بھی مجھ سے بہت مانوس تھے۔میرا غم ماں باپ اور بڑے بھائی سے زیادہ نہیں ہو سکتا لیکن مجھ میں ان سے بہت کم برداشت تھی۔ پھوپی جان کے صبر کا قسمت نے بہت بار امتحان لیا

تھا۔وہ چھ سال کی تھیں تو ان کے والد گرامی مولانا منصور انصاری جہادِ آزادی کی راہ میں افغانستان، ایران، روس اور ترکی میں گھومتے رہے اور ان کی والدہ اپنے چار بچوں کے ساتھ انبہٹہ میں ایک محرومی کی زندگی گزارتی رہیں۔ پھوپی جان کو باپ کی جدائی کے ساتھ والدہ کی محرومیوں کا بھی صدمہ تھا۔خاندان میں شادی ہوئی۔شوہر کے ساتھ کوئٹہ میں قیام تھا ۱۹۳۵ء میں زلزلہ آیا۔خاندان کے کئی افراد شہید ہو گئے۔وہ خود ملبہ سے نکل کر باہر آ گئیں۔ شوہر کی آوازیں سنتی رہیں۔رات کے اندھیرے میں وہ ہاتھوں سے ملبہ کھودتی رہیں اور پھر وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ط

ابا جان نے ان کا داخلہ   دادے ابا کے حکم پر ان کا داخلہ طبیہ کالجمیں کرا دیا تھا۔اس زمانے میں یہ بہت انقلابی قادام تحا۔ وہاں سے فراغت ہوئی اور امتیازی گولڈ میڈل ملا۔دوسری شادی ایک بہت ہی شریف النفس انسان مشیر الحسن سے ہوئی۔ان کے ساتھ دولڑکے فصیح الزماں اور مطیع الزماں بھی وآئے جو پہلی بیگم سے تھے۔ان کو ٹوٹ کر چاہا لیکن پاکستان ان کو بھی لے گیا۔کئی بچے پیدا ہوئے ایک وسیع الزماں ہی بچے باقی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بالآخر دماغ نے جواب دے دیا۔ دیوبند کے دینی ماحول علماء کے خاندانوں کی روحانی فضا میں کوئی نہیں تھا جو ان کا درد سمجھتا، ان کے زخموں پر مرہم رکھتا ان کی ذہنی بیماریوں کا محبت سے مداوا کرتا۔ وہ ہر محفل میں مذاق اور مضحکہ کا نشانہ بنتیں اور جب مرض نے شدت اختیار کر لی تو اپنے گھر اور پھر اپنے کمرے تک محدود ہوگئیں۔غرض پھوپی جان نے اگر رفیع میاں کے اس صدمہ پر صبر کیا تو وہ اس کی عادی تھیں لیکن پھر ان صدمات نے انہیں اندر سے ہلا دیا۔اور وہ ہر اس شخص کو حاضر کر لیتیں تھیں جس سے چاہتیں تھیں کہ باتیں کریں۔ان کی خلوت جلوت میں بدل گئی تھی۔لوگ انہیں دیوانہ سمجھتے تھے مگر وہ اپنی دنیا میں مست مگن رہتی تھیں۔میں دیوبند سے سیدھا علی گڑھ پہونچا جہاں یونین کی صدارت میرا انتظار کر رہی تھی۔اس بار اس سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔

علی گڑھ میں آٹھواں سال
ایم.اے.فائنل
جولائی ۱۹۵۸-مئی ۱۹۵۹

عبدالمعید خان۔ڈیوٹی سوسائیٹی اورضرورت مند:

ایم.اے پریویس کے رزلٹ نے ہمیں حیران کردیا ہماری تمام تر بے توجہی کے باوجود فرسٹ کلاس تھی۔افغانستان سے واپس ہوتے وقت چچا جان نے کچھ اخراجات کا انتظام کرادیا تھا لیکن کچھ کمی پھر بھی باقی تھی۔اس بار معاشی ضرورت سے بشیر حسین زیدی صاحب کے فرمان پر ہم نے ڈیوٹی سوسائٹی کی راہ لی اور عبدالمعید خان کی سرکار میں حاضر ہوئے۔معید خان ہم سے ذرا برہم تھے کہ علیگ کے کالم ''علی گڑھ میں ایک گدھے کی سرگزشت'' میں ان کا نام گرامی آ گیا تھا۔مضمون ہمارے نام سے شائع نہیں ہوتا تھا لیکن معید خان نے دست غیب سے یا طرز تحریر سے یہ معلوم کرلیا کہ اس تحریر کے پیچھے کس گستاخ کا قلم ہے۔

ایک شب ہمارے دروازے پر انہوں نے دستک دی۔ میں حیران و پریشان ہوگیا۔مگر انہوں نے بہت اختصار سے کام لیا اور اپنے'' تذکرہ '' کا شکریہ ادا کر کے ہمیں شرمندہ نہ دیکھنے کے لئے فوراً تشریف لے گئے۔ہم نے ان کے دربار میں حاضری دی تو خاطر خواہ طنز سے استقبال فرمایا۔ہم نے بھی استقلال سے کام لیا۔ان کا سوال ہماری مالی ضروریات کے بارے میں نہ تھا ہمارے ایک نامور علیگ بزرگ کے بارے میں تھا جنہیں ہماری ہی طرح ڈیوٹی سوسائٹی کی بھٹی سے پارس بن کر نکلنے کا شرف حاصل تھا۔انہوں نے ان کی تعلیم اور خدمات کے ذکر کے بعد فرمایا:

''آپ کی ان سے کیا عزیز داری ہے۔''

میں نے جس قدر دور کی عزیز داری تھی اسے قریب ترین کردیا۔

انہوں نے فرمایا:''تو پھر آپ بھی ان کی طرح کالج میں اپنے جوہر دکھائیں گے؟''

''جی میں کوشش تو کر رہا ہوں!'' میں نے عرض کیا۔

پھر وہ ایسے سوالات کر رہے تھے جو عام فہم تھے لیکن تیر نیم کش بن کر ہمارے شعور میں پیوست ہو رہے تھے۔

پھر فرمایا: ''کیا آپ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں گے؟''

میں نے عرض کیا: ''انکا بہت بڑا نام ہے میں بہر حال کوشش کروں گا۔''

''انہوں نے آج تک ڈیوٹی سوسائٹی کی رقم واپس نہیں کی۔ آپ بھی ایسا ہی کریں گے؟''

دل تو چاہا کہوں ''بے شک'' مگر میں نے سنبھل کر وعدہ کیا کہ میں اپنے ان قریبی عزیز گرامی کے مزاج سے قدرے مختلف ہوں۔

انہوں نے فرمایا: ''آثار تو آپ میں ان جیسے ہی لگ رہے ہیں۔''

میں نے عرض کیا: ''آپ مردم شناس ہیں۔''

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
دل تو بیند و اندیشہ تو می داند

عبدالمعید خان صاحب خود ایک ادارہ تھے۔ وہ ڈیوٹی سوسائیٹی کے معتمد بھی تھے۔ ڈیوٹی سوسائیٹی کوئی متمول ادارہ نہ تھی اور اس کا یہ بھی تجربہ تھا کہ مسلمان قوم قرضِ حسنہ لینے میں چست اور واپس کرنے میں ست بلکہ نادہند ہے۔ ان کے پاس ایسے نادہند لوگوں کی مستند فہرست تھی۔ ان لوگوں میں اکثر لوگ پاکستان جا بسے تھے اور امارت، تجارت، وزارت اور شہرت کے مالک تھے۔ معید خان نے وہ فہرست ایوب خان کو مارشل لاء لگنے کے بعد بھیج دی تھی اور اس سے پورا پیسہ مع اضافی چندہ وصول ہو گیا۔ ان کے خلوص اور علی گڑھ کے مزاج دونوں میں شک نہیں۔ معید خان علی گڑھ والے تھے اور نہلے پہ دہلا رکھنا جانتے تھے۔ انہوں نے کسی سے دل میں بغضِ معاویہ رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ حبِ علی کا معاملہ کیا ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را !

انہوں نے اپنے صاحب نظر ہونے کا ثبوت ہماری عرضی کی منظوری کی شکل میں دے دیا۔

الیکشن خواہی نخواہی:

ایڈمیشن کے مراحل کے ساتھ ہی الیکشن کا زور شروع ہو گیا تھا۔ ایس ایف تو ہمارے حق میں سرگرم تھی ہی اس باران احباب نے جنہوں نے گزشتہ الیکشن میں ہمارا ساتھ نہیں دیا تھا وہ بھی ہمارے حق میں سرگرم ہو گئے اور جماعت اسلامی کے علماء کا گروپ جو رامپور کی ثانوی درس گاہ سے چار سالہ دینی تعلیم کا کورس ختم کر کے اپنے تعلیمی سلسلہ کو جوڑنے کے لئے علی گڑھ واپس آ چکا تھا، ان میں بھی بعض احباب ہمارے ہمنوا بن گئے۔ ان لوگوں سے رسم و راہ تو ۱۹۵۳ سے رامپور کی درسگاہ میں شروع ہو چکی تھی جب میں اور آصف علی رضا ڈگری کالج کے آل انڈیا ڈبیٹ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ ان کے علی گڑھ آنے کے بعد یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا اور آج تک قائم ہے ع　اک تعلق ان سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

ان حضرات میں نجات اللہ صدیقی، اشفاق احمد، ڈاکٹر عبدالحق انصاری، عرفان احمد خان قابل ذکر ہیں۔ یونین اسلامک لیکچرس، سیمینارس میں ان لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں یوں بھی بہت سے اسلامی سماجی سیاسی موضوعات تھے جن میں اتفاق ہو یا اختلاف ان سے سنجیدہ گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ان لوگوں میں نجات اللہ صاحب سے اس لحاظ سے بھی زیادہ تعلق رہا کہ وہ ہمارے پڑوسی تھے۔ دوسرے پڑوسی حامد انصاری تھے اور چوتھے دلیش راج سنگھ تھے۔ تینوں میں کوئی قدر بجز پڑوسی اور علیگیرین ہونے کے مشترک نہ تھی۔ نجات صاحب جماعت اسلامی کے مفکر اور اسلام کے داعی تھے حامد انصاری خاموش اسکالر، سنجیدہ مزاج، کرکٹ کے رسیا تھے۔ دلیش راج سنگھ بلند شہر کا جاٹ، ہنگامہ مزاج، پڑھاکو اور ہلڑ باز تھے۔ میں خود تینوں سے یکساں قریب تھا اور تینوں کی صحبت سے مستفید اور

لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔دیش راج سنگھ گالیاں بھی اس سلیقے سے دیتا تھا کہ وہ قابلِ قبول ہو جاتی تھیں۔وہ علیگیرین تھا اوراس کا دل ہر عصبیت سے پاک صاف تھا۔

جماعت کے مفکرین کے ساتھ بہت سے اسلامی موضوعات پر ہم آہنگی تھی سیاسی نظریات میں اختلاف تھا۔اس لئے چھوٹے موٹے سیمینار اٹھتے بیٹھتے ان سے ہوتے رہتے تھے۔بہرحال اس گروپ کے بعض احباب نے بھی اصرار کیا کہ میں الیکشن میں کھڑا ہوں۔میں اب بھی تیار نہ تھا۔میری اولیت امتحان پاس کر کے ملازمت تلاش کرنا تھی۔

جب چاروں طرف سے دباؤ بڑھا تو میں نے یہ شرط رکھی کہ اگر الیکشن متفقہ ہوتا ہے تو میں امیدوار بننے کے لئے تیار ہوں۔علی گڑھ کی تاریخ میں ایسا متفقہ بلا مقابلہ الیکشن صرف ایک بار ہوا تھا وہ خواجہ غلام السیدین جیسی شخصیت کا معاملہ تھا۔ہمیں یقین تھا کہ میری یہ شرط پوری نہ ہوگی اور میں اس ذمہ داری سے بچ جاؤں گا۔میرے کاغذات نامزدگی داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوست عمر فاروق نے کہا کہ:"الیکشن علی گڑھ کی عظیم روایت ہے میں غازی کو بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے دوں گا۔"عمر فاروق سے ہمارے تعلقات تھے لیکن علی گڑھ کی روایات کا احترام انہیں میدان انتخاب میں مبارزت کی دعوت دے رہا تھا۔

اِدھر ابن فرید صاحب جن کا تعلق فکر اسلامی سے تھا اور معروف قلم کار تھے انہوں نے بھی اپنے کاغذات جمع کرا دیے۔اب میرے لئے عذر کا بہترین موقع تھا۔لیکن ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی بھی ہماری دستبرداری کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔تامبرم سے واپسی کے بعد سے میری مقبولیت ہر حلقے میں بڑھ گئی تھی۔مجھے مقابلہ میں شکست کی فکر نہ تھی لیکن میرا خیال تھا کہ امتحان میں کامیابی بہتر مستقبل کی ضامن ہوگی۔پھر یہ بات بھی تھی کہ علی گڑھ کی ایک مقدس روایت تھی کہ یونین کے صدر اور سکریٹری ڈراپ کرتے تھے اور میرا کوئی ارادہ اس روایت کے احترام کو جاری رکھنے کا نہ تھا۔

ابھی میں کشمکش میں تھا کہ ابن فرید صاحب کے جماعتی ساتھیوں نے انہیں سمجھا

بجھا کر بٹھا دیا۔ ادھر عمر فاروق پر نہ جانے کونسا زور پڑا، یا خود سمجھ آ گئی یا ہمارا دوستی کا تعلق آڑے آ گیا۔ بہر حال انہوں نے بھی ملاقات کر کے مجھے اپنے نیک ارادے سے آگاہ کر دیا۔ ابن فرید اور عمر فاروق دونوں کی قابلیت میں شک نہیں تھا اور اگر الیکشن ہو جاتا تو فتح وشکست سے قطع نظر بھی علی گڑھ کی روایت کے مطابق ذاتی تعلقات متاثر نہ ہوتے۔ بہر حال ہم بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ اب الیکشن سیکریٹری اور لائبریرین کا تھا۔ اس میں آسانی سے بھوپال کے نوجوان صالح کردار صغیر احمد منتخب ہو گئے۔ جو جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور لائبریرین لقمان علی خان یا انشاء اللہ منتخب ہوئے۔

ہمارا خطبہ صدارت:

اس الیکشن میں نہ نعرے لگے نہ ہوحق ہوا، نہ برفی نمک پارے پر فاتحہ ہوئی نہ کوالیفکیشن چھپیں نہ اینٹی نکلی۔ بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ چیزیں بھی: ع ''لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ'' تھیں۔

الیکشن کے ہنگامہ سے امیدوار کے جوہر بھی کھل کر سامنے آتے ہیں اور الیکشن سے ورکرس سے رشتہ بھی قائم ہوتا ہے۔ الیکشن کے بعد افتتاحی تقریب میں مجھے خطبہ صدارت پیش کرنا تھا مجھے جو کہنا تھا وہ آصف علی صاحب کے خطبے میں کہہ چکا تھا۔ اس بات کو دہرانا بہت مشکل نظر آیا۔ پھر بھی ہم نے لوٹ پھیر کر وہی باتیں دہرا دیں۔

''جمہوریہ ہندوستان میں مسلمانوں کا شاندار متوقع مستقبل، علی گڑھ ہندو مسلم اتحاد کی کامیاب تجربہ گاہ۔ مسلمان نہ مایوس ہوں نہ فرار کا راستہ اختیار کریں۔ ہمارا مستقبل نہ عالم اسلام کے ساتھ وابستہ ہے نہ پاکستان سے بلکہ ہندو اور ہندوستان کے ساتھ ہے۔ ہندوستان کا جمہوری سیکولر اور وفاقی دستور دنیا کا بہترین نظام ہے اس کو عملاً حقیقی بنانے کے لئے ہمیں اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بندی کی ضرورت نہیں بلکہ ہندوستان کی جمہوری اور سیکولر جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ ہندو مسلم اشتراک عمل کی

تجربہ گاہ ہے اور ہمیں اپنے حسن عمل سے اسے کامیاب بنانا ہے۔''

میرے یہ خیالات علی گڑھ کے اسٹیج سے اور پھر قومی پلیٹ فارم سے بار بار پیش کیے گئے۔علی گڑھ میں اس وقت بھی وہ مسلم لیگی ذہن موجود تھے جو پاکستان کو اپنی منزل مقصود سمجھتے تھے۔فکری طور پر جماعت اسلامی کا ذہن سیکولرزم، جمہورت ہندوستان کی اجتماعی زندگی سے معاونت کے علی الاعلان خلاف تھا۔علی گڑھ کی یا ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اس جماعت کی اگر چہ بہت اہمیت نہیں تھی۔ پھر بھی میری نگاہ میں ان کی فکر بہت خطرناک تھی اور کردار منفی تھا۔ مجھے اس رائے کی امریکہ میں کافی قیمت ادا کرنی پڑی لیکن میں آج تک ہندوستان اور امریکہ دونوں میں یکساں اپنی اس رائے پر قائم ہوں۔مسلم لیگ کی فکر اور جماعت اسلامی کی فکر میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی فکر جذباتی تھی لیکن جماعت کی فکر سوچی سمجھی آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اور یہ آئیڈیالوجی ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حقائق سے متصادم ہے۔

یہی صورتحال امریکہ کی بھی ہے۔پاکستان اور عالم اسلام میں البتہ اس فکر کی بنیاد پر نظام قائم کرنے کی جدوجہد کو کامیابی ہوسکتی ہے لیکن وہاں اس کو وہ آزادی حاصل نہیں جو ہندوستان اور امریکہ میں حاصل ہے۔امریکہ میں اس نظام کو بدل کر اسلام کے نظام کو نافذ کرانا: ''ایں خیالست ومحالست وجنوں''، کی فہرست میں آتا ہے۔یہاں پہلے کامیاب پرائمری اسکول امریکن معیار کا قائم کر کے دکھادیں پھر اگلا قدم اٹھائیں۔

جماعت کی یہ بات اچھی تھی کہ اس نے جمعیۃ العلماء کی طرح اپنی سیاسی حیثیت کو ختم کردیا تھا اور دینی اور سماجی خدمات کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔جمعیۃ العلماء نے ہندوستان کی آزادی میں کانگریس کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا تھا۔تقسیم کے وقت مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن غرض سب اکابر جمعیۃ نے تقسیم وطن کی کھل کر مخالفت کی تھی اور تقسیم کے بعد ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولر نظام کو دل سے قبول کرلیا تھا۔لیکن

جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظام اسلامی کو ہندوستان کے ماحول میں نا قابل عمل ہونے کے باوجود اقامت دین کے نام سے اس پر عامل ہوگئی تھی۔ دونوں جماعتوں نے مسلمانوں کی خدمات انجام دیں لیکن جماعت کا فکری راستہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اور اس کے بہترین ذہن اس منفی فکر میں کھپ گئے۔ جمعیۃ العلما ہندستان کے حنفی مدارس کی نمائندہ تھی۔ اس کا مسلک علوم دین کی روایتی فکر کا تحفظ تھا۔ اس کی فکر اجتہاد اور تفہیم جدید سے ہم آہنگ نہ تھی۔ عملی سیاست سے اس نے علیحدگی اختیار کرلی تھی لیکن عملاً وہ کانگریس کا تتمہ تھی۔ سیاست میں چند اسمبلی اور پارلیمنٹ کی نمائندگی سے اس کی جدید قیادت کا کام چل جاتا تھا۔

یونین کی صدارت اور نیشنل کونسل کی چیرمین شپ:

میرے صدارتی خطبے سے قبل اور میرے علی گڑھ چھوڑنے تک میری آواز یونین کے پلیٹ فارم سے باوجود ہلکی پھلکی مخالفت کے سنی جاتی رہی۔ ادھر ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں کے طلباء نے یونیورسٹی طلباء کی انجمن بنانے کا پروگرام بنایا، دلی میں اس کا اجتماع تھا۔ میں نے بطور صدر اسٹوڈنٹ یونین اس میں شرکت بھی کی اور اس کام کی تائید بھی کی ہندوستان جمہوریت جنوبی ایشیا کے مستقبل، عالم اسلام سے ہندوستان کے روابط کے بارے میں جو تقریر کی وہ دلپذیر نکلی اور میں نائب صدر منتخب ہوگیا۔ صدر عثمانیہ یونیورسٹی کے کوئی طالب علم مسٹر ریڈی تھے۔ وہ اس ذمہ داری کو قبول نہ کرسکے۔ تو میں اس ادارے کا پہلا صدر منتخب ہوگیا۔ یہ میرے اور علی گڑھ کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس ادارے کا نام National Council of University Students of India (NCUSI) نیشنل کونسل آف یونیورسٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا رکھا گیا۔ اس کو فوراً ہی سرکاری حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوگئی۔

اس تحریک کے اصل روح رواں دلی یونیورسٹی کے ہونہار اور مدبر طالب علم جیوتی

شنکر سنگھ تھے۔ جو بہت سنجیدہ فکر اور مسلسل عمل کے قائل تھے۔نام ونمود کی انہیں پرواہ نہ تھی، فکر میں معتدل تھے کام میں مستعد۔تنظیم کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔مجھ سے بڑی عقیدت کا رشتہ رکھتے تھے۔، بڑے ہوکر چھوٹے بنے رہتے تھے۔وہ بھی ہماری طرح پنڈت نہرو کی فکر سے قریب تھے۔ان سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔

اس پلیٹ فارم نے مجھے موقعہ دیا کہ میں علی گڑھ کی اور مسلمانوں کی آواز کو قومی سطح پر ہندوستان کی جمہوریت کے تناظر میں پیش کرسکوں۔ مجھے ایسا کرنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔نیشنل کونسل کے پلیٹ فارم سے مجھے پنڈت جواہر لال نہرو (وزیر اعظم) راجندر پرشاد جی (صدر جمہوریہ)، سی.ڈی دیشمکھ (چیر مین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن)۔ہمایوں کبیر (سکریٹری وزارت تعلیم) خواجہ غلام السید ین (ڈپٹی سکریٹری اور بعد میں سکریٹری وزرات تعلیم) اور دیگر قومی شخصیات سے ملنے کا، طلباء کے مطالبات ان تک پہونچانے کا، ان کے خیالات کو سننے کا، ان کی فکر کو سمجھنے کا اور ان کی طور طریق کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔وہ نسل ان لوگوں کی تھی کہ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے ؎

جو ذرہ جس جگہ تھا وہاں آفتاب تھا

لیکن یہ لوگ خود آفتاب ماہتاب تھے۔کچھ لوگوں کے تذکرے میری آپ بیتی اور تحریروں میں خصوصی یا عمومی طور پر آچکے ہیں۔لیکن ؎ سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

میری البم میں چند تصاویر ابھی باقی ہیں جن میں میں تقریر کررہا ہوں اور پنڈت جی، راجندر پرشاد جی، سن رہے ہیں۔ پہلے بھی الحمد للہ، علماء دین مفتیان شرح متین، صوفیا عظام، شعرائے کرام سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا تھا۔ یہ تمام تر خاندانی اور بزرگوں کی نسبتوں کی وجہ سے تھا۔ جو کچھ دیکھا اور جن شخصیات سے ملاقاتیں رہیں اس میں ہر ایک کا اپنا رنگ تھا ان سب کا اپنا اپنا مزاج تھا اپنی فکر تھی لیکن سب میں عظمت کے وہ نشان تھے جو خالق حقیقی کے عطیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ہم نے سب سے سیکھا سب کا اثر قبول کیا اور سب کی اچھی

باتوں کوزندگی میں سمونے کی کوشش کی بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ع زہر خرمنے خوشہ یافتم

(''میں نے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔'')

جو کچھ سیکھا اس میں ہمارا حصہ حیرت کے سوا کچھ نہیں، تھا گویا ع

آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری۔

دلّی سے علی گڑھ واپسی کا مسئلہ:

میرا معاملہ ان کوششوں میں ہمیشہ کی طرح مالی کمزوری تھا۔دلی میں اگر میٹنگ ہے تو ٹرین کے پیسے نہیں اور وہاں پہونچ گئے تو واپسی کا کرایہ نہیں۔یونین کے صدر کا ذاتی الاؤنس بیس روپیہ ماہوار تھا لیکن میں نے یہ صحیح نہیں سمجھا اس کا استعمال سفرخرچ کے طور پر کروں۔اس کا اکثر حصہ یونین کے مہمانوں کی چائے پانی میں خرچ ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں دہلی یونیورسٹی نیشنل کونسل کی میٹنگ کے لیے گیا۔واپسی کا کرایہ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ میں دہلی سے نکلنے والے شمع پبلیکیشنز کے باتصور مجلّہ ''آئینہ'' جس کا میں علی گڑھ کا نمائندہ تھا اس کے دفتر چلے چلوں، اس کے ایڈیٹر اباجان کے دوست اور میرے شفیق بزرگ ظ- انصاری تھے۔

رسالہ پر میرے کچھ پیسے واجب تھے میں دہلی اس توقع میں چلا گیا کہ ظ- صاحب سے تو دلی کے خرچ اور واپسی کا کرایہ مل ہی جائے گا۔ظ۔صاحب نے معذرت ہی نہیں کی بلکہ بتلایا کہ رسالہ مالی مشکلات کا شکار ہے اور بند ہونے والا ہے۔ میں آصف علی روڈ سے بس لے کر گرتا پڑتا اپنے علی گڑھ کے دوست اور نئے نئے آئی.بی.ایس سعد محمود ہاشمی کے پاس کشمیری گیٹ آفیسر کواٹرس پر پہونچا۔وہ دیکھ کر خوش تو ہوئے لیکن کہا مجھے ضروری میٹنگ کے لیے نکلنا ہے میں تمہیں راستے میں کہاں چھوڑوں۔میں دوستی کے باوجود اپنی طلب زبان پر نہ لا سکا۔ مجھے وہ لال قلعہ کے سامنے چھوڑ کر نئی دہلی آفیشل میٹنگ

میں شریک ہونے چلے گئے۔ میں پیدل جامع مسجد پہونچا۔ کہیں کام نہیں بن رہا تھا۔ تھک کر سوچا ہماری پھوپی میمونہ جو حویلی اعظم خان میں رہتی ہیں ان سے ملاقات ہی کرلوں۔

راستہ میں گلی سرخ پوشان پڑی تو خیال آیا یہاں ابا جان کے دوست چچا انور صابری رہتے ہیں۔ ان کے گھر پہونچ گیا تو وہ بہت تپاک سے ملے۔ کھانا کھلایا چائے پلائی، خیریت پوچھی۔ ماحول خوشگوار تھا۔ ڈرتے ڈرتے عرض کیا: ''چچا ایک ضرورت ہے؟''

''بتاؤ بیٹا کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے علی گڑھ جانے کے لئے کرایہ کے لئے تین روپیہ چاہئیں۔''

انہوں نے اپنا صحتمند قسم کا پرس اٹھا کر میری طرف پھینک دیا۔

''لے لے بیٹے جتنے چاہئیں لے لے۔''

میں نے اصرار کیا وہ خود اپنے ہاتھ سے دیں۔ ان کا اصرار تھا میں خود لوں بالآخر میں نے پانچ روپیہ لے لئے۔ انہوں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا: ''بے وقوف بھتیجے زندگی میں پہلی دفعہ تو پیسہ مانگ رہا ہے اور وہ بھی تین روپیہ۔ نکال کر بیس کا نوٹ دے دیا۔'' میں خوشی خوشی پھوپھی میمونہ کے گھر گیا راستہ میں ان کے لئے شیرین بھون سے مٹھائی خرید لی۔ ان بیس روپے میں بہت برکت ہوگئی۔ علی گڑھ پہونچ کر بھی بہت سے دلدر دور ہو گئے۔ اس زمانے کے پیسوں میں برکت تھی۔ علی گڑھ کے پورے قیام میں خواہش رہی کہ پانچ روپے ماہورا جیب خرچ میسر ہوں تو صبح و شام کی چائے کا ایک کپ اور دھوبی کا خرچ نکل آئے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ لیکن یہ طمانیت کبھی میسر نہ آئی۔

ہمارے بزرگ کہتے تھے ہمیں ان کے زمانے میں جو برکت تھی وہ ہمارے زمانے میں کہاں! وہ اپنے حساب سے جب آٹے دال گوشت گھی کا بھاؤ بتاتے تھے تو یقین نہیں آتا تھا۔ ہمارے دور کی گرانی کو وہ ہمارے اعمال کی خرابی سے تعبیر کرتے تھے۔ حضرت مدنیؒ اس گرانی کو انگریزوں کی دانستہ کونونیل پالیسی کا نتیجہ بتاتے تھے۔ ان کو فتاویٰ عالمگیری

اور تاریخ بدایونی کے زمانے کی قیمتیں ازبر تھیں۔ہمیں ان کی تقاریر سن کر یہ یقین ہوگیا تھا کہ آزادی کے بعد قیمتیں پھر عالمگیری دور کے مطابق آ جائیں گی۔

اب ہمیں ضرور یہ بات افسانہ لگتی ہے کہ جامعہ ملیہ کی پہلی ملازمت (جولائی ۱۹۵۹ء) میں ہماری تنخواہ ۲۶۰/روپیہ ماہوار تھی اور ہم صرف چالیس روپیہ میں اپنا گذر بسر کر کے باقی پیسے امی جان کو بمبئی اور دوسرے مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔اب ہم جب امریکہ سے ہندوستان جاتے ہیں تو وہاں کی مہنگائی کے مقابلے میں خود کو زکوٰۃ کا مستحق سمجھنے لگتے ہیں۔وہاں امیر اور غریب کا فرق تیزی سے بڑھ رہا ہے۔خدا جانے یہ فرق ہندوستان کو کہاں لے جائے گا۔بظاہر تو لگتا ہے:

نے ہاتھ باگ پر نہ پا ہے رکاب میں

میری چند خدمات۔رفیع ریلیف سوسائٹی کا قیام:

ہمارے صدارتی دور میں چند ہی کام عام روش اور پروگراموں سے ہٹ کر ہوئے جنہیں ہم اپنا کنٹربیوشن سمجھتے ہیں۔ہمارا ایک پائدار کام یونین کی زیر سیادت رفیع ریلیف سوسائٹی کا قیام تھا۔۱۹۵۸ء میں رفیع احمد قدوائی صاحب کا انتقال ہوا۔وہ سچے مسلمان اور پکے قوم پرست تھے۔متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔غریب پرور تھے اور جس قوم کے وہ رہنما تھے وہ وزیر بن کر بھی اسی کے معیار پر رہتے تھے۔ان کے دروازے سے کوئی سوالی بلاتفریق مذہب ملت،خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔کانگریس اور قومی حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ پنڈت نہرو کی زندگی میں ہی وہ وزیراعظم بن جائیں گے۔ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

ان کے انتقال کے بعد پتہ چلا وہ کتنے طالب علموں کے غریبوں،یتیموں اور بیواؤں کے وارث تھے۔انہوں نے اپنے خاندانی تمول کے باوجود بہت سا قرض چھوڑا اور بہت سی ذاتی ذمہ داریوں کا پٹارا جسے ان کے سچے پکے قدردان دوست نہرو جی نے قبول کر لیا۔قدوائی صاحب مقبول علیگیرین تھے۔طارق غازی سلمہٗ نے اپنے سلسلہ مضامین

''یکتا یکتا'' میں ان پر بہت خوبصورت مضمون لکھا ہے جس میں ان کے درِ پردہ کردار کا واضح عکس ہے۔ان کی حکایات کا میں عینی شاہد ہوں۔

رفیع صاحب میں روحِ اسلام، نیشنلزم، ہندوستانیت اورانسانیت کا ایسا امتزاج تھا جو ،عام ہندوستانیوں کے لئے عموماً، مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور علیگیرینس کے لئے عموماً اور خصوصاً دونوں، کے لئے وہ رول ماڈل بن سکتا تھا۔اس لئے میں نے ان کے تعزیتی جلسے میں طلباء کی طرف سے مستقل خراج عقیدت ومحبت کے لئے رفیع ریلیف سوسائٹی کی تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوگئی۔

تجویز یہ تھی کہ طلباء اپنے پاس سے ۸/ (آٹھ آنے) ماہوار رفیع ریلیف فنڈ میں جمع کرائیں،امتحانات سے پہلے اس پیسے سے جن طلباء کے ہال ٹکٹ مالی دشواری کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں ان کے قرض کی ادائیگی ہو،تا کہ وہ امتحان دے سکیں۔

اس رزولیوشن کو یونیورسٹی کونسل نے تسلیم کرلیا اور رفیع ریلیف سوسائٹی کا قیام عمل میں آگیا۔اس وقت کے حساب سے ہمارا آمدنی کا اندازہ تیس چالیس ہزار کے لگ بھگ تھا۔اس کے بعد اس ماہوار رقم میں بھی اضافہ ہوااور طلباء کی تعداد میں بھی اب یہ لاکھوں کی رقم بنتی ہے۔مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تقسیم کا کیا نظام ہے۔میرا مقصد نہ صرف ایسا فنڈ قائم کرانا تھا جو طلبہ کی طرف سے ہو جس میں ہر طالب علم شرکت کر سکے اور مجھ جیسے طلباء کی مدد ہو سکے اس کے ساتھ ہی قدوائی صاحب کے رول ماڈل کو بھی پروموٹ کرنا تھا کہ علی گڑھ کے طلبا اسلام نیشنلزم اور ہیومن ازم کا نمونہ بن کر ملک وملت اور انسانیت کی خدمت انجام دیں۔

ڈیبیٹنگ سوسائیٹی کا قیام:

اس ضمن میں ایک اور کوشش اسپیکرس اور رائٹرس کے،فورم کا قیام تھا جس میں طلباء اور طالبات موثر گفتگو، ڈائلاگ اور ڈیبیٹنگ کی ٹریننگ حاصل کریں۔اس فورم کو ہم نے مونس رضا صاحب، ناصر صاحب،عبید صدیقی صاحب کی مدد سے چلایا جس میں طلباء

اور طالبات دونوں شرکت کرتے تھے۔ یہ فورم شاید ہمارے بعد جاری نہ رہ سکا لیکن ایسے فورم کی علی گڑھ کیا ہر ادارے کو ضرورت ہے۔ دراصل تحریر و تقریر یہی دو ذرائع قدرت نے دیئے ہیں۔ جس سے "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے پیغام اقراء میں پڑھنے اور لکھنے کی فضیلت بتائی ہے اور سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عظیم ترین رحمتوں میں "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" گفتگو کا علم بیان کیا ہے۔ دراصل ہم مسلمان اس کمیونکیشن کے دور میں تحریر اور تقریر کے فن میں سب سے پیچھے ہیں، اس لئے جب ہم قدرت کی عطا کردہ ان دونوں قوتوں کو کام میں لا کر نہ صحت مند استدلال کرتے ہیں نہ بروقت ضرورت اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں، تو بجائے افہام و تفہیم کے ہم منافرت اور تقسیم کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ بہر حال جو بات اس وقت کے علی گڑھ کے لئے ہم کرنا چاہتے تھے اسے ہم آج تک نہ کر سکے اور اگر اس دور کے علی گڑھ میں ہم اجنبی تھے تو آج کے امریکہ میں بھی مسلمانوں کی حد تک ہم اجنبی ہیں۔ امریکہ کے مسلمانوں کے پلیٹ فارم ہم پر ہمیشہ بند رہے۔ کیونکہ یہاں مسلمان قیادت کا طرز بیان اور طرز تحریر اکثر کاٹنے والا رہتا ہے جوڑنے والا نہیں۔ انسانیت کی تعمیر و ترقی کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے ہیں بلکہ اور پیچھے کی طرف جا رہے ہیں یعنی: ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

میری پوری کوشش یونین کے بجٹ کو بیلنس کرنے کی تھی جس کے لئے میں نے جو قدم اٹھائے ان کی بنیاد اخلاص پر اگر ہو بھی تو بعض قدم شاید غیر ضروری تھے۔ اول تو میں نے وہ بیس روپیہ ماہانہ جو صدر کے خصوصی خرچ کے لئے طے شدہ تھا وہ باوجود اشد ضرورت کے بھی خرچ نہیں کیا۔ دوسرا ابنواری (جو یونیورسٹی کا مستند فوٹوگرافر تھا) کی جگہ یونین کی پروفیشنل کام ایک این. آر. ایس. سی (نان ریذیڈنٹ اسٹوڈنٹ کلب) کے احمد نامی طالب علم کو دیدیا۔ میرے اس عمل سے احمد کی تعلیم کا خرچ نکل آیا اور یونین کو کچھ بچت

ہوگئی۔لیکن احمد صاحب کی تصویریں بنواری کے کام کے مقابلے میں دھندلی تھیں اور چند سالوں میں وہ سفید کاغذ پر اپنی یادگار چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ ہماری یونین کی تاریخ دیکھتے دیکھتے دھندلی ہوگئی۔

تیسرے میں نے جو خطبہ تحریری دیا تھا، اس کی کتابت بھی ہوچکی تھی، اس کو کتابت کرانے کے باوجود یونین کے بجٹ کی کمزوری کے سبب شائع نہیں کیا۔اس خطبہ کی بہت سی فکری باتیں قلم سے اظہار تک پہونچ کر بھی ان لوگوں تک نہ پہونچ سکیں جو میرے مخاطب تھے۔

آخر میں شان حیدر صاحب (آفس سیکریٹری اسٹوڈنٹ یونین) کے ایک بل کو روکدیا۔موسم گرما کی تعطیل کے زمانے میں بھی یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن کا اسٹاف کام کرتا ہے۔شان حیدر ایڈمنسٹریشن اسٹاف کے زمرہ میں آتے تھےلیکن چونکہ گرما کی تعطیلات میں یونین بند رہتی ہےتو چھٹی کر کے اس کو منانے کے لئے اپنے وطن امروہہ چلے جاتے تھےلیکن درمیان میں یونین کے کچھ کاموں کو دیکھنے کے لئے علی گڑھ کے سفر کرتے رہتے تھے۔وہ اپنے سفر کے بل یونین سے وصول کرتے تھے۔

میرے سامنے جب ان کے اسفار کے بل آئے تو میں نے مسترد کردیے۔شان حیدر اس سے پہلے روایتاً یہ کرایہ وصول کرنے عادی تھے۔ڈاکٹر بصیر خاں صاحب نے جو یونین کے مربی تھےان کی سفارش کی اور فرمایا کہ ان کی تنخواہ کم ہے بیوی بچوں کا بھی خرچہ بھی ہےاس لئے میں اس بل کو منظور کردوں۔ مجھے اس بل کو منظور کرنے میں تعمل تھا میں اس کو ان کا حق نہیں سمجھتا تھا۔لیکن شان حیدر کی تنخواہ میں باقاعدہ اضافہ کو صحیح سمجھ کر ان کی تنخواہ میں اتنا اضافہ کردیا کہ سفر خرچ سے زیادہ ہی ان کی مدد ہوگئی۔شان حیدر کی یونین کے لئے بے حد خدمات تھیں اگر وہ اپنی یاداشتیں لکھتے تو یونین کی تاریخ کا اہم حصہ ہوتیں۔شان حیدر نے پرائیویٹ کامرس میں ایم.اے کرلیا تھااور وہ لیکچرر ہوگئے تھے۔

امتحانات کے التواء کی تجویز:

چونکہ میرا انتخاب متفقہ طور پر ہوا تھا میں نے اس اتفاق کی روح کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی اور ہر حلقے سے مشورے کیئے۔ یوں تو کوئی بڑا اختلافی مسئلہ نہیں پیدا ہوا لیکن اگر ہوا تو اسے فوراً ہی حل کرادیا۔ یونین کی کارگزاریاں بہترین طریقہ سے انجام پاتی رہیں۔ مشاعرہ، کوی سمیلن لیکچرس آف اسلام ڈبیٹس پرسکون انداز میں منعقد ہوتے رہے جب امتحان قریب آیا تو مجھے بھی پڑھائی کی فکر ہوئی یونین کے کچھ عہدے داروں اور کچھ دوستوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''یہ سال پرسکون سال گذرا ہے۔ آپ زیدی صاحب (وائس چانسلر) سے کہہ کر دو ہفتہ امتحان کی تاریخ بڑھوالیں۔'' مطالبہ تو سادہ لوحی کا تھا ہمیں اس میں اپنا بھی بھلا نظر آیا کیونکہ اب ہم کو بھی امتحان کی تیاری کے لئے کچھ زیادہ ہی وقت درکار تھا۔

ہم یونین کا ایک وفد لے کر وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے حسب سابق خوش آمدید کیا۔ ہم نے یونین کی پرامن کارگزاری کا حوالہ دے کر دو ہفتہ امتحان کے التواء کی درخواست پیش کی تو انہوں نے ہماری اور یونین کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''واقعی علی گڑھ کی تاریخ میں یہ سال امن اور نظم کا تھا۔ مجھے بہت شاباشی دی اور فرمایا میں آپ کی درخواست ایگزیکیوٹیو کی میٹنگ میں پیش کردوں گا مجھے امید ہے وہ لوگ اس درخواست کو منظور کرلیں گے۔'' ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ ہم نے زیدی صاحب کی پیشکش کو ان کا وعدہ سمجھ لیا۔ ہم نے تو التوا کے نام پر تکا لگایا تھا ہمیں محسوس ہوا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے۔

ہم نے یونین میں واپس آکر یہ خوش خبری سنادی کہ زیدی صاحب نے ہمارے کیس کو ایگزیکیوٹی کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کا وعدہ کرلیا۔ یہ وعدہ والی بات ایگزیکیوٹیو کا فیصلہ بن کر یونیورسٹی میں پھیل گئی۔ جو لوگ امتحان کی تیاری کے لئے خود کو تیار کررہے تھے انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کتابوں اور نوٹس کو پھر طاق نسیاں میں واپس رکھ دیا۔

ادھر ہم کو امتحان کی تیاری کے لئے ایسی جگہ کی تلاش تھی جو بقول غالبؔ ۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

امتحان۔گوشۂ عافیت کی تلاش:

تلاش کرتے کرتے ہم سید مظفر علی (ڈپٹی لائبریرین) کے دفتر پہونچ گئے۔مظفر صاحب عمر میں ہم سے سینیر تھے لیکن ان سے تعلقات دوستانہ تھے۔ہم جب پہلی بار (۱۹۵۲ء) دلی کالج کے آل انڈیا ڈبیٹ میں شریک ہوکر فرسٹ پرائز اور ٹرافی کے مستحق ہوئے تھے تب سے مظفر صاحب سے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔وہ دلی کالج میں اردو کے لیکچرر تھے انہوں نے نہ صرف کالج میں میزبانی کا حق ادا کیا تھا بلکہ دلی بھی خوب دکھائی اور جامع مسجد کے تاریخی ہوٹل کریم میں کھانا بھی زبردست کھلایا۔پھر وہ ڈپٹی لائبریرین بن کر علی گڑھ تشریف لے آئے۔اور ہماری دوستی میں اضافہ ہوگیا۔وہ اس وقت تک غیر شادی شدہ تھے اور ان کا گھر دودھ پور میں اللہ میاں کے پچھواڑے فیاض منزل میں تھا جہاں علی گڑھ کی سولائزیشن ختم ہو جاتی تھی۔

مظفر علی صاحب نے ہماری درخواست منظور کر لی اور اپنی شرائط پیش کر دیں۔ ''نمبر ایک آپ میرے گھر سے لیڈری نہیں کریں گے۔ نمبر دو وہاں آپ سے کوئی ملاقات کو نہیں آئے گا۔ نمبر تین وہ صبح آفس جاتے ہوئے تالہ لگا کر نکلیں گے اور خود آ کر اس کو کھولیں گے، نمبر چار میں دیوار کود کر نہیں بھاگوں گا'' میں نے سب شرائط منظور کر لیں تو فرمایا: ''صبح کا ناشتہ انڈے اور توس عام دنوں میں، پوری اور آلو کی ترکاری چھٹی کے دن میں خود بنا کر پیش کروں گا۔دوپہر کا کھانا کھڑکی سے آپ تک پہونچ جائے گا۔چائے جب چاہیں خود بنا کر پئیں رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔آپ پوری توجہ سے پڑھیں گے اور نماز اور دعاؤں میں زیادہ وقت ضائع نہ کریں گے۔''

ہاشم قدوائی صاحب کا کتابستان اور ہم:

میں نے ساری شرائط کو منظور کر کے اور آخری ہدایت کو نصیحت سمجھ کر یہ اجازت چاہی کہ ہر روز شان حیدر (یونین کے سیکریٹری) خود آ کر کھڑکی سے مجھے یونین کے احوال سے باخبر کرتے رہیں گے۔ یہ شرط مظفر صاحب نے منظور کر لی۔ میں خاموشی سے چند ضروری سامان اور جو کتابیں موجود تھیں ان کو لے کر تیار ہوا تو معلوم ہوا کہ ہمارے پاس زیادہ تر درسی کتابیں موجود نہیں۔ لائبریری کے نسخے اول تو قانوناً لائبریری نہیں چھوڑ سکتے تھے دوسرے اگر وہاں کوئی مطالعہ کرنا بھی چاہتا تو ان میں ضروری صفحات امتحان گاہ میں پہلے سے پہونچے ہوئے ہوتے تھے۔ ایسے میں اپنے محترم استاد ہاشم قدوائی صاحب کی لائبریری پر نظر گئی۔ ہم پہلے بھی اس سے استفادہ کر چکے تھے وہ امین ہاسٹل (جس میں ہندو طلباء رہتے تھے) کے وارڈن اور مربی تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مؤدبانہ درخواست پیش کی۔ انہوں نے فرمایا: ''صاحب آپ کو پڑھنے کی فرصت کب ہو گی صاحب، تو صاحب اگر فرصت ہوگی تو صاحب آپ کو کون پڑھنے دے گا صاحب؟''

ہم نے عرض کیا: ''صاحب قدوائی صاحب، میں ایسی جگہ صاحب جا کر پڑھوں گا کہ صاحب وہاں کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ صاحب!''

غرض تھوڑی سی ردوقدح کے بعد قدوائی صاحب نے حسب دستور سابق اپنی لائبریری کی اہم کتابیں ہمارے سپرد کر دیں۔ جسے ہم رکشا میں رکھ کر فیاض منزل پہونچ گئے۔ مظفر صاحب اتنی کتابیں دیکھ کر چونک گئے اور فرمایا: ''یہاں امتحان کتابیں لاد کر لانے سے نہیں پاس ہوتا بلکہ انہیں پڑھ کر از بر کرنے سے ہوتا ہے۔ اب آپ کے پاس ہفتے ہی کتنے ہیں۔'' مظفر صاحب کے لب و لہجے سے ہمارے مستقبل کے بارے میں خاصی مایوسی ٹپک رہی تھی۔

امتحان بدستور۔عابداللہ غازی ہائے ہائے:

ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ان کے انڈوں کا ناشتہ ضائع نہیں جائے گا۔دو چار دن گذرے ہوں گے کہ شان حیدر صاحب نے کھڑکی پر دستک دی۔ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔میں نے پوچھا خیر تو ہے؟فرمایا:''غضب ہوگیا یونیورسٹی کونسل نے دو ہفتہ امتحان کے التواء کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔اب یونین میں سب لوگ جمع ہیں اور غازی ہائے ہائے کے نعرے لگ رہے ہیں۔''

اس وقت تو میں گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔شام میں مظفر صاحب کو خبر کی اور ان سے اجازت لی اور تالے کی چابی طلب کی۔کچھ تکرار کے بعد انہوں نے چابی عطا کر دی اس ہدایت کے ساتھ''یہ چابی آزادی کا پروانہ نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کی مجبوری ہے۔'' دوسرے دن یونین میں پہونچا تو طلباء نے،جن کی رہنمائی ہمارے احباب خاص طور پر نیر قدر واصف علی مرزا کر رہے تھے،ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ان کا کہنا تھا کہ امتحان کے ۱۵ر دن التواء کی نامنظوری سے یونیورسٹی کے اکثر طلباء متاثر ہوئے ہیں جس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔اس لئے کچھ طلباء نے عدم اعتماد کی دستاویز پر دستخط کرانے کی مہم شروع کر دی تھی۔

ہمارے دوست نیر قدر مرزا اور کچھ یونیورسٹی کی اقدار کے علمبرداروں کا یہ بھی الزام تھا کہ ہم امتحان دیکر علی گڑھ کی شاندار روایات کی توہین کر رہے ہیں جس کی رو سے صدر اور سکریٹری کو روایتاً ڈراپ کرنا چاہئے۔یہ روایت بھی علی گڑھ کی اس شاندار روایت کی طرح تھی جس کا سامنا ہمیں ۱۹۵۵ کے صدارتی الیکشن میں مبشر محمد خان کے مقابلے میں کرنا پڑا تھا۔یعنی انڈر گریجویٹ ہوتے ہوئے صدارتی الیکشن لڑنا علی گڑھ کی شاندار روایات کے منافی تھا۔اس روایت کی پاسداری میں ہمارے بہت سے معتبر طرف داروں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس سارے ہنگامے کا مقصد بہت حد تک ہمارے تعلیمی انہاک کو متزلزل کرنا تھا۔ہم جس قدر وہ متزلزل کرنا چاہتے تھے ہم اسی قدر امتحان دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ہماری یونین کیبنٹ ہمارے ساتھ تھی اور ہمارے سیکریٹری صغیر میاں (بھوپالی) ہمارے ہمدرد تھے۔سب نے مشورہ کر کے طے کیا کہ زیدی صاحب سے مل کر دوبارہ امتحان کے التواء کی کوشش کی جائے۔میری سربراہی میں چند افراد زیدی صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔زیدی صاحب نے اپنے بنگلہ پر بلالیا اس وقت ان کی روشن خیال اور با وقار بیگم قدسیہ بھی موجود تھیں۔

گفتگو شروع ہوئی تو ہم نے زیدی صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور زیدی صاحب نے ہمیں یاد دلایا کہ ان کا وعدہ ایگزیکیوٹو کونسل میں تجویز پیش کرنے کا تھا سو انہوں نے تجویز پیش کر دی تھی۔ہم نے عرض کیا کہ آپ اس وقت طلباء کے اشتعال انگیز جذبات کی وجہ سے دوبارہ کونسل سے رجوع کریں۔" انہوں نے فرمایا:"کونسل اپنے فیصلہ پر ایک سال سے قبل غور نہیں کرسکتی۔" بات بڑھتی رہی اور ہمارے تکرار پر انہوں نے غصہ سے فرمایا:"غازی میاں! آپ جانتے ہیں میں ریاست رامپور کا وزیر اعظم رہا ہوں اور میں جانتا ہوں ایڈمنسٹریشن کیسے کیا جاتا ہے۔" ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:"وزیر اعظم ہونا اور بات ہے وائس چانسلر بن کر طلباء کو قابو میں کرنا دوسری بات ہے، ہم نے سال بھر مکمل امن قائم رکھا ہے۔ہم امن کو برہم بھی کرنا جانتے ہیں یہ امن اگر برہم ہوگا تو آپ پر ذمہ داری ہوگی۔"

یہ کہہ کر ہم اٹھ گئے ہماری نظر میں زیدی صاحب سے زیادہ بیگم زیدی پر تھیں جن کی خاموشی میں تناؤ اور غصہ کی پوری جھلک تھی لیکن وہ کچھ بول نہیں سکتی تھیں۔انہوں نے رامپور کے وزیر اعظم کی بیگم ہوتے ہوئے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ چیلنج کر کے ہم واپس تو آ گئے مگر ہمیں خود خبر نہیں تھی کہ ہم اس چیلنج کو کس طرح نبھائیں گے۔ہم خاموشی سے کسی بہانے کھسک کر اپنے مستقر پر آ کر کتابیں کھولنے بند کرنے میں لگ گئے۔کتاب کے صفحوں سے الفاظ غائب ہو گئے تھے۔خواب و خیال میں غازی ہائے ہائے کے نعرے سنتے رہے اور سپلمنٹری کے خواب دیکھتے رہے۔خواب میں ہی

یکا یک ایک خیال دماغ میں آیا جسے ہم نے جاگ کر محفوظ کرلیا۔

مسئلہ لاینحل کے حل کی تلاش:

دوسرے دن شان حیدر نے آکر اطلاع دی ڈاکٹر بصیر خان شام میں ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔اور ہماری عدم اعتماد کی تجویز پر دستخط تیزی سے جمع ہورہے ہیں۔

ڈاکٹر بصیر خان کا رتبہ بڑا تھا وہ سید محمد شفیع صاحب کے بعد یونین کے مربی بنے تھے۔ان کے قد وقامت اور انداز صدر جمال عبدالناصر سے مشابہت رکھتے تھے۔یونیورسٹی میں ان کا بہت رعب داب تھا اور وہ اسلامی گروپ کے بھی رکن سمجھے جاتے تھے۔میں سارا وقت ان سے ملاقات کے وقت پر بولنے کے لئے کے ڈائیلاگ پر غور کرتا رہا۔ہمارا امتحان لگتا تھا اب آئندہ سال ہی ہوگا۔ہم نے بھی طے کرلیا ع

اب تو جو فیصلہ ہونا ہے یہیں پر ہوگا

بصیر خان نے گفتگو بہت سلجھے ہوئے لہجہ میں کی۔انہوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ اس واقعہ کی وجہ سے خود مجھے عدم اعتماد کے ووٹ کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔وائس چانسلر کا کام ایگزیکیوٹیو کونسل تک آپ کی درخواست پہونچانا تھا لیکن کونسل نے یہ بات تسلیم نہیں کی کہ محض اس لئے کہ یونین کا رول اور طلباء کا برتاؤ اس سال مثالی رہا تھا،اس لئے دو ہفتے امتحان بڑھا دیا جائے۔پھر انہوں نے سنجیدگی سے فرمایا:''کونسل کا فیصلہ تبدیل نہیں ہوسکتا اب اس سلسلہ میں اگر ہنگامہ ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی آپ کے ہی سر آئے گی۔ اب ہم دونوں مل کر کوئی ایسا فیصلہ کریں کہ طلباء اور کونسل دونوں مطمئن ہوجائیں۔''میں نے بھی دھیمے لہجے میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا پھر عرض کیا دو دن بعد یونین میں عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوگی اس وقت میں ایک تجویز رکھوں گا۔''

بصیر خان نے بے قراری سے پوچھا:''کیا یہ ممکن ہے مجھے وہ تجویز بتادو۔''

''میں آپ کو بتادیتا ہوں لیکن یہ راز رہے؟''میں نے جواب دیا۔

بصیر صاحب نے قہقہہ لگا کر فرمایا: ''اگر تمہیں مجھ پر یقین ہو تو بتاؤ''

میں نے عرض کیا: ''اب آپ نے ایسی بات کہدی کہ آپ کو بتانا ضروری ہو گیا۔ وہ بات یہ ہے کہ امتحان کونسل کے فیصلہ کے مطابق مقررہ تاریخ کو شروع ہو۔ پھر ایک ہفتہ کا وقفہ دیکر دوسرا پرچہ ہو اور پھر ایک ہفتہ بعد باقی امتحان مکمل ہو جائیں۔''

یہ سن کر بصیر صاحب کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ انہوں نے فرمایا میں اس رزولیوشن پر عمل کی اجازت وائس چانسلر صاحب اور رجسٹرار صاحب سے اگر تم اجازت دو تو آج ہی لے لوں!؟''

میں نے عرض کیا طلباء کی حد تک یہ راز رہے، پھر ہم دونوں نے یہ پلان بنایا کہ ہم عدم اعتماد کا رزولیوشن پیش ہونے دیں گے۔ اس کے بعد میں یعنی صاحب صدر یہ تجویز پیش کر دیں پھر بصیر خان صاحب اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے وعدہ کریں کہ وہ اس پر عمل کرائیں گے۔'' بصیر خان نے دوسرے دن مجھے بتادیا کہ وائس چانسلر صاحب اور رجسٹرار نے خاموشی سے میری تجویز کو مان لیا ہے۔ اس بات کی طلباء میں کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔

دو دن بعد یونین کا جلسہ تھا ماحول جذباتی تھا۔ ہمارے خلاف تقریروں کا سلسلہ جاری تھا۔ یونین بھی کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ میں نے صدارتی کلمات میں اصل مسئلہ کا ذکر کیا اس کے حل کا نہیں کیا۔ بعض طلباء ہوٹنگ کرتے رہے۔ دو چار تقریروں کے بعد ڈاکٹر بصیر خان نے اسٹیج پر آ کر فرمایا کہ اس معاملہ میں صاحب صدر کا قصور نہیں بلکہ کونسل کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے اس فیصلہ کے بدلنے کا کوئی امکان نہیں۔ اب کونسل کے فیصلے سے مطابقت رکھتے ہوئے کوئی تجویز ہے تو وہ اسے یونیورسٹی کے پاس لے جاسکتے ہیں۔ ہال میں کسی کے پاس غازی ہائے ہائے کے علاوہ کوئی تجویز نہ تھی۔

پھر میں نے وہ تجویز پیش کی جس پر خفیہ اتحاد پہلے سے ہو چکا تھا۔ اس تجویز سے ہال میں پہلے سناٹا ہوا پھر ایک دم تالیاں بجنے لگیں۔ یہ تجویز پندرہ دن کے التواء سے زیادہ

بہتر تھی۔امتحان وقت پر ہو۔ پہلے پرچے کے بعد ایک ہفتہ کا گیپ اور دوسرے پیپر کے بعد ایک اور ہفتہ کا گیپ پھر باقی پرچوں کا امتحان۔فوراً بصیر خان صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ میں آج ہی وائس چانسلر کی خدمت میں پیش کردوں گا۔ ہال تالیوں سے گونج گیا۔تحریک عدم اعتماد واپس ہو گئی۔ بلکہ اس خوشی میں طلباء اس کو بھول گئے۔

دوسرے دن یونیورسٹی نے اس تجویز کے مطابق امتحان کا اعلان کر دیا اور ہماری آہ آہ اب واہ واہ ہوگئی اور ہم پھر اپنی کتابوں کے ساتھ مظفر صاحب کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔

علی گڑھ کو الوداع:

مظفر صاحب کا تیار کردہ صبح کا انڈے کا ناشتہ، دوپہر کا ان کا جاری کردہ ٹفن اور رات میں ان کے ساتھ عشائیہ ان کے دلچسپ جملوں، طعنوں، تشنیعوں اور ہمت افزائیوں کے ساتھ امتحان کی تیاری میں معاون تھا۔اس درمیان میں یہ احساس بیدار ہوا کہ اس امتحان کا مطلب علی گڑھ کو الوداع کہنا ہے دیکھتے دیکھتے نظم ''آخری شب'' مکمل ہوگئی اور رشید شیروانی کے اخبار ''دوست'' میں چھپ کر بین العلی گڑھ رسوائی کا باعث بن گئی۔

اپنے شوق کا قصہ اس سے کہہ نہ پائے ہم
اپنے شوق کا قصہ آج تو سنا ڈالیں

بات جس کی تھی یہ معلوم نہ ہوسکا اس آفت جاں تک پہونچی یا نہیں یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ بعض لڑکیاں خاموش رہ کر مجرم ٹھہرائی گئیں۔

میری یہ نظم مقبول ترین نظموں میں سے ہے اور علی گڑھ کے مشاعروں میں سنی جاتی ہے۔ بعض میگزینوں میں شائع ہو چکی ہے۔اور میرے مجموعۂ کلام ذکر سمن عذاراں میں بھی شامل ہے۔

انہیں امتحان کی راتوں میں مچھروں کھٹملوں سے مقابلہ کرتے ہوئے میں نے

غالب کی غزل پر ''امتحان'' کے نام سے پیروڈی لکھدی تھی۔

مدت ہوئی کتاب کو مہماں کئے ہوئے
چائے سے اپنی بزم چراغاں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں ڈیوز کی فہرست دیکھنا
جاں نذر دلفریبی عنوان کے ہوئے
مانگے ہے سیمنار میں اس بت کو آرزو
زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے

(ذکر من عذاراں)

امتحان کے قریب میں آفتاب ہوسٹل واپس آ گیا لیکن گھر کی چابی مظفر صاحب کو واپس نہیں کی۔ تیاری کا دن اکثر وہاں گزرتا اور امتحان کی رات آفتاب ہوسٹل میں بسر ہوتی۔ ہمیں یونین کی ہنگامی زندگی میں کچھ سکون کے چند ہی لمحے قدوائی صاحب کی عطا کردہ درسی کتابوں کو پڑھنے کے لیے میسر نہ آسکے لیکن مہاجن چٹرجی، بنرجی کے تیار کردہ امتحان کے نسخوں کو گھونٹ کر پینے کی کوشش کی۔ پھر بھی لگتا تھا کہ ہم نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔

کچھ نہ جانا سو یہ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم　　(میرؔ)

بالآخر امتحان آپہونچا۔ ہمارے لئے امتحان کی رات کی پڑھائی انتہائی مفید رہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر امتحان کی رات نہ ہوتی تو ہماری امتحان میں بھی کامیابی نہ ہوتی۔ ہمارے دائیں اور بائیں جو دو طالب علم تھے وہ ہم سے بہت مختلف تھے ان کا تعارف ہو چکا۔ ہمارے کمرے کے دائیں ہاتھ پر نجات اللہ صدیقی صاحب کا کمرہ تھا۔ نجات صاحب جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ یہ حضرت دن رات پڑھتے رہتے تھے۔ اختصاص کے لئے انہوں نے اقتصادیات کے میدان کا انتخاب کیا تھا۔ ان کو یونین اور سیاست سے

سروکار نہیں تھا۔ ہمارے کمرے کے دوسری جانب حامد انصاری صاحب (حال نائب صدر ہند) تھے جو علوم سیاسیات میں ہمارے کلاس فیلو اور ہم سبق تھے۔ ان سے ہم سنجیدگی سے امتحان میں آنے والے اہم اور ضروری موضوعات پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ انہیں سال بھر لگن سے پڑھنے کی عادت تھی۔ انہیں امپورٹنٹ کی فکر نہیں تھی۔ وہ کبھی پرانے امتحانات کے پرچوں کو سامنے رکھ کر ان سوالات کے جوابات لکھ کر نہیں رٹتے تھے۔ ہمیں ان سے بھی کوئی فیض پہونچنے والا نہیں تھا۔ امتحان کے سلسلہ میں ان کی بازاری پیٹنٹ نسخوں سے بے اعتنائی دیکھ کر ہمیں ان کی فکر تھی کہ وہ کیسے امتحان پاس کریں گے!

ہماری زود پشیمانی اور امتحان کی تیاری اور شیخ:

ہم نے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی اور جملہ تعلیمی مصروفیات کے ساتھ آخری ایام میں جم کر بھنڈاری چکرورتی اور مہاجن قسم کی شخصیات کے نوٹس جی توڑ کر پڑھے۔ ایک بار میں پولیٹکل سائنس اور تاریخ کے شعبہ کے سیمینار (لائبریری) میں سب سے چھپ کر بیٹھا شارٹ نوٹس پڑھ رہا تھا کہ شعبۂ تاریخ کے چیرمین شیخ رشید صاحب تشریف لے آئے۔ مجھے نوٹس پڑھتے دیکھ کر انہوں نے تنبیہ کی کہ: ''نوٹس پڑھ کر امتحان دینا اور پاس کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔ ہمیشہ معیاری اور مستند کتابیں پڑھنی چاہیں۔'' پھر انہوں نے مونرو (Monroe) اور لنگزاوسکی (Langzowsk ی) کی کتب لائبریری سے نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں پھر دونوں کتابوں کی خصوصیات بتائیں۔ کس کتاب میں کونسا موضوع بہتر ہے۔ شیخ رشید مورخ تھے علوم سیاسیات کے ماہر نہیں تھے۔ لیکن ان کی معلومات سیاسیات کی کتابوں کے بارے میں بھی اسی قدر مستند تھیں جس قدر تاریخ کے موضوع پر تھیں۔

چوں کہ شعبہ سیاسیات اور تاریخ ایک ہی عمارت میں تھے اس لیے ہم دونوں شعبوں کے اساتذہ سے متعارف بھی تھے اور مستفید بھی ہوتے رہتے تھے۔ علی گڑھ کی بڑی روایت اساتذہ اور طلباء کا ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور احترام تھا۔ رشید صاحب سے ہم

نے اس دن سے پہلے یا اس کے بعد کوئی سبق نہیں پڑھا لیکن ہم خود کو ان کے شاگردوں میں سمجھتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر چلے گئے تھے۔ ۵۸ء میں پہلی بار پاکستان گیا اور میں پنجاب یونیورسٹی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ کلاس روم میں تھے۔ میں شریک درس ہو گیا۔ یہ میرا دوسرا سبق تھا جو میں نے ان سے پڑھا۔ درس کے بعد بہت تپاک اور شفقت سے ملے پھر فرمایا: ''تم کہاں غائب رہتے ہو؟ کلاس میں کم ہی نظر آتے ہو؟۔''

میں نے عرض کیا: ''میرا نام عابد اللہ غازی ہے اور میں علی گڑھ سے حاضر ہوا ہوں۔''

رشید صاحب نے اس طرح لپٹایا جیسے باپ اپنی بچھڑی ہوئی اولاد کو لپٹائے۔ مجھے لپٹانے میں وہ دراصل علی گڑھ کی یادوں سے بھی لپٹ رہے تھے۔ پھر دفتر اور گھر پر ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے فرمایا: ''برصغیر کی جدید تاریخ میں بہت سے خلاء ہیں۔ ان میں خاص خلاء جنگ آزادی میں علماء کے رول کا ہے اور خصوصیت سے تحریک شیخ الہند جس میں آپ کے دادا محمد میاں منصور انصاری نے شرکت بھی کی اور قربانیاں بھی دیں۔ اب تمہارا کام ہے کہ تم اس میدان میں کام کرو۔''

میں نے ان کی نصیحت پر عمر بھر عمل کیا لیکن جب اس تحقیقی مواد کو مرتب کرنے کا وقت آیا تو دوسرے بزرگوں کے حکم اور معلّمہ بیگم کے اصرار پر بچوں کی اسلامی تعلیم کے کام میں عارضی طور پر مصروف ہو گیا اور اب عمر کے ۸۰-۷۹ گزرنے کے بعد اسی کام میں اس طرح گھرا ہوا ہوں جیسے روز اول تھا۔ میں تحقیقات کا وہ حصہ جس کا تعلق لندن کے آرکائیوز کی ریسرچ سے تھا۔ اسے اسعد مدنی صاحب نے کمالِ دانشمندی سے مجھ سے منگوا کر مولانا محمد میاں کے نام سے شائع کرا دیا۔ لیکن وہ کام مولویانہ ہے۔ اس کے بعد مجھے مزید ڈاکومنٹ میسر آئے۔ رخش عمر ذرا مہلت دیں تو اس کام کو انجام دوں۔ اب تو نہ

ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

امتحان کی رات اور حامد انصاری:

مجھ میں اور حامد انصاری میں انصاریت کی نسبت مشترک تھی۔ میرا تعلق مولانا عبداللہ انصاری سے تھا جو انبہٹہ کے اندھے پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ وہ علی گڑھ کے پہلے ناظم دینیات تھے۔ حامد انصاری کا ڈاکٹر مختار انصاری اور حکم نابینا سے رشتہ تھا۔ ہم دونوں ہندوستان کے حالات کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگر وہ یونین میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے تو میں ان کی کرکٹ کو تضیع اوقات سمجھتا تھا۔ یوں تو ان کی کرکٹ سے دلچسپی بھی اکیڈمک نوعیت کی تھی ہم نے انہیں نہ بالنگ کرتے دیکھا نہ بیٹنگ ہمیشہ ایمپائری کرتے ہوئے پایا۔ بالنگ وہ شاید جانتے بھی نہیں تھے بیٹنگ میں وہ زیادہ دیر تک ٹک نہیں پاتے تھے۔ مزاج میں توازن تھا اس لئے سفید کوٹ پہن کر ایمپائری ہی ایسا شغف تھا جو کرکٹ کے میدان میں ان کے لئے دیرپا تھا۔ کرکٹ کا تجربہ اب نائب صدر کی حیثیت سے راجیہ سبھا کی ایمپائری میں کام آ رہا ہے۔

حامد انصاری کا اتنا بڑا تعارف میں نے بلاوجہ نہیں کرایا۔ ایک شب وہ آئی کہ صبح ورلڈ کانسٹیٹیوشنس (World Constitutions) کا پرچہ تھا۔ میں برٹش کانسٹی ٹیوشن پڑھ رہا تھا اور امپورٹنیٹ سوالات کے جوابات مہاجن کے نوٹس کی مدد سے ذہن نشین کر رہا تھا۔ دماغ جب بہت تھک گیا تو سوچا چلو حامد انصاری کو بور کیا جائے۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹے ہوئے تھے اور ایک موٹی سی کتاب ہاؤس آف لارڈس پر پڑھ رہے تھے۔ ہم جس امپورٹنیٹ کی تیاری کر رہے تھے اس میں ہاؤس آف لارڈس کا ذکر نہ تھا۔ وہ بھی کم و بیش پانچ سات سو صفحوں کی کتاب۔ کتاب کی ضخامت پر ہمیں تعجب نہ تھا کیونکہ حامد انصاری چھوٹے موٹے نوٹس کو نظر انداز کر کے اوریجنل کتابیں پڑھتے تھے اور کبھی نوٹس نہ بناتے تھے۔ مجھے ان کے ہاتھ میں ہاؤس آف لارڈس پر کتاب دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور پریشانی بھی کہ

ہم نے یہ موضوع سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا یہ کتاب امتحان کیلئے پڑھ رہے ہو۔انہوں نے مسکرا کر فرمایا: ''امتحان کی رات میں کون امپورٹینٹ کے علاوہ پڑھتا ہے۔''

''کیا تمہیں کسی سے معلوم ہوا ہے کہ ہاؤس آف لارڈس پر سوال ہوگا؟ ہم نے سوال کیا اور حامد انصاری نے مسکرا کر جواب دیا کہ: ''تمہیں اس بات کا علم نہیں ناصر صاحب نے تو سب کو امپورٹنٹ بتایا تھا۔''

یہ بات سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے کہا: ''جب تم یہ کتاب پڑھ چکو تو مجھے پہونچا دینا۔''

میں واپس جا کر پھر امپورٹنٹ کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حامد آئے اور میری میز پر کتاب رکھ کر فرمایا: ''پارٹنر سب چھوڑ کر اس کو پڑھ لو۔ بیڑا پار ہو جائے گا''

میں ان کے جانے کے بعد اپنے امپورٹنٹ کی تیاری میں لگ گیا۔ دو اک گھنٹے بعد اپنی پڑھائی سے فارغ ہوا تو ہاؤس آف لارڈس کو پڑھنے کے لئے کتاب اٹھائی۔ ورق گردانی کی تو معلوم ہوا وہ ہاؤس آف لارڈس کے بارے میں نہیں تھی بلکہ لارڈس کے فیلڈ پر ہونے والے کرکٹ میچز کے بارے میں تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں سیدھا حامد انصاری کے کمرے پر پہونچا۔ وہ سو چکے تھے میں نے کتاب ان کے اوپر پھینک کر کہا: ''یہ کیا مذاق ہے؟''

وہ گھبرا کر اٹھے اور پوچھا ''کیسا مذاق؟۔''

''یہی کہ امتحان کی رات میں بھی تم لارڈ کی کرکٹ کے بارے میں پڑھ رہے ہو؟۔''

''پارٹنر! میں امتحان سے ایک ہفتہ پہلے پڑھائی چھوڑ دیتا ہوں اور صرف کرکٹ کے بارے میں پڑھتا ہوں۔ جو میں اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں سوچا تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا۔'' ان کا جواب تھا۔ میں لاحول ولا قوۃ پڑھتا ہوا اپنے کمرے پر لوٹا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ صبح ۹ بجے سے امتحان تھا سوچا تھوڑا بہت آرام کرلوں۔ صبح امتحان دیا تو امتحان

کے پرچے میں وہی کچھ آیا جو ہم نے تیار کیا تھا۔اس میں نہ لارڈ کی کرکٹ کا ذکر تھا نہ ہاؤس آف لارڈ کا۔پورا امتحان میں کامیابی کے لئے جو پڑھا تھا وہ پورا کا پورا آ گیا۔چند ماہ بعد امتحان کے رزلٹ نے بتایا کہ فرسٹ کلاس لانا کوئی مشکل نہیں ہمارے کلاس فیلو شہزاد احمد تو امتحان کی تیاری اس طرح کرتے تھے جیسے جہاد پر جارہے ہوں۔پڑھنا،نوٹس بنانا،گھڑی رکھ کر لکھنے کی پریکٹس کرنا اپنی کارگذاری کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دینا۔بس ان کے بہار کے ایک دوست معتقد اور مرید تھے جن سے وہ اپنی اسٹڈی کے راز افشاء کرتے تھے۔یا انہیں بزاخفش کی طرح استعمال کرتے تھے۔

اس بار جب رزلٹ آیا تو ڈیپارٹمنٹ کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔پانچ فرسٹ کلاس۔شہزاد احمد نے سب سے زیادہ نمبر لاکر ہم سب پر ہی فوقیت حاصل نہیں کی بلکہ شعبۂ سیاسیات کا نیا ریکارڈ قائم کردیا۔فرسٹ کلاس آنے والوں میں ان کے دوست اور ایک سردار صاحب بھی تھے۔شہزاد احمد نے باقاعدہ امتحان کی تیاری کرکے حامد انصاری نے سال بھر پڑھ کر ہم نے سیاسیات کا پریکٹکل تجربہ یونین اور نیشنل کونسل کے ساتھ کرکے فرسٹ کلاس حاصل کرلیں۔شہزد احمد کو امریکہ میں پولیٹکل سائنس پڑھانے کی ملازمت ملی اور عزت سے ریٹائر ہوئے۔حامد انصاری کو ہندوستان جنت نشان کی نائب صدارت حاصل ہوئی ہمیں کبھی ختم نہ ہونے والا امریکہ باس (بروزن بن باس)۔ ع

قدر ہر کس بقدر خدمت اوست

باقی دو اور ساتھیوں کے بارے میں علم نہیں ان کا کیا بنا لیکن یہ علم ہے ہمارے دور کے جو بھی ہونہار طلباء تھے اور پاکستان نہیں گئے تھے وہ سب اپنے اپنے پیشوں میں کامیاب رہے تھے۔درحقیقت یہ ہمارا نہیں بلکہ علی گڑھ کا کمال ہے کہ وہ مکھی مچھر کا ریاض کرا کے اور مٹری اور مکھن کھلا کے گاؤدی اور بے ہنگم لوگوں کو بھی قائدانہ صلاحیتیں عطا کردیتا ہے۔گویا یہاں کے ہر طالب علم کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ:

ع اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری۔

ذاتی زندگی کے مدوجزر: چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

اکتوبر ۱۹۵۷ء ماک یواین اور سیشن کے ہلکے پھلکے خوش گوار واقعہ نے اس سال کچھ سنجیدہ صورت اختیار کرلی تھی، جس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر کے علاوہ کوئی حقیقت ع چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد سے آگے نہ بڑھتی۔مگر عارفہ جعفری نے منہ بولی بہن بن کر یا تسنیمہ کی مخلص سہیلی بن کر ایک عجیب وغریب ذمہ داری اپنے سر لے لی۔اس عرصہ میں عارفہ جعفری سلمہا اور انکے خاندان سے ربط ضبط بڑھتا رہا۔ ہر چھٹی میں جانے کے لئے مجھ بے گھر بے در کے طالب علم کو اوپر کورٹ، بلند شہر میں ایک گھر مل گیا تھا۔عارفہ بی تسنیمہ کی گہری دوست تھیں۔عارفہ کے دل میں کیا تھا وہ مجھ سے نہیں کہتی تھیں اور میرے دل میں کیا تھا وہ خوب جانتی تھیں اور میرے حالات کو دیکھ کر یہ بھی سمجھتی تھیں کہ میرا دور دور شادی کا ارادہ نہیں ہے۔میرے پاس اس سوت اور کپاس کا فقدان تھا جس سے شادی کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔

صدارتی سال میں ہم نے غیر شعوری طور پر قوم کی فلاح کے لئے یہ کام کیا تھا کہ یونین میں ایک ڈبیٹنگ کلب نوجوانوں کی تقریری تربیت کے لئے قائم کیا۔ممتاز آپا اور پاپا میاں سے اسکا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بچیوں کی ہمت افزائی کریں گی۔ ہم نے بھی تائید میں عرض کیا کہ قوم کی بہبود تعلیم نسواں میں ہے اور ہندوستان کے تناظر میں مسلم خواتین کو آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ پاپا میاں ہماری باتوں سے بہت خوش ہوئے وہ خود عملی انسان تھے اس لئے وہ ہمارے عملی اقدام کے سب سے بڑے موید بن گئے اور ممتاز آپا سے ہماری تجویز کی پرزور سفارش کردی۔

لڑکیوں کا ایک گروپ رجسٹریشن کے لئے آیا اور بالا ہی بالا رجسٹریشن کرا کے رخصت ہوگیا۔ ہم نے بنظر غائر اس فہرست کا مطالعہ کیا تو سرفہرست وہ نام نظر آیا جسکی تربیت کی ہمیں غیر شعوری طور پر نہ جانے کیوں فکر تھی۔ ذاکر صاحب بعض نوجوانوں کو اپنی

خاص توجہ کے لئے منتخب کر لیتے تھے اگر انہیں ان میں مستقبل کے کچھ امکانات نظر آتے۔ ہم بھی بزعم خویش ان کی اس فہرست میں تھے۔ اپنی اس معصوم جستجو میں ہمیں ذاکر صاحب کے نیک عمل کی جھلک نظر آئی، ہم نے اپنے یقین کو عین الیقین بنانے کے لئے بار بار اس فہرست کو دیکھا اور غالب کی زبان مستعار لے کر عرض کیا:

پھر چاہتا ہوں ناموں کی فہرست دیکھنا
جاں نذر و عنواں کئے ہوئے

کلاس شروع ہوئی تو وہ سر فہرست لڑکی فہرست سے غائب تھی۔ میں نے لڑکیوں سے تشویش کا اظہار کیا تو وہ کھل کھلا کر میری معصومیت پر ہنس دیں: ''انہیں تو آپا جان نے رجسٹریشن کے لئے زبردستی بھیجا تھا۔ وہ کہتی ہیں وہاں ایک خطرناک آدمی ہے۔'' اس وقت ہمیں میر کا شعر یاد آیا لیکن دل ہی دل میں پڑھ کر رہ گئے:

دور بہت بھا گو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
رم کرنا ہی شیوہ ہے ان اچھی آنکھوں والوں کا

ہمیں اس واقعہ سے اپنے حال پر اور قوم کی حالت پر رحم آیا کہ وہ زندگی کے سنہری مواقع خوف اور خطرے محسوس کر کے گزارتی رہتی ہے۔

حسن اتفاق: دو گام چلوں منزل کی طرف خود سامنے منزل آجائے

دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یا عارفہ بی کو ہمارے دل کی کون سی دھڑکن پسند آگئی کہ عارفہ بی نے موسم سرما کے تعطیل کے اواخر میں باصرار بلند شہر طلب کیا۔ ساتھ ہی تائیدی خط عارفہ کے والد گرامی کا بھی آیا۔ میں یوں بھی چھٹیاں علی گڑھ میں گزار کر بور ہو رہا تھا فوراً بلند شہر روانہ ہو گیا حسن اتفاق دوسرے روز تسنیمہ اپنی چھوٹی بہن آسیہ کے ساتھ اچانک میرے حسن زن کے مطابق وارد ہو گئیں۔

آسیہ کی عمر ۷۔۸ سال تھی۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی سوتیلی ماں کا

طرزِ عمل سوتیل پن میں مثالی تھا۔عارفہ کی ہمہ صفات والدہ نے پیشکش کی تھی کہ آسیہ ان کے پاس رہ کر قرآن شریف ختم کرلے پھر اسے گرلس کالج کے اسکول میں داخل کرادیا جائے۔ تسنیمہ اپنے ساتھ بڑے کے گوشت کے کوفتے، قیمہ اور کباب اور مختلف طرح کے پراٹھے لائیں تھیں۔ہم سب نے فرشی نشست پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ایسا ذائقہ پھر کبھی زندگی میں میسر نہ آیا۔ پتہ نہیں یہ ذائقہ اس پکانے والے کے ہاتھ کا تھا یا عارفہ اوران کی فیملی کی محبت کا یا دسترخوان کی وسعت کا یا آسیہ کی شرارت کا یا کوئی اور وجہ تھی؟ وہ کھانا کھا کر ہم بلند شہر کے او پر کورٹ کی بلندیوں پر چوبیس گھنٹے خیالی پرواز کرتے رہے۔

ہمارے اوران صاحبہ کے درمیان میں پردہ تو نہ تھا لیکن پھر بھی بہت سے پردے تھے۔رات میں سب لوگوں نے سینما کا پروگرام بنایا۔ ہماری خوش قسمتی سے فلم بھی برسات کی رات لگی تھی۔اس کی قوالی ''یہ عشق ہے عشق عشق'' حسب حال ہوتے ہوئے بھی میرے ذاتی حالات کے مطابق نہ تھی۔سینما ہال کی سیٹوں پر بھی حسب تہذیب ہماری اوران کی سیٹ میں بعدالمشر قین تھا۔آسیہ میرے پاس بیٹھی تھی لیکن ابھی اس نے اس وادی میں قدم نہیں رکھا تھا کہ وہ علی گڑھ کے جملوں میں ربط پیدا کر کے مطلب نکال سکے۔ہم لوگ آہستہ خرامی سے فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے گھر واپس ہو گئے۔میں اتنا ہی کہہ سکا۔یہ گانا کتنا اچھا تھا:

زندگی بھر نہیں بھولے گی یہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

مجھ تک جو آواز پہونچی وہ اس طرح تھی ''یہ فلم والے جھوٹے قصے گھڑ کے فلم بنا دیتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''سچے قصے افسانہ نہیں بنتے ازدواجی زندگی بن جاتے ہیں۔'' ادھر سے خاموشی رہی لیکن میں اسے نیم رضا نہیں سمجھ سکا۔

دوسرے دن تسنیمہ بس سے علی گڑھ روانہ ہوگئیں۔منزل میری بھی وہی تھی۔دن اور وقت بھی مناسب تھا۔موسم بھی خوش گوار تھا لیکن ظالم سماج نے الگ الگ روانگی کے

اوقات کا تعین کیا۔ میں نے اشارتاً کہا جسے شرارتاً سمجھا گیا: ''تم لوگوں کو دو دفعہ چھوڑ نے کے لئے جانا پڑے گا اچھا ہے میں بھی نکل جاؤں۔'' عارفہ بی نے کہا: ''آپ کو کیا جلدی ہے؟ ابھی امی کو آپ سے بات کرنی ہے۔'' میں سمجھ گیا مگر دل بری طرح دھڑ کنے لگا۔ گھر میں ایسا سناٹا ہو گیا جیسا میر صاحب نے دیکھا تھا۔

محفل میں آج ایک ترے پر تو بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

میں انتظار کرتا رہا عارفہ کی امی کچھ بات کریں مگر وہاں خاموشی تھی۔ بس اتنا سنا لڑکی تو بہت اچھی ہے اور اس کے پیغامات بھی بہت آ رہے ہیں۔ اللہ قسمت اچھی کرے۔ پھر گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا یہ فتح پور کے پٹھان خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ والد گرامی بشیر الزماں خان مشہور وکیل ہیں، علیگیرین ہیں اور پروفیسر حبیب کے ہماری ہی طرح کے شاگرد ہیں۔ تسنیمہ اور ان کی بڑی بہن شمیمہ پہلی بیوی سے ہیں۔ انکے انتقال کے بعد دوسری شادی کی، آسیہ اور انکے چار بھائی دوسری بیوی سے ہیں ان کے انتقال کے بعد تیسرا نکاح کیا ان سے دو بچے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد چوتھا نکاح کیا ہے اس سے بھی بعد میں دو بچے ہوئے۔ لیکن والدہ کی بچوں سے نہیں بنتی۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ لیکن سکون نہیں۔

مجھے ان سب کی حالت پر رحم آیا۔ اوران حالات کو اپنے حسب حال پایا۔ میں اس سے کم درجے کے تجربے سے عمر بھر گذرا اور پھر علی گڑھ نے مجھے پناہ دے دی، میں نے یوں نہ جانے کتنے گھروں اور محبتوں کے تجربے کئے لیکن اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ بلند شہر کا یہ گھر بھی عارضی پناہ گاہ تھی لیکن بہت غنیمت تھی۔ دل میں ہمیشہ خواہش رہی کہ میرا اپنا گھر ہو، اس گھر کی مرکزی شخصیت میں ہوں، میری مرضی سے گھر کا نظام چلے، میرے ذوق کے مطابق کھانے پکیں، میرے انتظار میں کوئی آنکھ وار ہے۔ یہ سوچ بھی حالات کے لحاظ سے ع: ''این خیالست ومحالست وجنوں'' کے

مترادف تھی۔ یہ بات کہ ان محترمہ کے اچھے پیغام آرہے ہیں قرین قیاس نہیں یقینی تھی۔

دیر اس لئے تھی کہ ان کی پاکستانی بڑی بہن اور بہنوئی ان کے لئے کوئی پاکستان کا پٹھان ہٹا کٹا ملٹری آفیسر ڈھونڈ رہے تھے بلکہ خاندان ہی میں ڈھونڈ لیا تھا۔لیکن ان کے والد پہلی لڑکی کو پاکستان رخصت کر کے پشیمان تھے۔ وہ بچوں میں سے کسی کو بھی پاکستان بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھ سو پونڈ وزن کی مشت خاک کو جس پر تا مبرم ینی ٹوریم کا ٹھپّہ لگ چکا تھا اور جس کے پاس بلند شہر تک آنے کے لئے ایک روپیہ کرایہ نہیں ہوتا تھا کیا سوت کی پوٹلی لے کر یوسف کی خریداری کا حوصلہ کرنے کی ہمت تھی۔ پھر یہ بھی سنا یہ پٹھان لوگ بڑے خوددار خود پسند اور بد دماغ ہوتے ہیں، باہر شادی نہیں کرتے حالانکہ ہمارے محترم مجاہد آزادی دادا مولانا منصور انصاری نے باجوڑ میں دوسری شادی کی تھی لیکن شاید ان کے خاندان میں نقص تھا، وہ خالص پٹھان نہ تھیں سادات میں سے تھیں۔

یوں تو کہنے کو تو ہم کہہ گئے: بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھایئے۔!

لیکن حسن تصور نے کچھ رباعیات لکھوا دیں:

آنکھوں سے پلائی تھی کسی نے وہ شراب
اترا نہیں پھر نشۂ بد مست شباب
پھر دل سے کبھی یاد خزاں گذری نہیں
دیکھے تھے شگفتہ کسی عارض کے گلاب

یوں خواب میں گم جیسے ہو کوئی تصویر
چہرے پہ تبسم کی وہ ہلکی سے لکیر
پیشانی پہ تابندگی صبح کا نور
اس خواب کی معلوم ہے ہم کو تعبیر

آئیڈیل کی تلاش:

تسنیمہ کے جانے کے بعد ایک عجیب خلاء زندگی میں محسوس ہوا۔ اس خلاء میں معصوم آسیہ کا دم غنیمت لگا جو میری طرح گھر کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر تھی۔ چند گھنٹے بعد میری بھی اسی راستے سے علی گڑھ واپسی ہوئی۔ بار بار خیال آتا رہا کہ شاید راستہ میں وہ بس رک گئی ہو لیکن ایسا اکثر فلموں میں ہوتا ہے۔ شاید زندگی میں بھی ایسا ہو جائے۔ لیکن:

گذر گئی تھی وہ کوسوں دیار حرماں سے

ایم اے فائنل کے اواخر میں ممتاز آپا سے ایک بار گفتگو ہوئی۔ انہوں نے ایک لڑکی کا نام پیش کیا جو مجھے پسند تھی لیکن بہت زیادہ آزاد خیال تھی۔ اس سے شادی سے ان کی رائے میں میرے تمام ذاتی، خانگی اور مالی وسائل میسر ہو جاتے، لیکن میں نے ممتاز آپا سے کہا: ''میں مولوی خاندان سے ہوں۔ مجھے پابند صوم صلاۃ لڑکی چاہیے۔ پھر وہ جب دیوبند اور انبیہٹہ جائے تو برقعہ اوڑھنے پر اسے اعتراض نہ ہو۔''

ممتاز آپا نے کچھ سوچ سمجھ کر کہا: ''تسنیمہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا: ''خیال تو اچھا ہے۔ ان کے پیغامات ہوں گے اور میرے پاس ملازمت تو کیا تعلیم بھی مکمل نہیں اور وسائل بھی نہیں۔'' میں نے محسوس کیا ممتاز آپا کو بھی اپنی شاگرد کی شادی کی خاص جلدی نہ تھی۔ اور مجھ میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی کہ ان کے والدین میری غیر یقینی حالات کی بہتری کا اور ملازمت کا انتظار کرتے۔

تسنیمہ سے شادی خیالی دنیا کی نہ ہونے والی خوش فکری تھی۔ وہ غیور پٹھان کی شہزادی، میں بے گھر بے در بے سر و سامان انصاری مگر قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ الحمد اللہ بڑے صبر آزما مراحل کے بعد ۱۷ر مئی ۱۹۶۳ء کو ہماری شادی خانہ آبادی ہوگئی اور اس تعلق اور محبت نے پانچ خوبصورت اور خوب سیرت اولادوں سے نوازا ہے اور اقرأ انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو، اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن بمبئی،

اقرأ سوسائٹی انبھٹہ اور درجنوں اسلامی تعلیمی اداروں کے قیام اور سرپرستی کی سعادت بخشی۔ الحمد اللہ والشکر۔

عطا ہوا اس میں لطفِ خیر و برکت

جو مانگا تھا وہ پورا مل گیا ہے

الوداع علی گڑھ:

علی گڑھ کو خدا حافظ کہنا بہت مشکل تھا لیکن میرے سامنے جو مقاصد تھے ان کے پیش نظر علیگڑھ میں رکنا مقاصد کو قربان کر دینے کے مترادف تھا۔ علی گڑھ کی پولارٹی (Polarity) کمیونسٹ اینٹی کمیونسٹ یا اسلامک اور سیکیولر ایسی تقسیم تھی جس میں کوئی اتصال کا پہلو نہیں تھا۔ میری آواز اور عمل سے کچھ تحرک تو پیدا ہوا لیکن جس تبدیلی کا میں خواہاں تھا وہ علی گڑھ میں پیدا نہ ہو سکی اور میں نے محسوس کیا یہاں پیدا ابھی نہیں ہو سکتی۔

میں علی گڑھ سے روانہ ضرور ہو رہا تھا لیکن علی گڑھ کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو رہا تھا۔ یوں تو میری شخصیت کی تعمیر میں درجنوں ادارے اور شخصیات شامل تھے لیکن جس طرح علی گڑھ نے میری تربیت اور پذیرائی کی اس نے نئی فکر اور مستقبل کی راہوں کو ہموار کر دیا۔ علی گڑھ کے احسانات ہندوستان کے مسلمانوں پر جس قدر ہیں اسی قدر برصغیر کے مسلمانوں کی محبت نے اسے نوازا ہے۔ ادارے اینٹ اور پتھر سے نہیں بنتے وہ خون جگر، جنون عمل اور فکر بلند سے تعمیر ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کے اینٹ اور پتھر تک زبان علم سے بولتے ہیں، قلب مطمئنہ سے محسوس کرتے ہیں، گوشِ نصیحت نیوش سے سنتے ہیں اور اپنے قد و قامت اور مناروں اور گل بہاروں سے عظمت موعظت، عزیمت اور فراست کا درس دیتے ہیں۔ ہم نے ان پتھروں کی زبان کو گوش نصیحت نیوش سے سنا اور اس کے بلند مناروں کے اشاروں کو سمجھا ہے۔ ان بے زبان عجائبات کے علاوہ وہاں کے اساتذہ، طلبا، کارکنان، وائس چانسلر سے چپراسی اور مہتر تک جس ماحول کی تعمیر کرتے ہیں وہ مثبت اور تعمیری نظر آتا ہے۔ لیکن وہاں کی

فکر اس وقت بھی مستقبل سے زیادہ ماضی کا حصہ ہے۔

ان سب کے باوجود وہاں کے مناظر کے چراغ اب بھی یادوں کے دریچوں میں روشن ہیں۔وہاں کی آوازیں آج فردوس گوش ہیں، وہاں کے کردار ذہن کے پردوں پر ہر لمحہ متحرک ہیں وہاں کی صورتیں آنکھوں میں ہردم جھلملاتی رہتی ہیں۔اختر انصاری نے فرمایا تھا:

یاد ماضی عذاب ہے یارب　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں نے عرض کیا ہے:

یاد ماضی جو خواب ہے میرا
اس کی تعبیر معتبر کر دے

اپنے ان دو اشعار پر اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں:

پھول سی یادوں کا مرہم بھی سفر میں رکھنا
جانے کس دشت میں یہ آبلہ پا ہو جائے

حسن تعبیر سے ہے رونق ہستی غازیؔ
کوئی آنکھوں سے خوابوں کو چرا لے جائے

علیگڑھ واپسی اور علیگڑھ سے واپسی

گو واں نہیں ہیں واں سے نکالے ہوے تو ہیں

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

مسلم یونیورسٹی سے میری غیر معمولی محبت اور عقیدت کے باوجود میرا علیگڑھ چھوڑتے ہوے یہ فیصلہ تھا کہ میں علیگڑھ کسی بھی عہدے پر واپس نہیں جاؤنگا۔ میں وہاں کی سیاست، کمیونسٹ اور اینٹی کمیونسٹ کے تصادم سے تنگ آ چکا تھا۔ میرا ان دونوں گروہوں سے باضابطہ تعلق نہیں تھا لیکن ان دونوں میں جو خوبیاں تھیں میں ان کو سراہتا تھا۔ میرا موقف وہی تھا جو مولانا آزاد، مولانا مدنی اور خود میرے والد صاحب کا تھا جس کی بنیاد اسلام کی اعلیٰ قدروں کے ساتھ تمام اہل وطن کے ساتھ اتحاد و اتفاق کے رشتے قائم کرنا اور ملک کی سالمیت پر اعتماد کر کے اس میں بسنے والے تمام انسانوں کی خدمت کرنا تھا۔ میرے دلّی کے تین سال (۶۳-۱۹۵۹ء) ابتدائی تھے اس کے بعد میں مختصر مدت کے لئے لندن گیا تھا (۶۷-۱۹۶۳ء) جہاں میں سر کے درد (شقیقہ) کی مجبوری کی وجہ سے پی ایچ ڈی مکمل نہ کر سکا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے ایم ایس سی پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد

ہندوستان گھر واپسی کا پلان بنا رہا تھا کہ ہارورڈ سے پروفیسر وِلفرِیڈ کینٹول اسمتھ ڈائریکٹر سینٹر آف اسٹڈیز آف ورلڈ ریلیجنس کا دعوت نامہ ملا (جون ۱۹۶۷) کہ میں ایک سال اس ادارے میں رہ کر انٹرفیتھ ڈائیلاگ کا حصہ بنوں۔ میرے لئے یہ دعوت نامہ ہرچند کہ خوشی کا باعث تھا لیکن ایک مذہبی ادارے میں ایک سال گزارنے کا تصور مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ حالانکہ ہارورڈ تو ہارورڈ ہی ہے۔ لیکن میری ذمہ داری اب دلی کالج واپسی کی اس سے زیادہ اہم تھی۔ اسی وقت پروفیسر اسمتھ کا شاید لندن آنے کا پروگرام بنا، انہوں نے اپنے خط

میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔انہوں نے اس ملاقات میں جو باتیں کیں وہ میری فکر اور مقاصد سے بہت قریب تھیں۔

انہوں نے ہارورڈ کے ان تعلیمی مقاصد سے روشناس کرایا جن کے لئے سینٹر فار دی اسٹڈی آف ریلیجنس تین پروٹسٹنٹ خواتین کی کوشش سے (۲۱ نومبر ۱۹۶۰) میں قائم ہوا تھا۔ان خواتین کے نام اب بھی لوگ نہیں جانتے۔ہارورڈ یونیورسٹی کے ہارورڈ ڈیوینیٹی اسکول کا مقصد بین المذاہب افہام وتفہیم تھا۔یہ ایک بہت بڑا انقلابی فکر یہ تھا کہ تاریخ انسانی کی مذہبی جنگوں اور خونریزیوں کے بعد وقت آ گیا ہے کہ ان مذاہب کے زعماء مل کر بیٹھیں ایک دوسرے کو سمجھیں اور سمجھائیں اور پرانی بحثوں اور رنجشوں کو بھول کر نئے مستقبل کی تعمیر کریں۔ یہ مقصد میری اپنی خاندانی اور علمائے دین کی فکر سے عین مطابقت رکھتا تھا۔میں نے ڈاکٹر ذاکرحسین خان،مرزا محمود بیگ اور ابا جان سے مشورے کے بعد یہ دعوت قبول کرلی۔تسنیمہ اور بچوں کو ہندوستان اپنے پیش دستوں کے طور ساتھ بھیج دیا اور خود ایک سال کے لئے ہارورڈ یونیوسٹی چلا گیا۔وہاں جا کر جو میں نے دیکھا اور سمجھا وہ میرے قیاس سے باہر تھا۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ میری علوم سیاسیات کی تعلیم ایک طرف یہ ڈائلاگ دنیا کے مستقبل کا واحد راستہ ہے۔یہ سینٹر رہائشی مرکز تھا جس میں سب مذاہب کے اسکالر آ کر قیام کرتے تھے اور سال دو سال ایک دوسرے کے مذاہب کا مطالعہ کرتے تھے۔اگلے سال مجھے انہوں نے پی ایچ ڈی اسکالرشپ آفر کردیا اور ساتھ ہی تسنیمہ اور بچوں کو ہندوستان جا کر لانے کے وسائل فراہم کردیئے۔

اس پروگرام نے خدمت کی ایک نئی جہت عطا کردی۔تسنیمہ نے بھی اپنے تعلیمی سلسلے کو ہارورڈ میں شروع کردیا اور پی ایچ ڈی تعلیمات میں شہرہ آفاق ادارے منی سوٹا یونیورسٹی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

امریکہ کے اس طویل قیام نے ہندوستان واپس آ کر خدمت کی راہ کو عملاً مسدود

کردیا۔ میں نے واپس آنے کی کوشش بھی کی لیکن وہاں کے مکھی مچھر اور ملازمت تنخواہ ہر چیز آڑے آئی اور بچوں کا وہاں رہنا تقریباً ناممکن محسوس ہوا۔ میں امریکہ واپس آکر یہاں کا شہری بن گیا، تسنیمہ پہلے ہی بن چکی تھیں۔امریکن شہریت نے ہندوستان کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افریقہ، آسٹریلیا میں خدمت کے دروازوں کو کھول دیا۔اوورسیز سٹیزنس آف انڈیا (او۔آئی۔سی) کے قانون نے لاکھوں ہندوستانیوں پر دنیا کے مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے ملک کی خدمت اور بہبود میں شرکت کے دروازے کھول دئے ہیں اور میں اور میری فیملی بھی امریکہ میں رہتے ہوئے بھی ہندوستان کا حصہ ہیں اوراس کے مستقبل کی جدوجہد میں شریک ہیں۔

امریکہ کی فلاح و بہبود کی ہندوستان اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی تحریکوں میں شرکت رہی اور ہندوستان میں جو تعمیری کام ہورہے ہیں ان سے وابستہ رہا۔ ہندوستان مین علیگڑھ کے لئے ہمیشہ دل دھڑکتا رہا اور وہاں کی انجمنوں میں میری شرکت بھی رہی اور امریکہ میں علیگڑھ فیڈریشن کا پانچ سال صدر بھی رہا۔

مسلم یونیورسٹی سے میرا رشتہ والدین اور اولاد کا ہے۔اور یہ وہ رشتہ ہے جو عمر بڑھنے کے ساتھ پختہ تر ہوتا جاتا ہے۔پھر یہ ہوا کہ علیگڑھ سے میرا ایک اور رشتہ قائم ہوگیا۔ میری بہن شہناز اور ان کے شوہر شمس کنول نے وہاں (۱۹۹۰) گھر بنا لیا اور بس گئے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد (۱۹۹۲) پہلے والدہ (ہاجرہ نازلی) میرے پاس شکاگو میں رہیں پھر وہ بھی علیگڑھ بیٹی شہناز کے پاس پہنچ گئیں۔میرے چھوٹے بھائی ارشد غازی الفلاح سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں علیگڑھ بھجوادیا اور کوشش کی کہ وہ کسی تعلیمی کام میں لگے رہیں لیکن وہ چشمہ آب پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی رہے۔شہناز، ارشد اور امی کی موجودگی نے وہاں بھی گھر کا ماحول پیدا کردیا اور میری کوشش ہوئی کہ علیگڑھ کے لئے کوئی ایسا کام کروں جو پائدار ہو۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ ہارورڈ میں سیکھا ہے اس کو علیگڑھ کے

پلیٹ فارم سے ہندوستانی مسلمانوں اور عوام کو فکری انداز سے پیش کروں۔ اسکے لئے میں نے وہاں اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز (اساس) کی بنیاد ڈالی۔ اس کا دفتر پہلے نواب رحمت اللہ خان شیروانی کی اعانت سے مزمل منزل میں قائم کیا اور پھر پروفیسر اقبال انصاری صاحب کی دعوت پر ان کے گھر میں منتقل ہوا۔

اس کے نقشے میں مستقل اور پائیدار رنگ بھرنے کے لئے میں نے علی نگر میں چار ہزار گز کا ایک پلاٹ راہی صاحب اور طارق صاحب سے خریدا۔ اس پلاٹ پر ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے مستقبل کے تعین اور تیقن کے لئے اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کا مرکز قائم ہونا تھا۔ نسیم صاحب وائس چانسلر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کام کو سراہا اور مجھے ان چند بلڈنگوں کی نشاندہی کی جس میں اساس کا دفتر قائم کر سکتا تھا۔ میں نے رضا بلڈنگ کا انتخاب کیا جو ہمارے زمانے میں پیراڈئز بلڈنگ کہلاتی تھی وہ بلڈنگ نسیم صاحب نے اساس کے کام کے لئے پیش کر دی۔ اوپر کا حصہ ہمیں ملا وہ خستہ جان تھا۔ نیچے کا حصہ صحیح حالت میں تھا وہ ہمیں پتہ نہیں کیوں نہ مل سکا۔ اس بلڈنگ کی لیز بھی صرف ایک سال کی تھی۔ ہم نے اوپر کے حصے کو کم وبیش ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے اعلیٰ معیار پر وہاں وہ سہولتیں قائم کیں جو اس تحقیقی ادارے کو مداومت دے سکیں اور مقاصد کو پورا کر سکیں۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب یہ ادارہ قائم ہو جائیگا تو اس کو یونیورسٹی کے حوالے کر دیں گے۔

اساس کو رجسٹر کرا کے بورڈ آف ڈائریکٹرس میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایکس آفیشیو بنایا گیا۔ وائس چیرمین کے لئے اپنے استاد بزرگ بزرگ مربی مسعود الحسن کی خدمات حاصل کیں۔ سیکریٹری کے لئے ڈاکٹر نفیس احمد صاحب (پراکٹر) کا انتخاب کیا۔

اس بورڈ پر تین ایکس وائس چانسلر تھے اور چار علیگڑھ فیکلٹی کے سینئر ممبر تھے۔ اس کا فرنیچر سہارنپور سے ارشد کی سسرال کے ذریعہ سے خصوصی ڈیزائن ہو کر آیا۔ اس کے ساتھ ہی

اس میں ایک آئی ٹی کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس میں پچیس کمپیوٹر اپنے پاس سے مہیا کیے تا کہ آئی ٹی کی ٹریننگ کا سلسلہ فوری طور پر جاری ہو۔ بہت بعد میں اس کی ایک دوکان بھی ملی۔ اس کو بھی جدید اسلوب پر بنایا اور سنوارا گیا اور کام شروع ہوا اور ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کم و بیش ایک درجن ایسے تحقیقاتی کام شروع ہوئے جو یونیورسٹی کے کسی شعبے میں نہیں ہو رہے تھے۔

بنیادی مقصد اس ادارے کا جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص تعمیر و ترقی و تعاون کی نئی جہتیں تلاش کرنا تھا جس سے وہ ہندوستان میں با مقصد اور معزز مقام اپنے لئے باہمی افہام و تفہیم سے بنا سکیں۔ اس مقصد کے لئے انٹر فیتھ ڈائیلاگ کا سلسلہ بھی اسی اساس میں شروع ہوا۔

اس سلسلے میں فکری اور عملی طور پر نورالحسن نقوی کی اعانت غیر معمولی تھی۔ انہوں نے ہماری فرمائش پر این سی آر ٹی کے نصاب کے مطابق اردو اسکولوں اور مدارس کے لئے تین پروگرام بنائے۔ ایک اردو تعلیم کا دوسرا سماجی علوم کا اور تیسرا سائنس کا۔ ان سب کتابوں میں یہ پروگرام ہندوستان کے اعلیٰ تحقیقاتی اشاعتی معیار پر پیش کئے گئے۔

اس کے آفس سیکریٹری میرے چھوٹے بھائی ارشد غازی تھے اور شہناز ریسرچ فیلو تھیں۔ دوسرے پروجیکٹ ان مسلم رہنماؤں اور ماہرین تعلیم اور منفرد شخصیات کے بارے میں تھے جنہوں نے ہندوستان کو آزادی سے پہلے اور بعد میں اپنے اپنے میدانوں میں خدمت سے نوازا تھا۔ اس میں ایک سوشل اسٹڈیز پر اسکیم قائم کی جس کا مقصد تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جات سوشل اسٹڈیز، شعبہ پولیٹکل سائنس، اکنامکس، سوشیالوجی سے ریسرچ اسکالرس حاصل کر کے ان تمام چیزوں پر تحقیق کرائی جائے جس میں مسلمان اس ملک میں آگے آگے تھے۔ علیگڑھ کی تالا انڈسٹری، میرٹھ کی قینچی، مراداباد کے برتن، فیروز آباد کا کانچ کا سامان اور راجستھان کا اسٹون اور ماربل وغیرہ جس میں مسلمان ملک کی خدمت کر

رہے ہیں بلکہ اہم بات یہ تھی کہ اس کام کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے اور حکومت کی جانب سے ملنے والی سہولتوں کے لئے سفارش بھی کی جاسکے۔

اسی میں ایک کام علماء کی جنگ آزادی میں خدمات پر بھی تھا۔ اساس کا ایک بہت کامیاب کارنامہ ہمارے امریکن ادارے اقرأ انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے سنگاپور کے تعلیمی پروجیکٹ میں نصاب تیار کرانا تھا۔ اقرأ انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو کو سنگاپور حکومت کی جانب سے وہاں کے مدارس کے لئے انگریزی زبان میں مکمل نظام تعلیم (گریڈ وَن سے دس تک) تیار کرانا تھا۔ اس پروگرام کا پہلا حصہ پرائمری لیول ڈاکٹر تسنیمہ غازی کی زیر نگرانی شکاگو میں انجام پا رہا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ ثانوی پروگرام کے لئے میں نے اساس کے ذریعے ڈاکٹر اشہد ندوی کی سرپرستی میں شروع کرایا۔ اس پروگرام میں قرآن، سیرت، حدیث اور فقہ اور اسلامی اخلاق پر پورا نصاب مرتب ہوا۔ اس میں کم وبیش ایک درجن علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ مدارس اسلامیہ کے علما نے شرکت کی۔ ان لوگوں کو معقول معاوضے دیئے گئے اور انہوں نے اردو زبان میں اس کام کو سنگاپور کے اعلیٰ ترین معیار پر تیار کیا گیا۔ اس نصاب میں درسی کتب، تمرین کتب اور اساتذہ کے لئے ہدایتی مینوئل شامل تھے۔

میں خود لمبے وقفوں کے لئے علیگڑھ جاتا رہا اور اس کے تراجم بھی ڈاکٹر اے آر قدوائی کی رہنمائی میں شعبہ انگریزی کے طالب علموں کے ذریعے انہیں اسکالرشپ دے کر کرائے۔ اس کام کے لئے ڈاکٹر شریف صاحب، عتیق صاحب کی رہنمائی بھی حاصل رہی۔ ان دونوں کی زندگی نے وفا نہ کی نگران کی ہدایات کے مطابق علما اور ماہرین کی ٹیمیں کام کرتی رہیں۔

یہ دنیا کا واحد تعلیمی پروگرام ہے جو سنگاپور کے مدارس کے لئے تیار کیا گیا تھا لیکن اس کے حقوق طباعت وہاں کی مجلس اسلامی کی طرف سے اقرأ کو حاصل ہیں اس سلسلے میں بڑی جدوجہد اور کدوکاوش ارشد غازی نے کی۔

غرض اساس مستقبل کا ایک ایسا پروگرام تھا جسکا مقصد سرسید کی فکر اور تحریک کو جدید حالات کی روشنی میں زیندہ کیا جا سکے۔ میں میں چاہتا تھا کہ فکری طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر بدلے۔ انہیں مثبت طور پر سوچنے کا حوصلہ ہو اور ہندوستان کے تمام مذاہب اور طبقات میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

ان ساری کامیابیوں کے باوجود میری سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ میرا قیام علیگڑھ میں نہیں رہ سکتا تھا۔ جن لوگوں کی قیادت پر مجھے بھروسہ تھا ان لوگوں نے خاص دلچسپی نہیں لی۔ بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ یونیورسیٹی کے ارباب حل وعقد نے پوری کر دی اور جو عمارت یونیورسٹی نے ادارے کو دی تھی اس کو ناجائز قبضہ بتا کر واپس لے لی، فرنیچر کمپیوٹرس اور کتابیں سڑک پر پھینک دیں جن میں قرآن اور حدیث کی بے شمار کتب تھیں۔

میرے لئے یہ صدمہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں باپ اپنے بے قصور بیٹے کو عاق کر دیں اور اس کا سارا سرمایہ اور عزت چھین لیں۔ مجھے اس بات کا بھی سخت افسوس ہے کہ یونیورسٹی کے وہ لوگ جو ہمارے ساتھ تعاون کر رہے تھے اور جو نہیں کر رہے تھے انہوں نے یا یونیورسٹی کے کسی ذمہ دار نے کبھی مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا جبکہ میں نے سابق وی سی نسیم صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ جب آپ کو بلڈنگ کی ضرورت ہوگی میں اسے سارے ساز و سامان کے ساتھ یونیورسٹی کو پیش کر دونگا لیکن عبدالعزیز صاحب علم کی دنیا اور علیگڑھ کی علمی روایات سے ناواقف تھے اور ایک سینیر علیگیرین کے جذبات کو جو اسے مادر علمی سے تھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ انہوں نے اور دوسرے غاصبوں نے مجھ پر نہیں ان نسلوں پر ظلم کیا جن کے مستقبل کے لئے میں نے یہ کام شروع کیا تھا۔

ہر چند کہ یہ سارے تعمیری پروگرام کو ان صدمات نے اس لائن سے اتار دیا تھا جس پر میں علیگڑھ اور ہندوستانی مسلمان کو لیجانا چاہتا تھا لیکن کچھ چیزیں جو چند احباب نے

بچالی تھیں ان کو لے کر ڈاکٹر نفیس احمد صاحب کے نور العلوم سوسائیٹی کے آفس میں کام شروع کرا دیا اور ان کی کرم فرمائی سے آٹھ سال سے وہاں جاری رہا۔

تو یہ ہے میری علیگڑھ واپسی کا حال اور میرا استقبال۔ میں اس وقت بہت کمزور صحت کی حالت میں ہوں اب میرا ہندوستان آنا بھی کم وبیش ناممکن ہے۔ جو میں کرنا چاہتا تھا وہ نہیں کر سکا، بس جو تھوڑا بہت کام بچ رہا وہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائے۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔

میرا ایک کام بمبئی میں اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا قیام تھا جو ۱۹۹۹ء میں ہوا جو میرے چھوٹے بھائی سلمان غازی اور ان کی بیگم عظمیٰ ناہید نے کیا۔ اس کا مقصد امریکہ میں تیار شدہ اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تعلیمی پروگرام کو وہاں سے شایع کر کے ہندوستان میں جاری کرانا تھا۔ بمبئی کا اقرا فاؤنڈیشن، علیگڑھ کا اساس کا کام اور امبہٹہ میں اقرا کا آفس یہ چند چیزیں ہیں جو ہندوستان کو اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے میرا ورثہ ہیں۔ اگر یہ قائم رہ جائیں تو میں اپنے کو خوش نصیب سمجھوں گا ورنہ تو

چناں نہ ماند چنیں ہم نہ خواہد ماند

(ویسا قائم نہ رہ سکا ایسا بھی قائم نہیں رہے گا)

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

......

میرا علی گڑھ کا دور

(۱۹۵۱۔۱۹۵۹)

میرا علی گڑھ کا طالب علمی کا دور آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ اول پانچ سالوں میں میں نے بی۔اے۔ فرسٹ کلاس پاس کیا یونین کا سیکریٹری منتخب ہوا اور صدارت کا الیکشن ہارا۔ چھٹا سال میں نے تامبرم سینیٹوریم امدراس میں گزارا۔ اس سال اگرچہ میں علی گڑھ سے دور رہا لیکن میں اس سال کو بھی علی گڑھ کا ہی سال سمجھتا ہوں کیونکہ میں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے تامبرم سنی ٹوریم گیا تھا اور تامبرم سینی ٹوریم میں علی گڑھ کے احباب کی محبت اور تعلق کے سہارے ہی وقت گذرا اور پھر وہاں سے علی گڑھ نے بہت محبت اور کج ادائی سے میرے ارادوں کے برخلاف مجھے واپس بلا لیا۔

دوسرا علی گڑھ کا دور جولائی ۱۹۵۷ سے شروع ہو کر مئی ۱۹۵۹ پر ختم ہوتا ہے۔ جس میں میں نے سید آصف علی کا الیکشن لڑایا اور خود دوسرے سال میں بلا مقابلہ اسٹوڈنٹ یونین کی صدارت اور نیشنل کانفرنس آف یونیورسٹی اسٹوڈنٹس آف انڈیا کی چیرمین شپ کے لیے منتخب ہوا۔ علی گڑھ پہنچنا میرے لئے ان خوابوں کی تکمیل تھی جس کو میری بے مائیگی نے دیکھنے کی کبھی جرأت بھی نہیں کی تھی۔

میں زندگی کے اس قدر تلخ اور کھٹ میٹھے تجربات لے کر یہاں پہونچا تھا جو شاید ہی کسی کا مقدر رہا ہو۔ میں نے پیدائش سے لے کر ہائی اسکول ختم کرنے تک تقریباً آٹھ گھروں میں پناہ لی اور سات تعلیمی اداروں سے اکتساب علم کیا۔ میرے خاندانی پس منظر میں علماء دین صوفیاء چشت اور نیشنلسٹ مسلمان، مسلم لیگ کے علم بردار، شعرائے کرام، ادیب و صحافی، جنگ آزادی کے مجاہدین سبھی شامل تھے۔ میرے تجربات نے مجھے ایک خاص نقطہ نظر سے نوازا تھا، جو علی گڑھ کے ماحول میں کم و بیش معدوم تھا۔ میں سچا پکا مسلمان تھا۔ اب بھی ہوں مگر میں کبھی عقائد کی بحثوں میں نہیں پڑا۔ میں نے کبھی عقیدۂ اہل سنت والجماعت کو

تشکیک کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن دوسروں کے عقائد کی تردید و تضحیک بھی کبھی نہیں کی۔

میں علماء دیوبند کی فکر سے قریب تر ہوں لیکن میری تربیت میں میرے نانا شاہ سید پیر جی محمد میاںؒ کا گہرا اثر ہے جو دراصل خود درگاہ شاہ حافظ علیؒ رادھن پور گجرات کے سجادہ نشین تھے۔اولادِ نرینہ کے پاکستان جانے کے بعد انہوں نے بعمر ۱۱-۱۲ سال میرے سر پر سجادگی کی دستار حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے عرس کے موقعہ پر درویشوں اور سجادگان کی موجودگی میں باندھ دی تھی لیکن مجھے رادھن پور درگاہ شاہ حافظ علیؒ کی زیارت کا شرف بھی نہ حاصل ہو سکا اور مجھے سجادگی سے فکری نسبت بھی نہیں۔شاہ عبدالقدوس کے سجادے شاہ امتیاز جہاں نانا جان کے برادرِ نسبتی تھے۔نانے ابا نے اس دستار سے زیادہ اہم تحفہ نماز کی پابندی اور اوراد و وظائف کا ورد کی شکل میں بہت بچپن سے ہمارے دودھ میں شامل کر کے پلا دئے تھے۔جو عمر بھر سے رفیق سفر ہے۔اور خدا کرے اسی پر خاتمہ ہو۔

عابداللہ غازی کا تعارف

اگر واضح الفاظ میں علی گڑھ والے عابداللہ کی شخصیت کا مختصر تعارف کراؤں تو:

''وہ ایک طرف پختہ ایمان والا دیو بندی مسلمان تھا دوسری طرف مشائخ چشت کا پیرزادہ تھا سیاست میں وہ کانگری نیشنلسٹ تھا۔ مسلمان فرقہ بندیوں سے دور ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا۔ وہ ماضی کے غم سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنے والا انسان تھا۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتا تھا اور پاکستان جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ اینٹی پاکستان نہ تھا اور جو تاریخی فیصلہ ۱۵-۱۴ر اگست کو عمل میں آ گیا تھا وہ اسے تسلیم کرتا تھا اور چاہتا تھا اور چاہتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی قیادت بھی اسے قبول کر لے۔

مخصوص حالات اور بزرگوں کے ارشادات واحکامات نے ۱۹۸۳ء میں اسے امریکہ کا شہری بنادیا۔ اس کی شہریت اسلام کے تعلیمی مقاصد کے لیے تھی اس کے سینے میں ہندوستان کا دل دھڑکتا تھا لیکن اس کے دماغ میں امریکن ہلچل تھی۔ اس نے بہت تقریریں کیں بہت کچھ تحریر کیا لیکن جو اس کے ذہن میں طوفان تھا اور قلب میں جو سونامی تھی اس کو نہ زبان سے ادا کر سکا نہ قلم سے اس کا اظہار کر سکا۔ وہ جو کچھ تھا وہ اسی کا داعی علی گڑھ میں رہا۔ اور اس فکر کا سلسلہ دیو بند سے شکاگو تک ہمیشہ جاری رہا۔

وہ کمیونسٹ نہیں تھا نہ ہی کمیونسٹ فلسفہ سے متاثر تھا لیکن نیشنل ایشوز پر اس کی فکر نے کمیونسٹوں سے قریب تر کر دیا اور اسلام کے ان داعیوں سے دور کر دیا جو ہندوستان کو نظام باطل سمجھتے تھے یا جن کی منزل پاکستان تھی۔ یا پھر امریکہ اور یورپ آ کر وہاں اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ میرے زمانے کے چار یونین کے صدر شاہ حسن عطا راحمد سعید، (انڈا) مبشر محمد خان اور ضیاء الحسن ہاشمی صاحب پاکستان چلے گئے۔ شاہ حسن عطا، احمد سعید (انڈا) اور مبشر محمد خان کافی سیاسی ہنگامے کرانے کے بعد ہندوستان سے روانہ ہوئے۔ پاکستان میں کوئی مقام نہ پا سکے۔ ہاشمی صاحب ہندوستان میں صالح قیادت پیدا کر سکتے

تھے مگر وہ خاموشی سے پاکستان چلے گئے۔وہ پاکستان میں اور پھر امریکہ میں تدریس سے وابستہ رہے اور خاموش زندگی گزار دی

غازی اردو ہندی معاملے میں بھی اردو کا زبردست حامی تھا لیکن ہندی کے قومی مقام کو تسلیم کرتا تھا۔۱۹۴۶ء میں ہی اس نے اپنے ذوق سے فوراً ہندی سیکھ لی تھی۔وہ سمجھتا تھا کہ ہندی کی لکھائی بہت آسان اور سائنٹیفک ہے اور لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو ایک ہی زبان ہے۔علی گڑھ اور عام مسلمان اس وقت یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔پاکستان کا مطالبہ بھی مسلمان اردو اور اسلام کی حفاظت کے لئے کیا گیا تھا۔پاکستان کی تحریک نے ہندوستان میں ان تینوں کو خطرہ میں ڈالدیا اور پاکستان کے نصف مشرقی حصہ نے اپنی آئیڈیولوجی سے ۱۹۷۰میں بغاوت کردی اور اردو بھی اس کی زد میں آگئی۔پاکستان میں یہ تینوں چیزیں خطرات سے گزر رہی ہیں۔نسبتاً، بنگلہ دیش اور پاکستان سے زیادہ مسلمان، اسلام اور اردو یہ تینوں چیزیں ہندوستان میں محفوظ ہیں بشرطیکہ مسلمان ان قانونی آزادی اور مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور ہموطنوں کے ساتھ مل کر مشترکہ محاذ بنائیں۔

ہندو مسلم اتحاد کو اس نے صرف علی گڑھ کے لئے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے اور اس سے بھی زیادہ پورے جنوبی ایشیا کے لئے اہم سمجھا۔وہ اس وقت بھی اس کو اہم سمجھتا تھا اور اب اور بھی زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل عالم اسلام کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہندوؤں اور ہندوستان سے وابستہ ہیں۔وہ مسائل ان کے تعاون کے بغیر کسی پاکستان یا عالم اسلام سے حل نہ ہوں گے۔ان کے حصول کے لئے وہ مین اسٹریم کے قومی دھارے میں نہ صرف شرکت بلکہ اس مقصد کی قیادت کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

ہندوستان کا سیاسی نظام، ہندوستان کی خود اکثریت کا شعور، ایک ہزار سال کی مشترکہ تہذیب اور قوم دوست مسلمانوں کی قیادت مسلمانوں کے نہ صرف حقوق کو محفوظ کرتی ہے بلکہ انہیں مواقع فراہم کرتی ہے جس سے نہ صرف اپنی ملت کے لئے بلکہ پورے ملک اور

جنوبی ایشیا کے لئے وہ پیام رحمت بن سکتے ہیں۔

اس نے اسٹیج سے اور پرائیویٹ محفلوں میں اس شعور کو پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا مسلمان عالم اسلام کا دست نگر نہیں بلکہ وہ ہندوستان اور عالم اسلام کے تعلقات کا پل بن سکتا ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ آج کے ہندوستان میں بھی پرانی مسلم لیگ ذہنیت موجود ہے جو سوچتی رہتی ہے کہ: ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

پس چہ باید کرد:

شہر شکاگو کی حیدرآبادی کمیونٹی میں اسد اویسی صاحب کا استقبال محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کے القاب سے ہوتا ہے جوان جیسے سمجھدار تعلیم یافتہ شخص کو خود بھی شاید پسند نہ ہو۔محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد مسلمانوں کی اس تاریخ کا حصہ ہیں جس میں یہ دونوں نوجوان ملکوں کے فاتح بن گئے تھے لیکن ان کے وارثین ان ممالک کے لوگوں کے دل نہ جیت سکے اور ان وارثین نے جیتی ہوئی بازی کو اپنی بے عملی، بدعملی، کسلمندی اور غفلت سے گنوادیا۔اس دور میں ہندوستان میں اقلیتوں میں بسنے والے مسلمان محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کا رول تلوار کے زور سے نہیں علم نافع، عمل صالح اور تعاونو علی البر و التقویٰ (نیکی اور خیر کاموں میں تعاون) سے حاصل کر سکتے ہیں۔یہ پیغام ہمارے دور میں بھی کانوں کے لئے گراں تھا اور آج بھی شاید! مقبول نہیں ہے۔لیکن اس کے علاوہ کامیابی کے لئے دوسری راہ اب نہیں۔

کیا اس کے قول وفعل سے علی گڑھ کی زندگی میں تبدیلی پیدا ہوئی؟ اس کے خیال میں کچھ حرکت ضرور پیدا ہوئی تھی اس کا بلامقابلہ انتخاب (۱۹۵۹) خود اس بات کا ثبوت ہے لیکن اس فکر سے کچھ وقتی تموج تو پیدا ہوا کوئی دیرپا فکری انقلاب نہیں آیا۔اس فکری انقلاب کے لئے اس کا ہندوستان میں رہنا ضروری تھا۔اس نے علی گڑھ میں دو ادارے قائم کئے اکیڈمی آف

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز اور تہذیب جدید لیکن امریکہ رہتے ہوئے وہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ اپنی فکر کو آج کے علیگڑھ میں اور ہندوستان میں نہ پہونچا سکا۔

وہ علیگڑھ میں اپنی فکر کو عام نہ کر سکا لیکن:

اڑا لی بلبلوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے ہر داستاں میری

اس نے ان اداروں کی نشو ونما کے لئے علی گڑھ سے پھر رشتہ جوڑا تھا۔لیکن علی گڑھ کی فضا کو مسموم پایا۔علی گڑھ کے اسٹیج سے فیکلٹی کی زبانی مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن پر دشنام اور تنقید سنی۔ بہاری اور اعظم گڑھیوں میں کٹے بازی میں لوگوں کو مرتے دیکھا۔یونین کو کم کھلتے زیادہ زیادہ بند ہوتے دیکھا۔کوئی شخص میسر نہ آیا جو امید کی بات کرتا ہو۔کوئی گروپ نہ ملا جو مستقبل کی امید رکھتا ہو۔کمیونسٹ اور اسلامی گروپ اپنی جگہ ہیں سیکولر جمہوری ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کے مستقبل کی نشاندہی کرنے والا کوئی نہ ملا۔اس کا غم اپنی جگہ ہے ہر چند دل کو سمجھاتا ہے۔

اسے جس بات کی فکر ہے قوم کو اس کا غم نہیں ۔ وہ اکثر خود سے کہتا ہے کہ تم امریکہ باسی ہو کر ہندوستان کے مسائل حل کروانے والے کون ہو؟ حقیقت بھی یہی ہے بس!

تو کار زمیں کے؟ نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

تو نے زمین کے معاملات کب خوبی سے حل کر لئے کہ
اب آسمانی معاملات کی فکر کرنے کی سوچ رہا ہے۔

☆☆☆

امتحان

(غالب سے معذرت کے ساتھ)

مدت ہوئی کتاب کو مہماں کئے ہوئے
چائے سے اپنی بزم چراغاں کئے ہوئے

دِل پھر طواف کوئے شرافت (۱) کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں ڈیوز (۲) کی فہرست دیکھنا
جاں نذر، دلفریبی عنواں کئے ہوئے

برسر (۳) کو پھر ہوئی ہے خریدار کی طلب
نقدِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے پھر سے پیش ہال ٹکٹ (۴) کا معاملہ
سال ہو چکا ہے چاکِ گریباں کئے ہوئے

نکلے وہ رشکِ نازکہ مچھر کہیں جنھیں
چہرہ فروغِ خوں سے گلستاں کئے ہوئے

مانگے ہے سمینار (۵) میں اُس بُت کو آرزو
زُلفِ سیاہ بک پہ پریشاں کئے ہوئے

پیپر جہاں ہو کاش وہیں پر پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منت درباں کئے ہوئے

عابدؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ اِس وائیوا (۶) کے بعد
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

(۱) شرافت صاحب: آفتاب ہال کے اکاؤنٹس کلرک۔

(۲) سال کے آخر میں ڈیوز (Dues) بقایا فیس کی فہرست۔

(۳) برسر آفس (OfficeBursar)۔ جہاں قرض کی ادائگی ہوتی ہے۔

(۴) ہال ٹکٹ (TicketHall) امتحان ہال میں داخلہ کا اجازت نامہ جسے حاصل کرنے کے لئے انسانوں کے جنگل سے گزرنا ہوتا ہے۔ (۵) سمینار (Seminar) ایم۔اے۔ کے طلباء کا مطالعہ کے لئے شعبہ کی لائبریری۔

(۶) وائیوا (Viva) زبانی امتحان ایم۔اے۔ کے طلبا کے لئے۔

آخری شب

الوداع علی گڑھ

آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے
ہر طرح کے احساسات، دل کو آ کے ڈستے ہیں
منزلیں ہیں نامعلوم
اور راستے گم ہیں
بے یقین ہیں راہی
راہبر ہیں نامحرم
راہ میں اگر تھک جائیں
رک کے کون پوچھے گا؟
آبلوں سے پاؤں کے
کس کو ہوگی ہمدردی
موت بھی اگر آجائے
کون حالِ عابد پر
زار زار روئے گا؟

کل سحر خدا معلوم

کس مقام پر ہو گی

آج آخری شب ہے

صبح آ گے جانا ہے، صبح آ گے جانا ہے

اے نگارِ علم و فن !

اے بلادِ سر سید!

تیری زندگی کیا ہے؟

جیسے کوئی خوابِ شوق

مہ رخوں کے آنچل کی چھاؤں کی طرح دلکش

عارض نگاراں کی صبح کی طرح روشن

گاہ سادہ و پُر کار

گاہ بے خود و ہشیار

چشم سرمہ سا جیسے

زندگی کی ہلچل میں کیفِ شوخئ آہو

یوں سبک سجل جیسے

نور کے سمندر میں

بادلوں کی موجوں پر

ہو سفینۂ مہتاب

اختلاف باہم میں
امتزاجِ پیہم بھی
قوسِ قزح کی مانند
تجھ میں ساری رنگینی
گل کے پیرہن کی سی
تجھ میں ساری خوشبوئیں
یار کے بدن کی سی

تیری ہر سحر اُمید
شام، شامِ وعدہ ہے
شب، شب عروسی ہے
آج چھوٹ جائے گی
پھر کبھی نہ آئے گی
آج آخری شب ہے صبح آگے جانا ہے

پھر کہاں سے آئے گا حسن یار کا موسم
دل کہاں سے پائے گا وصل یار کی لذت
پھر کہاں کہ رکھیں گے چھیڑ چھاڑ خوباں سے
پھر کہاں کہ دیکھیں گے شوخیاں نگاراں کی

پھر کہاں کہ سر ہوں گے معرکے جوانوں کے
پھر کہاں کہ حسن دوست وجہ دلبری ہوگا
پھر کہاں جمع ہوں گے دلفگار دیوانے
پھر کہاں پہ ساقی کی چشم مے بہائے گی
آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے

سو طرح کے احساسات دل کو آکے ڈستے ہیں
اے نگارِ علم و فن!
تجھ سے ہم کو چاہت ہے
تیری خاک پا سے بھی
ہم کو خاص ارادت ہے
تیرے ذرہ ذرہ میں
سو کہانیاں پنہاں
حسن و عشق کے قصے
اور فسانہ ہائے شوق
ہم کہ تیری یادوں کو نقش دل بنالیں گے
تیرا دلفریب انداز روح میں بسالیں گے
تیری داستان شوق آنکھوں میں سجالیں گے
ہاں یہ وقتِ رخصت ہے!

چوم لیں درو دیوار

ایک آخری سجدہ اس کے در پہ کر آئیں

الوداع ! میرس روڈ

شہر حسنِ خوباں پھر ایک بار دیکھ آئیں
آؤ کانٹوں سے الجھیں اور پھول چوم آئیں
پھر سے آج نقوی پارک ایک بار گھوم آئیں
آؤ پھر سے ہم شمشاد مارکیٹ بھی دیکھ آئیں
پھونس والے کیفے سے یادگار کی خاطر
چند تنکے چن لائیں
اور اس خموشی میں گھوم لیں نمائش بھی

شعبۂ سیاست میں
کتنی یادیں پنہاں ہیں
شعبۂ سیاست پر نذر دل چڑھا آئیں
جب بھی یاں سے گزریں گے
یہ خیال آئے گا
کوئی چق کے پردے سے
چھپ کے جھانکتا ہوگا
فکر نازنیناں میں ہم رہے خدا سے دور

آج تو نمازِ شوق پڑھ لیں جا کے مسجد میں

یونین کی مٹی کو
آنکھوں سے لگا لیں آج
آؤ چل کے دیکھ آئیں ہال کی خاموشی
جس میں کتنے ہنگامے تھک کے سو رہے ہونگے
جس کی خاک میں مل کر
ہفت آسماں گھومے
کہکشاں کو چھو آئے

دل میں کتنے ارماں ہیں
خواہشیں ہزاروں ہیں
لاکھوں داغِ حسرت ہیں
سب کہاں سے پورے ہوں
ہر سڑک سے گزریں آج
ہر گلی میں گھوم آئیں
آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے

سو طرح کے احساسات دل کو آ کے ڈستے ہیں

بھولے بسرے قصے آج پھر سے یاد آتے ہیں

جانے کتنے افسانے دل کو گدگداتے ہیں

تھی یہاں بہت مشہور

اپنی شوخیِ گفتار

اپنی مستیِ کردار

ہر گھڑی لگاتے تھے اپنے سر کی بازی ہم

بزمِ کیف و مستی میں کتنے کھیل کھیلے ہیں

کتنی بار ہارے ہیں کتنی بار جیتے ہیں

کتنے جابروں کو یاں

زعم کبریائی تھا

ہم نے ان فراعین کے

دعویٰ خدائی کو چور چور کر ڈالا

گاہ اپنے ہاتھوں سے

خود صنم بنائے ہیں

یوں تو سامری کا سحر

اپنے آگے پانی تھا

ہم نے چشم سادہ کو

ساحری بھی سکھلائی

یوں تو اپنی باتوں سے
عقل کو ملے ناخن
گاہ اپنی مستی پر
خود جنوں بھی حیراں تھا

ہم تھے اک حقیقت بھی
ہم تھے اک فسانہ بھی
ہم تھے اک معمہ بھی

کارِزار ہستی میں
ہم کبھی رہے غازی
گاہ بزمِ خوباں میں
تھے شہیدِ نازِ دوست
پھر کہاں سے پائے گی بزم ہم سے پروانے
پھر کہاں سے پائے گی رزم ہم سے فرزانے
پھر کہاں جمع ہوں گے
دلفگار دیوانے
پھر کہاں یہ ساقی کی
چشم مے بہائے گی
پھر کہاں سے آئے گا
ایسی بزم کا انداز

آج آخری شب ہے

صبح آگے جانا ہے

آؤ آج دہرائیں ماضی کے فسانوں کو

قصہ وفائے دل

داستانِ دردِ شوق

چائے کی پیالی پر

دوستوں کی محفل میں

تذکرے حسینوں کے

ذکر اس پری وش کا

جو تھا ناز سر تا پا

جس کی آنکھ کا جادو

سامری کو شرمائے

جس کے حسن کی ضو سے

سنگ بھی پگھل جائے

جس کا ہاتھ ہلنے پر

شاخِ گل لچک جائے

جس کے ہونٹ کھلنے سے

غنچگی چٹک جائے

رنگ رخ کی شادابی

کھیت جیسے گندم کا چاندنی میں لہرائے

جب خرام پر آئے

فصل گل خراماں ہو
جب قیام پر آئے
زندگی ٹھہر جائے
وہ غزل ہے حافظ کی
یا رباعیِ خیام
جس سے ہم کو چاہت ہے
جس سے دل کو راحت ہے
جس کو دل دیا ہم نے
اپنے شوق کا قصہ
اس سے کہہ نہ پائے ہم
اپنے شوق کا قصہ
آج تو سنا ڈالیں

آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے
سو طرح کے احساسات دل کو آ کے ڈستے ہیں

دوستو طلسمِ شب
جلد ٹوٹ جائے گا
آج کی بھری محفل

اب بکھرنے والی ہے
غنچہ غنچہ گل در گل
بادِ صبح خوشبوئیں جمع کرتی پھرتی ہے
غنچے صحنِ گلشن میں
نیم باز آنکھوں سے
شبنمی صراحی کا
انتظار کرتے ہیں
صبحِ نو کی مشاطہ
اپنے دستِ فطرت سے
روئے گل سنوارے گی
آفتاب آئینہ لے کے اٹھنے والا ہے

رات پہلے آئی تھی
رات پھر بھی آئے گی
لیکن آج کی یہ شب پھر کبھی نہ آئے گی

آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے
سو طرح کے احساسات
دل کو آ کے ڈستے ہیں

ناقدانِ ذات وفن !

ناصحانِ نشترزن !

دوستانِ شکوہ سنج !

تم کو جانے کب کب کی
ہم سے برہمی ہوگی
دل میں گو شکایت بھی
بارہا رہی ہوگی
ہم نے پیار دکوئی بات
تم سے گر کہی ہوگی
یونہی کہہ گئے ہوں گے
دل سے کب کہی ہوگی
تم معاف کر دینا
آج ہم پشیماں ہیں
آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے
سو طرح کے احساسات
دل کو آکے ڈستے ہیں
ساقیا! مئے کہنہ
مطربا! کوئی نغمہ

فصل گل کی رقاصہ آج مست ہو کر ناچ
شور پند ناصح آج زخم چھیڑ دے میرے
ابر پھر برس کھل کر
باد گل کو چھو کر آ

آج ہر شکایت کو دل سے اپنے دھو ڈالو
آج ہر کدورت کو غرقِ جام کر ڈالو
اتنے آفتاب اُبھرے
آنکھ سے ملاؤ آنکھ
جام سے لگاؤ جام
دل سے دل کو ٹکراؤ

آج آخری شب ہے
صبح آگے جانا ہے
سو طرح کے احساسات
دل کو آ کے ڈستے ہیں

علیگڑھ سے روانگی کے وقت ۱۷ مئی ۱۹۵۹ء

یادِ علیگڑھ

وہ چائے کی پیالی پہ یاروں کے جلسے
وہ سردی کی راتیں، وہ زلفوں کے قصے
کبھی تذکرے حُسنِ شعلہ رخاں کے
محبت ہوئی تھی کسی کو کسی سے
ہر اک دل وہاں تھا نظر کا نشانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

بہت اپنا انداز تھا لااُبالی
کبھی تھے جلالی کبھی تھے جمالی
کبھی بات میں بات یونہی نکالی
سرِ راہ کوئی قیامت اُٹھالی
کسی کو لڑانا کسی کو بچانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

کبھی سچی باتوں کو جھوٹا بتایا
کبھی جھوٹی باتوں کو سچ کر دکھایا
کبھی رازِ دل کہہ کے اُس کو چھپایا
کبھی دوستوں میں یوں ہی کچھ اُڑایا
بتا کر چھپانا، چھپا کر بتانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

کبھی بزمِ احباب میں شعلہ افشاں
کبھی یونین میں تھے شمشیر بُرّاں
کبھی بزمِ واعظ میں تھے پا بجولاں
بدلتے تھے ہر روز تقدیر دوراں
جہاں جیسی ڈفلی وہاں ویسا گانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

زمانہ تھا وہ ایک حیوانیت کا
وہ دورِ ملامت تھا شیطانیت کا
ہمیں درد تھا اِک انسانیت کا
اُٹھائے علَم ہم تھے حقانیت کا
بڑھے جا رہے تھے، مگر باغیانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

مقابل میں آئے جسارت تھی کس کو
کوئی روک دے بڑھ کے ہمت تھی کس کو
پکارے کوئی ہم کو طاقت تھی کس کو
نگاہیں ملانے کی جرا?ت تھی کس کو
کہ ہر بوالہوس کو تھے ہم تازیانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

خیالاتِ پُر شوق کا سلسلہ تھا
بدل دیں زمانے کو وہ حوصلہ تھا
ہر اک دل میں پیدا نیا ولولہ تھا
ہر اک گام احباب کا قافلہ تھا
اِدھر دعویٰ کرنا اُدھر کر دکھانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

وہ شاہ راہِ میرس کے پُر پیچ چکر
وہ شمشاد بلڈنگ پہ اک شورِ محشر
وہ مبہم سی باتیں، وہ پوشیدہ نشتر
وہ بے فکر دنیا، وہ لفظوں کے دفتر
کہ جن کا سرا تھا، نہ کوئی ٹھکانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

کسی کو ہوئی تھی کسی سے محبت
کوئی کر رہا تھا کسی کی شکایت
غرض روز ڈھاتی تھی تازہ قیامت
کسی کی صباحت، کسی کی ملاحت
کسی کی تسلی کسی کا ستانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

کوئی غمزدہ تھا کوئی ہنس رہا تھا
کوئی حُسنِ ناہید پر مرمٹا تھا

کوئی چشمِ نرگس کا بیمار سا تھا
کوئی بس یونہی تاکتا جھانکتا تھا
کبھی چوٹ کھانا کبھی مسکرانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
وہ ہر جنوری میں نمائش کے چرچے
وہ پُر شوق آنکھیں وہ حیران جلوے
وہ چکر پہ چکر تھے بارہ دری کے
وہ حسرت کہ سو بار مل کر بھی ملتے
ہزاروں بہانوں کا وہ اک بہانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
یہ رُخ آفتابی یہ ابرو ہلالی
وہ تمثالِ سیمیں وہ حُسن مثالی
شگوفوں میں کھیلی گلابوں کی پالی
وہ خود اک ادا تھی ادا بھی نرالی
نگاہیں بچا کر نگاہیں ملانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
وہ ہر چند مجھ کو نہیں جانتی تھی
مگر میری نظروں کو پہچانتی تھی
اگر چہ مرے دل میں وہ بس گئی تھی
مگر بات بس دل کی دل میں رہی تھی

مگر آج احباب سے کیا چھپانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

وہ اک شام برسات کی دن ڈھلا تھا
ابھی رات آئی نہ تھی، جھٹپٹا تھا
وہ بادِ بہاری سے اک گُل کھلا تھا
دھڑکتے ہوئے دل سے اک دل ملا تھا
نظر سن رہی تھی نظر کا فسانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

جوانی اداو?ں میں بل کھا رہی تھی
کہانی نگاہوں میں لہرا رہی تھی
محبت محبت کو سمجھا رہی تھی
وہ چشمِ تمنا جھکی جا رہی تھی
قیامت سے پہلے قیامت وہ ڈھانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

ہمیں بیتی باتیں جو یاد آ رہی ہیں
وہ مخمور نظریں جو شرما رہی ہیں
بہت عقل سادہ کو بہکا رہی ہیں
بڑی بے نیازی سے فرما رہی ہیں
انہیں یاد رکھنا ہمیں بھول جانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

نہ اب وہ امنگیں ، نہ دل میں مرادیں
بس اب رہ گئیں، چند ماضی کی یادیں
یہ جی چاہتا ہے اُنہیں بھی بھلا دیں
غمِ زندگی کو کہاں تک دعا دیں
حقیقت بھی اب بن گئی ہے فسانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
علی گڑھ ہے بڑھ کر ہمیں کُل جہاں سے
ہمیں عشق ہے اپنی اُردو زباں سے
ہمیں پیار ہے اپنے نام و نشاں سے
یہاں آ گئے ہم نہ جانے کہاں سے
قسم دے کے ہم کو کسی کا بلانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
محبت سے یکسر ہے انجان دنیا
یہ ویران بستی پریشان دنیا
کمالِ خرد سے یہ حیران دنیا
خود اپنے کئے پر پشیمان دنیا
کہاں لے کے آیا ہمیں ا ?ب و دانہ
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ

منظوم خاکے: سرسید یونیورسٹی کراچی کے قیام پر

سرسید احمد خاں

چراغاں ہے تمہارے نام سے تاریک راہوں میں
تمہارے عزم سے ملت کی بزمِ فکر روشن ہے
وہاں سے اب بھی رنگِ نور کے سوتے اُبلتے ہیں
علی گڑھ میں خزاں آتی نہیں وہ ایسا گلشن ہے

عابداللہ غازی صدر طلبہ یونین، ۱۹۵۹ء
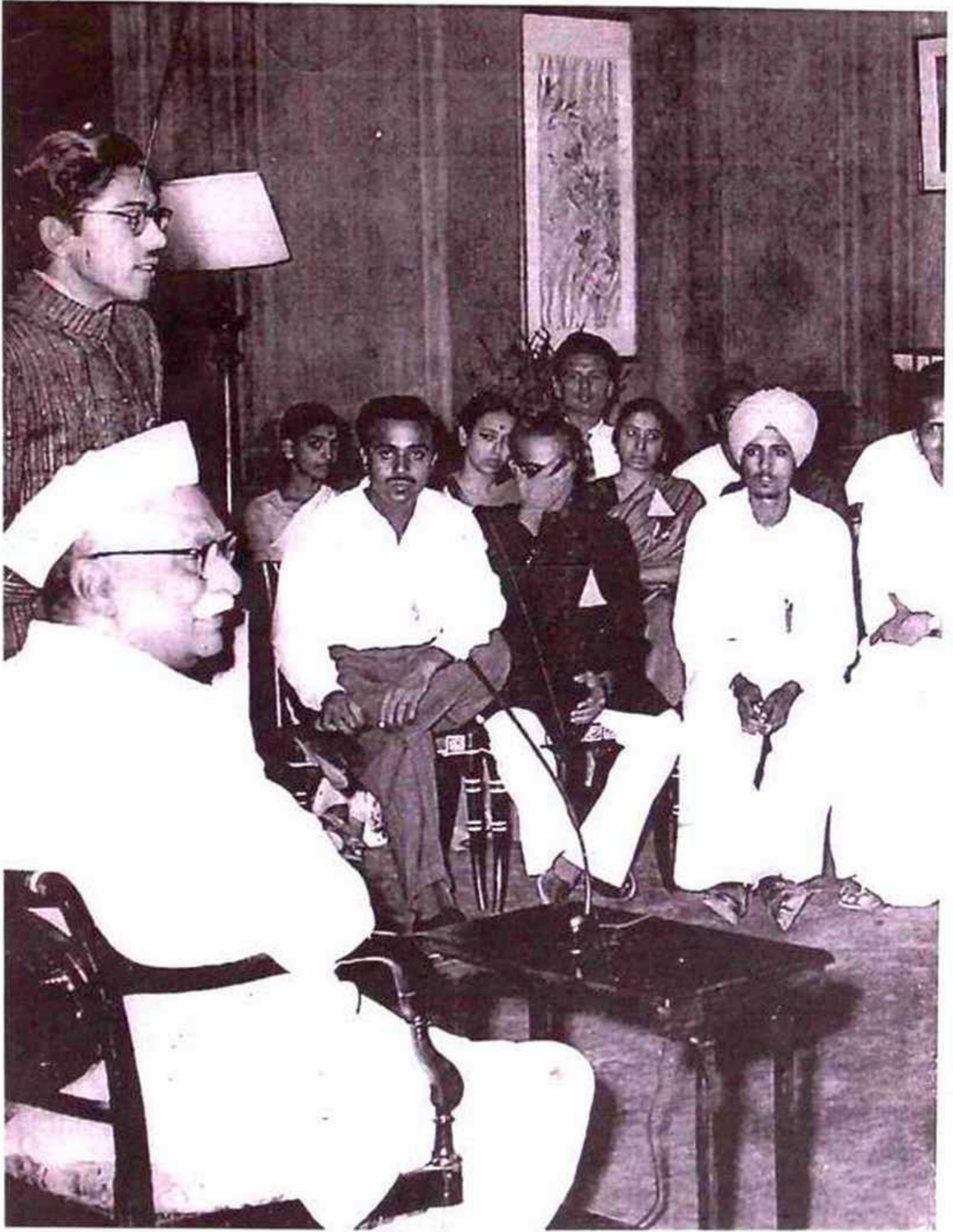
صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد کی علیگڑھ آمد پر عابداللہ غازی
طلبہ کی یونین کے صدر کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے

جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ ڈاکٹر عابد اللہ غازی بائیں سے پہلی نشست پر

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے وزرا، آکسفورڈ کی ڈبیٹنگ ٹیم کی آمد کے موقع پر

۴؍نومبر، ۱۹۵۴ء

بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے حبیب الرحمن صدیقی، عابد اللہ غازی، بروس ای برٹن، نیر قدر میرزا

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی پچھترویں سالگرہ کی تقریبات کے موقع پر ۱۴، ۱۵، ۱۶؍ دسمبر ۱۹۵۷ء

بائیں سے دائیں: شاہ عبدالقیوم (سابق لائبریرین اور سکریٹری)، عبدالرؤف نقوی (سابق لائبریرین)، ایس ایم۔ شفیع (خازن)۔ کے جی سیدین (سابق نائب صدر)، ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق نائب صدر)، نیر قدر، ڈبلیو اے میرزا (سابق نائب صدر)، حبیب اللہ خان (سابق نائب صدر)، ڈاکٹر عابد اللہ غازی درمیان میں

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی منسٹری، حکمت ہند کے وزیر دفاع کرشنا مینن کے ساتھ

۱۸/اپریل، ۱۹۵۹ء

بائیں سے دائیں: انشاء اللہ خان، ڈاکٹر بشیر خان، جناب کرشنا مینن، عابد اللہ غازی (صدر)، کرنل بشیر حسین زیدی (وائس چانسلر)، مفتی محمد طاہر (کارگزار سیکریٹری)

بائیں سے دائیں (کرسیوں پر)۔ محمد نثار قریشی (آفس سپرنٹنڈنٹ)، حکیم عبدالطیف (خازن)، ڈاکٹر سرج الحق قریشی اور سید حامد حسین جیلانی (ارکان ایگزیکیٹیو کمیٹی)، پروفیسر رشید احمد صدیقی (نائب شیخ الجامعہ)، ڈاکٹر ذاکر حسین (شیخ الجامعہ)، پنڈت راج ناتھ کنذرو (نائب امیر)، سید ظہیر الدین علوی (رجسٹرار)، جی این سہاریا اور محمد شفیع الدین نیر (ارکان ایگزیکیٹیو کمیٹی)

ڈاکٹر عابداللہ غازی پروفیسر رشید احمد صدیقی کی پشت پر سیاہ ٹوپی میں
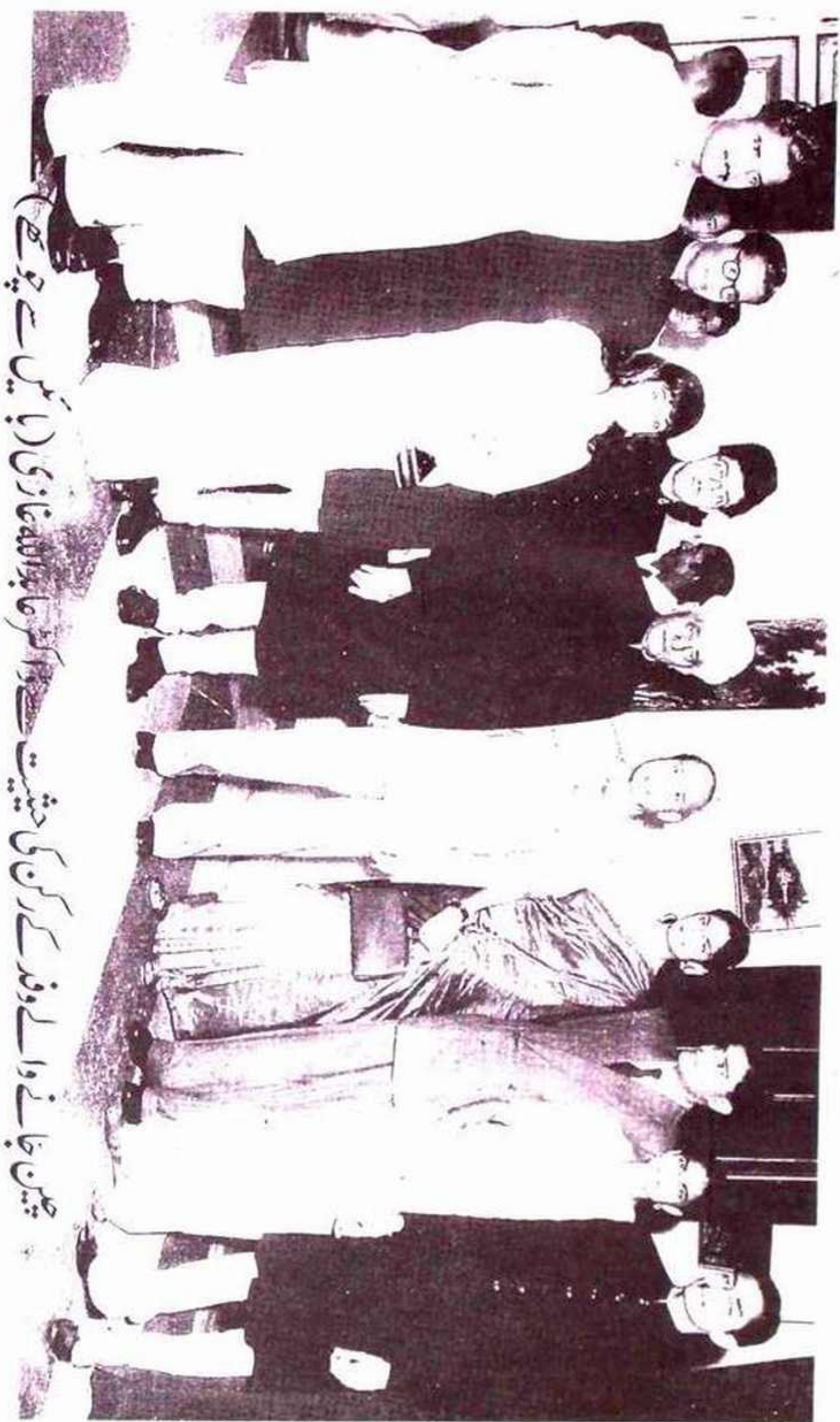
چین جانے والے وفد کے رکن کی حیثیت سے ڈاکٹر عابداللہ غازی (بائیں سے چوتھے)

چینی سفر اور ہندوستانی وفد کے صدر سی پی رام سوامی ایئر کے ساتھ

مولانا آزاد میموریل کل ہند انگریزی تقریری مقابلہ

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ طلبہ یونین۔ ۴؍ دسمبر ۱۹۵۸ء

عابد اللہ غازی دائیں سے پانچویں نشست پر

اردو سوسائیٹی مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ ۵۵-۱۹۵۴ء
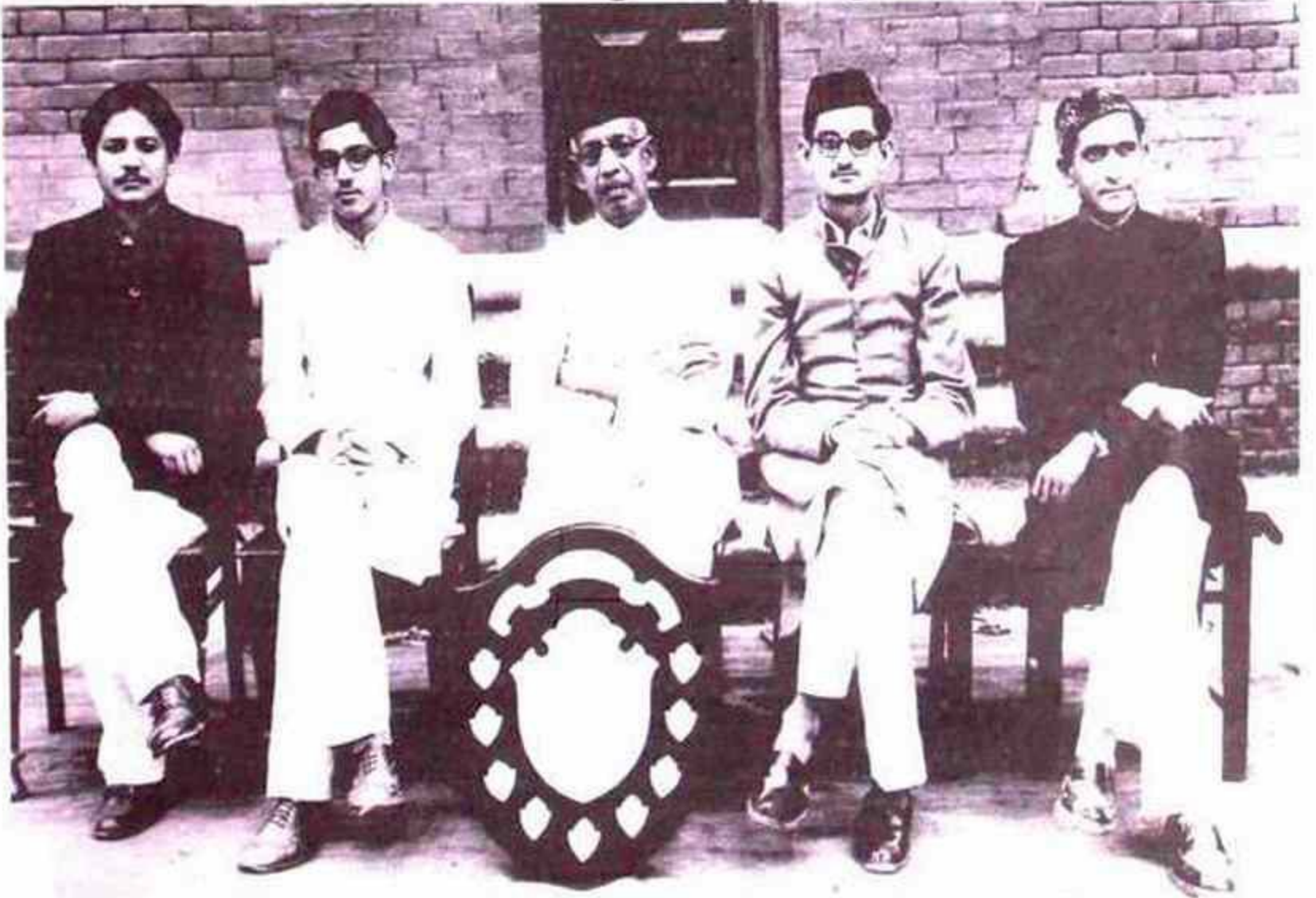
بائیں سے دوسرے عابد اللہ غازی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی

جہدِ مسلسل (علیگڑھ سے علیگڑھ تک)

ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی علیگڑھ کے

سات سالہ دورِ طالب علمی کی دلچسپ آپ بیتی

ڈاکٹر عابداللہ غازی نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے۔لیکن ایک انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کے لئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے یہ بات وہ کامیاب انسان ہی بتا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عابداللہ غازی کا حلقہ احباب وسیع ہے اور خاندان پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے جن سے وہ ہمیشہ ربط وضبط رکھتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے احباب اور عزیزوں کا ہمیشہ اصرار رہا کہ وہ اپنی آپ بیتی ضرور لکھیں۔اسی اصرار کے پیش نظر انہوں نے ایک عرصہ ہوا یہ کام شروع کر دیا تھا لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات اور اسفار کے سبب کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ان کا حافظہ اور استحضار قابلِ رشک ہے اور انہیں پرانے واقعات بھی اس طرح یاد ہیں جیسے ان کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہو۔اس لئے یہ آپ بیتی ہزاروں صفحات پر پھیل گئی اور پھر اس پر نظرِ ثانی کار دارد۔

بعض احباب اور اعزہ کی رائے ہوئی کہ بجائے پوری سوانح شائع کروانے کے جو حصہ مکمل ہو کر نظر ثانی کے مرحلے سے گزر گیا اسے شائع کر دیا جائے۔ان کا علیگڑھ کا دور بڑا معرکتہ الآرا دور ہے جس کی ہمہ ہمی اور واقعات دلچسپ ہیں اور اس زمانے کی تاریخ اور تہذیبی اقدار کے آئینہ دار بھی ہیں۔ان کا انداز بیان اتنا دل آرا ہے کہ ان کا قاری ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے اور ممکن ہی نہیں کہ وہ کتاب شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑ دے۔یہ داستان ان کے علیگڑھ میں گزارے ہوئے آٹھ سالہ دور طالب علمی کی داستان ہے،ہمیں یقین ہے کہ قاری اسے پڑھیں گے اور ان کے دلچسپ انداز بیان سے حظ اٹھائیں گے۔

IQRA' Education Foundation
A-2, Firdaus, 24 Veer Savarkar Road
Mahim West, Mumbai-400016 (India)
Tel: 022-2444 0494/2444 0572
Email: contact@iqraindia.org
www.iqraindia.org

قیمت Rs.400/-